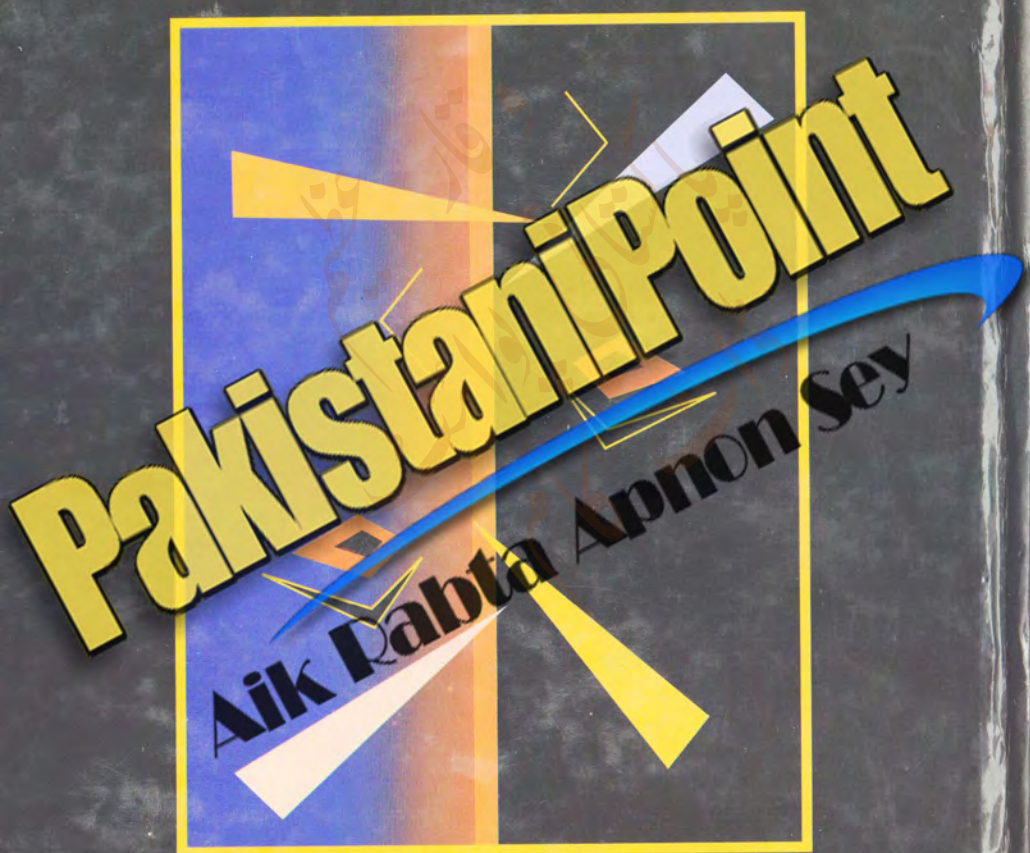


زُوبرو



ش۔ صغیر ادیٹ

زُوبرو

شش صغیر ادیب

القریش پبلی کیشنز

سرکھروڈ چوک اردو بازار لاهور فون 042-7668958
042-7652546

www.alquraish.com E.mail: info@alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باجہ تمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

انٹرنیشنل ایڈیشن

پہلا سال 2008

تیرا سڈریس

تبدیل

گراں گراں

تبدیل

قیمت 5/10

انتساب

اماں (مرحومہ)

صغیرہ بیگم

کے نام۔

ترتیب

- 1- نام و نسب 9
- 2- آئیب 25
- 3- اگر 41
- 4- رو برو 52
- 5- 'یا' 80
- 6- سب دروازے بند نہیں ہوتے 91
- 7- اس کا زادراہ 109
- 8- پورا سچ 123
- 9- نام و نشان 145
- 10- اکھوں میں ایک 157
- 11- دینو 164
- 12- انمول 181
- 13- کل، آج اور 192
- 14- پڑیے کر بیمار تو 205
- 15- دروازہ 220
- 16- دائرہ 236
- 17- وہ سورج کی تلاش میں گئی ہے 246

تاثرات

ش۔ صغیر ادیب انگلینڈ میں رہتے ہیں لیکن وہ انہی تہذیبی رشتوں اور اقدار سے جڑے ہوئے ادیبوں میں سے ہیں جنہیں برصغیر کا ورثہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں جو لوگ شعر و ادب کی آبیاری کو اپنا فریضہ بنائے ہوئے ہیں، ش۔ صغیر ادیب انہی میں شامل ہیں اور نمایاں ہیں۔ ان کا تعلق ادیبوں کے اس نولے سے نہیں جو اپنے آپ کو منوانے کے لیے غیر ادبی ذرائع استعمال کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے خود اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کر کے نام کمایا ہے۔ وہ کوئی چار دہائیوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے ہندوپاک کے ادبی پرچوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ش۔ صغیر ادیب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو یا غیر ممالک میں جا بسنے والے ایشیائیوں کی ناپسندیدہ اخلاقی روش ہو، ان کے افسانوں میں صرف یہی کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے لیے ایسے موضوعات بھی چنتے ہیں جنہیں اپنی نوعیت میں آفاقی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے لکھنے کا انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ ایسے افسانے نہیں لکھتے جن میں ابلاغ کا مسئلہ ہو۔ وہ جس طرح سوچتے ہیں اپنے قاری تک وہ اپنی اسی سوچ کو پوری طرح پہنچانے کا فن جانتے ہیں۔

نی زمانہ ہمارے یہاں دو طرح کے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ ایک تو وہ افسانے ہیں جو پیچیدہ خیال افروز اور پرت دار ہونے کے سبب صرف ایک خاص طبقے کے قارئین کے لیے امیبلنگ ہوتے ہیں دوسری طرح کے افسانے وہ ہیں جو ’ساح‘ کھلے ہوئے اور رواں دواں ہونے کی وجہ سے عام قاری کو اچھے لگتے ہیں۔ اسی قسم کے قارئین کی تعداد زیادہ ہے۔ جن میں لفظی نہ ہو، جن میں کوئی واضح کہانی پائی جاتی ہو اور جس میں وہ روانی اور لہر موجود ہو جو انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ش۔ صغیر ادیب کے افسانوں میں یہ تمام صفات ملتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہیں نہ صرف ادبی حلقے میں رسائی ملی ہوئی ہے بلکہ ان جہازند میں بھی جنہیں ”ڈائجسٹ“ کہا جاتا ہے، ان کی پذیرائی ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسا وصف نہیں جس سے سرسری گزرا جاسکے۔

احمد صغیر مدنی

۸۰۳۳ء۔ کراچی

نگارشات و گزارشات

سارتر نے ادب کی غایت بیان کرتے ہوئے کہا تھا ”اپنے عہد کی حسیات اور کل علم کے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔“ یہ فقرہ وہ کسوٹی ہے جس پر کسی بھی ادب پارے کو پرکھا جاسکتا ہے اور چونکہ کسی ادیب پر لکھنا ادب پر لکھنے کے مترادف ہے اس لیے بھی یہ فقرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس فقرے کے تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے لہذا فی الوقت یہ کہہ کر کام چلا لیتے ہیں کہ کسی افسانہ نگار کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے عصری حقیقت کو کتنا محسوس کیا ہے اور اجزا کے ذریعے سچائی کی کس حد تک نشاندہی کی ہے۔ ارد گرد کے موسموں اور ان میں سانس لیتے ہوئے ہر قسم کے لوگوں کی کتنی عکاسی کی ہے۔

ان گزارشات کی روشنی میں جب ہم ش۔ صغیر ادیب کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں قطعی مایوسی نہیں ہوتی۔ ان کے افسانے جن میں سے بعض کو ناول بھی کہا جاسکتا ہے، عصری حقیقت کے قریب ہیں۔ سماجی رشتوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے ترجمان بھی ہیں۔ وہ فردیت کو بیان کرتے ہوئے ”کل“ کو نظر انداز نہیں کرتے۔

ش۔ صغیر ادیب چونکہ عمدہ دراز سے مغرب میں آباد ہیں اس لیے ان کی عصری حقیقت وہ معاشرہ ہے جو ان کے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ وہ اسی معاشرے کے ذہنی مسائل سے مواد اخذ کرتے ہیں۔ کہانی کی بنت سے ”فرد“ اور ”کل“ کے رشتے کو بحال کرتے ہیں۔

ناول، ناولٹ اور افسانہ ایک ہی خاندان سے متعلق ہیں۔ ان تینوں اصناف میں کہانی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ش۔ صغیر ادیب کے افسانے کہانی سنانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ دلچسپی کا عصر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ روانی اور سادگی سے ایک عجیب دنیا تشکیل دیتے ہیں۔ قاری جب اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو مشاہدے اور تجربے کی وسیع دنیا آباد دیکھتا ہے۔ مصنف کی قوت اظہار کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ش۔ صغیر ادیب کے یہ افسانے مشرق و مغرب کے ملاپ کا ایک حسین تحفہ ہیں۔ وہ افسانے بھی ہیں جن کی پرورش مشرق کے ماحول میں ہوئی ہے۔ وہ کہانیاں بھی ہیں مغرب کے ماحول سے کشید ہوئی ہیں اور وہ بھی جن کے کردار مشرقی ہونے کے باوجود مغرب کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ش۔ صغیر ادیب کو کہانی بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی کہانیاں نہایت سیک رفتاری سے ارتقا کی مراحل طے کرتی ہوئی آغاز کر پر، تصادم اور پھر منطقی انجام تک پہنچتی ہیں۔ مختلف سوالات اٹھاتی ہیں اور ان کے کردار ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اپنی شناخت کراتے ہیں، مثبت بھی اور منفی بھی۔

ش۔ صغیر ادیب کے افسانے ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جس میں داخلیت اور خارجیت، مشرقیت اور مغربیت، عمووی اور انقی سستوں کی سماجی ترقی ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں ”حقیقت“ بھرپور توانائی سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان افسانوں کی زبان نہ تو استعاراتی ہے نہ علامتی۔ وہ اظہار بیان کے ایسے طریقوں کے قائل ہیں جن میں ترخی سادگی سے کام لیا جاتا ہے۔

ان کے یہ افسانے سنجیدہ موضوعات کی وجہ سے سنجیدہ قاری کے لیے ہمیشہ قابل قبول رہیں گے۔ جدیدیت اور تعقل پسندی سے عبارت یہ افسانے یقیناً قابل قدر اضافہ ہیں جن کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

۸۔ سید ساجد امجد

چند الفاظ مصنف کی طرف سے

کہانیاں خوابوں کا عکس ہوتی ہیں۔ ان خوابوں کا عکس جو ایک کہانی کا رُشاعر شعوری یا الاشعوری طور پر دیکھتا ہے۔ ان خوابوں کا تعلق اس معاشرے سے ہوتا ہے جس کے لیے انسان صدیوں سے جدوجہد کر رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان نے انسانی معاشرے کی بنیاد اس امید اور خواہش پر رکھی تھی کہ وہ ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں آدمی سکھ، امن، مسرت اور سکون سے زندگی گزار سکے گا۔ صدیاں گزر گئی ہیں لیکن انسان کا یہ خواب ہنوز خواب ہے۔ آج بھی ایسا بے داغ اور خوبصورت معاشرہ قائم نہیں ہو سکا ہے۔ آج بھی انسان دکھی ہے، نا آسودہ اور مظلوم ہے۔ تعصب، نفرت، مذہبی اور انسانی تفریق، ظلم، جبر، غربت اور محرومی کی وبا آج بھی موجود ہے۔ افسانہ نگار اور شاعر معاشرے کے یہ ”داغ دھبے“ دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں کڑھتا ہے۔ پھر قلم اٹھاتا ہے اور کہانیاں لکھتا ہے، شعر کہتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ قلم کار کی ساری ہی کوششیں رائگاں گئی ہیں۔ جو علم کہانی سنانے والوں، شعر کہنے والوں اور دانشوروں نے الفاظ کی صورت کاغذ پر منتقل کیا ہے، اس نے دنیا بہت حد تک بدلی ہے۔ کل تک جو شعور آدمی کے پاس نہیں تھا آج وہ شعور اس کے پاس ہے۔ مگر وہ خواب ابھی بھی ادھورا ہے۔ ابھی بھی وہ صبح نہیں آئی، جس کا انتظار آدمی صدیوں سے کر رہا ہے۔ ظلم، تعصب، تفریق اور استحصال کا عذاب ابھی بھی موجود ہے۔ تاہم اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے اس خواب کو مرنے نہیں دیا ہے۔ وہ خواب ابھی بھی زندہ ہے اور شرمندہ تعمیر ہونے کا منتظر ہے۔

زیر نظر کتاب میری کچھ کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں طویل عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ چالیس سال سے بھی زیادہ مدت ہو گئی۔ اس عرصے میں میری جو کہانیاں شائع ہو چکی ہیں ان کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔ اب تک کتاب شائع نہ ہونے کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ میری جانب سے کوتاہی ہوتی رہی۔ کبھی اس طرف تنجیدگی سے توجہ ہی نہیں دی۔ خیر، دیر آید درست آید۔ شاید یہ کہادت میرے لیے مبارک ثابت ہو۔ میری ان تمام کہانیوں میں ان ہی خوابوں کا عکس آپ کو نظر آئے گا۔ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان کہانیوں کو ناپسند نہیں کریں گے کیونکہ یہ آپ کے خواب بھی ہیں۔ اس موقع پر میں ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی اعانت اس کتاب کی اشاعت میں شامل رہی ہے۔ میں جناب محی الدین نواب، جناب احمد صغیر صدیقی اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا بھی تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے مضامین لکھنے کی زحمت کی۔ آخر میں جناب اقلیم علیم کا شکریہ ادا کرنا انتہائی ضروری ہے کہ جن کی کوششوں اور مدد کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن ہی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں القریٰش پبلی کیشنز کے محمد علی قریشی کی محنت اور تعاون کا ذکر ناگزیر ہے جس کا شکر اس کتاب کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام اصحاب کو شاد و آبدار رکھے آمین۔



ش. صغیر ادیب

نام و نسب

وہ چپ چاپ آئینے کے سامنے بیٹھا رہا اور زخمی نظروں سے خود کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے جو چہرہ تھا، وہ یقیناً پرکشش اور وجیہ تھا۔ ستواں ناک، کشادہ پیشانی، ہلکے بھورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں، ترشے ہونٹ، ڈھوپ کی رنگت کے گھنے ریشمی بال..... بلاشبہ چہرے میں صنفِ نازک کے لئے غیر معمولی کشش تھی۔ کالج میں تھا تو ہر دوسری لڑکی اس کی قربت کی خواہاں رہتی تھی۔ خود اسے بھی احساس تھا کہ وہ ایک جاذبِ نظر نوجوان ہے۔ لیکن اس سے اسے آئینے میں اپنا تنکھے نین نقش والا چہرہ کچھ نامانوس سا لگ رہا تھا۔ اجنبی..... کچھ انجان سا۔ جیسے اس چہرے سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ ناواقف ہو۔ کون ہے یہ؟

گزشتہ بائیس سال سے یہ چہرہ اس کے سامنے موجود ہے۔ ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتا رہا ہے۔ اسی چہرے کو لے کر وہ ہر رات سوتا رہا ہے، ہر صبح جاگتا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس چہرے سے پوری طرح متعارف ہے۔ ہیرسن..... ہاں لوگ اس چہرے کو اسی نام سے جانتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے اس چہرے کا نام ہیرسن نہیں۔ لیکن اگر ہیرسن نہیں تو پھر کیا؟ اسے یکا یک اس چہرے پر..... اپنے چہرے پر بڑا ترس آیا۔

پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سیدھا ہاتھ بڑھا کر دیوار پر رکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ وہ چند لمحے ترمح سے اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر تنخی سے مسکرا کر آہستہ سے مڑا۔ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ سامنے لوگ روم میں صوفے پر ڈینی اس کا چھوٹا بھائی نیم دراز تھا۔ اس کی نظریں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈینی کا چہرہ لمبوتر تھا..... بال سیاہی مائل، آنکھیں چھوٹی اور سیاہ، پیشانی تنگ اور ناک قدرے چھوٹی..... جان کے مقابلے میں وہ قدرے پست قامت بھی تھا۔ دونوں کی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ وہ دونوں سکے بھائی ہیں۔

جان چند لمحے ڈینی کو دیکھتا رہا، پھر یکا یک نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر عجیب سی مسکراہٹ تھی وہ۔ اس میں خوشی کی کوئی رمت نہ تھی بلکہ خفیف سی تلخی، استہزاء اور شکست خوردگی تھی۔ اسے سر کو آہستہ سے جھٹکا دیا جیسے اپنے اندر اٹھنے والے کسی خیال، کسی احساس سے دامن چانا چاہتا ہو۔ پھر وہ آگے بڑھا اور راہداری کی جانب گھوم گیا۔

آگے بڑھا تو نگاہ باور پنی خانے میں لئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر آیا۔ فٹ پاتھ پر ٹھہر کر بے دھیانی سے دائیں بائیں دیکھا، پھر آگے بڑھا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے سڑک پار کی اور چوراہے کی طرف چل پڑا۔

وہ دن بھی ابتدائی اگست کے عام دنوں جیسا ہی تھا، قدرے گرم۔ دھندلی سی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادلوں نے چند ایک آوارہ کلڑے یہاں وہاں تیر رہے تھے۔ وہ بے دھیانی اور لالچلی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ چوراہے پر پہنچا تو یکا یک رک گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن دفعۃً بڑھ گئی اور نظر بس اسناپ پر کھڑے شخص پر جم کر رہ گئی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا قدرے پست قامت آدمی تھا۔ جینز، چیک دار قمیص اور سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے، سر کے بال کچھڑی تھے۔ آنکھوں پر چشمہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ جان کے ہونٹوں سے خود بخود نکلا۔

”کریگ.....!“

جب سے کریگ گھر چھوڑ کر گیا تھا تب سے جان نے اسے نہیں دیکھا تھا اور اس بات کو اب مہینوں گزر چکے تھے۔ جان کو صرف اتنا علم تھا کہ کریگ شہر کے جنوبی علاقے میں کہیں رہتا ہے۔ لیکن کہاں؟ یہ جاننے کی جان نے بھی کوشش نہیں کی تھی۔ دراصل اسے کریگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چند ایک بار جیکولین نے کہا بھی تھا کہ اسے کریگ سے ملنا چاہئے۔ کچھ بھی ہو، کریگ بہر حال اس چھوٹی سی فیملی کا، ان کی زندگیوں کا ایک حصہ رہا ہے لہذا اسے کریگ کی خیر و عافیت دریافت کرنا چاہئے۔ ماں جیکولین کے کہنے سننے پر ڈینی ایک دو بار کریگ کے پاس گیا بھی تھا مگر اس نے خوش اسلوبی سے ٹال دیا تھا۔

”ابھی میں مصروف ہوں۔ کسی وقت موقع ملا تو چلا جاؤں گا۔“

ماں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ جان کے پس و پیش کو بخوبی سمجھتی تھی۔

جان نے غور سے کریگ کو دیکھا۔ وہ حسب معمول تھکا ہوا اور کسی قدر افسردہ نظر آ رہا

تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑوں پر استری نہیں تھی اور چہرے پر کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے وہ اندر سے کبیدہ خاطر ہو..... جیسے اپنی ذات کے اعتبار سے محروم ہو گیا ہو..... جیسے بھیڑ میں بالکل تنہا رہ گیا ہو اور جیسے اسے علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ وہ مکمل طور پر ایک ہارا ہوا آدمی تھا۔ جان اکثر اس کے لئے اپنے دل میں شدید ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کریگ اپنی ذات کے اعتبار سے کب اور کیسے محروم ہوا تھا۔ کب اس کی انا اور خود داری مجروح ہوئی تھی۔

برسوں پہلے جب جان چھوٹا تھا تب کریگ ایک مختلف آدمی ہوا کرتا تھا۔ زندہ دل، پُر جوش اور زندگی سے بھرا ہوا۔ وہ اپنی بیوی جیکولین سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جیکولین کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ جیکولین سے محبت کے علاوہ اسے باغبانی اور کتابوں سے بھی عشق تھا۔ وسیع بیک یارڈ میں اس نے ڈھیر سارے پودے لگا رکھے تھے اور دن رات ان کی دیکھ بھال میں جتا رہتا تھا۔ اسی طرح اُس نے اپنے کمرے میں اعلیٰ درجے کی علمی و ادبی کتابیں جمع کر رکھی تھیں، ڈکنس، جین آسٹن، لارنس، ٹامس ہارڈی جیسے ادباء کی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے ہر شے سے اس کی دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی۔ باغیچہ اُڑ گیا، کتابوں پر گرد آٹ گئی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ کئی کئی دن داڑھی نہ بناتا، کپڑے بدلنے کی طرف دھیان ہی نہ جاتا۔ صحت بھی بتدریج گرتی چلی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اپنی ذات اور زندگی اس کے لئے بے معنی ہو گئی ہو۔

جان اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کریگ کی اس حالت کا سبب کیا ہے اور اسی بناء پر اسے کریگ سے ہمدردی محسوس ہوتی۔ لیکن وہ کریگ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وقت اور حالات جب ذہن و دل میں زہر گھولتے ہیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا بس خاموش تماشا کی طرح خود کو اس چراغ کی طرح بجھتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے جس میں تیل ختم ہو رہا ہو۔

پھر ایک دن اس نے جیکولین سے کہہ دیا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ ہم الگ ہو جائیں۔“

جیکولین نے صبر و سکون سے بات سنی تھی اور اختلاف نہیں کیا۔

جان چپ چاپ کھڑا تھا اور ڈر رہا تھا کہ مبادا کریگ اسے دیکھ لے۔ وہ ایک ناکام سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کریگ اپنی سوچ میں اس حد تک ڈوبا ہوا تھا کہ اسے دو پیش کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ کچھ دیر میں بس آئی، کریگ بس صبح سوار ہو گیا۔ بس جب روانہ

ہو گئی تو جان نے سکون کا سانس لیا۔



جان کو یاد تھا۔ سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ بھول بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ اس کے چھوٹے سے گھر میں ایسا کچھ تھا جو عام طور پر گھروں میں نہیں ہوتا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے دو تین دوستوں کے گھروں میں کیا ماحول تھا، کیسی فضا تھی۔ وہاں لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک ہار میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح یا ایک جگ سا تصویر مانند جس کے تمام کمرے صحیح مقامات پر فٹ ہوں۔ لیکن اس کے اپنے گھر میں ایسا کچھ نہ تھا۔ کہیں کوئی کمی تھی، کوئی خامی تھی۔ شاید ہار کے کچھ موتی غائب تھے۔ ہر چند ماں جیکو لین تھی، کریگ تھا جس کو وہ ڈیڈی کہتا تھا، اور وہ خود۔ ایک چھوٹی سی مکمل فیملی۔ پھر بھی کوئی ایسی بات ضرور تھی جو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ وہ کیا بات تھی؟ یگانگت، اپنا پن اور وہ فضا جو ”گھر“ کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا گھر، گھر نہیں تھا محض مکان تھا جہاں چار ایسے افراد رہتے تھے جن کے درمیان کوئی دلی اور جذباتی بندھن نہیں تھا۔ ڈینی کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا۔ گھر میں بھی ہوتا تو سب سے الگ تھلگ، زیادہ تر ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہتا۔ یہی حال کریگ کا تھا، گھر سے کٹا ہوا، اپنی ذات کے خول میں بند۔ بچپن میں جس کریگ کو اس نے دیکھا تھا وہ کہیں کم ہو گیا تھا۔ اب جو کریگ گھر میں تھا، وہ کوئی اجنبی، انجان شخص تھا جس کا گھر کے کسی فرد سے کوئی ربط و تعلق نہیں تھا۔ وہ جیکو لین، جان اور ڈینی سے بہت کم گفتگو کرتا اور جب کرتا تو ضرورت سے زیادہ ایک لفظ نہیں بولتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے درمیان میں کوئی غیر مرئی پردہ پڑا ہے..... تکلف کا پردہ۔ کبھی کبھی جیکو لین ٹوک دیتی، شیو بنانے یا کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہتی تو پھیلکی سی مسکراہٹ سے ٹال جاتا۔

”ٹھیک ہے، کرلوں گا۔ فکر مت کرو۔“

جیکو لین سب کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایک ماں اور بیوی دونوں حیثیتوں میں اپنی ذمہ داری نبھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس کا ہر عمل، ہر فعل تضاع کے غلاف میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ سب کا خیال رکھتی لیکن لگتا اس طرح جیسے اداکاری کر رہی ہو۔ اداکاری..... جان اکثر حیران ہوتا۔ کیوں؟..... آخر ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ جیکو لین کا طرز عمل غیر فطری ہے اور یہ کہ کریگ اس خلا کو پُر نہیں کرتا جو باپ کے وجود سے پُر ہوتا ہے؟ یہ خالی پن کیوں؟ یہ گھر آخر ”مکان“ کیوں ہے؟ ”گھر“ کیوں نہیں بنتا؟..... کیا خامی ہے؟..... کون سی کمی ہے؟..... یہ غیریت کی فضا کیوں اور کیسے

پیدا ہوئی؟

پھر یوں ہوا کہ ایک دن اسے ان سوالوں کا جواب مل گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کریگ گھر چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ ایک شام جیکولین نے اسے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ دونوں اسپرنگ ویو ہوٹل پہنچے۔ موسم بہت اچھا تھا۔ شام کا دھند لکا ہوا تھا۔ آسمان سے اترنا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی مگر خوشگوار خنکی تھی۔ جیکولین نے اپنے لئے ڈبل دسکی لی اور جان کے لئے اگر جو اس کی پسندیدہ ڈرنک تھی، لی اور پھر وہ دونوں ہوٹل کے عقبی باغیچے میں آئے اور ایک الگ تھلگ میز کے گرد بیٹھ گئے۔ جیکولین نے اپنے بیگ سے سگریٹ کی ڈبیہ برآمد کی اور ایک سگریٹ سلا کر، طویل کش لے کر جان کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے جان!..... تم اتنے حیران کیوں نظر آ رہے ہو؟“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔

جان نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں کرب اور افسردگی کا ہلکا سا عنصر ہے۔ جان واقعی حیرت زدہ تھا۔ ”یہ.....“ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”تم تو سگریٹ اور شراب دونوں ہی چھوڑ چکی تھیں۔“

”ہاں.....“ جیکولین کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مگر آج مجھے ان کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سہارے کے لئے، خود کو سنبھالنے کے لئے۔“

”کیوں؟“ وہ اور زیادہ متعجب ہوا۔

جیکولین نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، کچھ دیر سوچتی رہی۔ دسکی کی دو چسکیاں لیں، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر اس نے کشمکش بھری نظروں سے جان کی طرف دیکھا۔

”جان! میں کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں، خود سے بڑھ رہی ہوں۔ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ دماغ کہتا تھا، اب تک چپ رہی ہو تو اب بھی خاموش ہی رہنا مناسب ہو گا۔ دل کہتا تھا نہیں، تم جس آگ میں جل رہی ہو اسے بجھانے کا ایک ہی طریقہ ہے، زبان کھولو۔ آخر میں نے دل کی بات مان لی حالانکہ مجھے علم نہیں کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ شاید تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے یا شاید تمہیں غصہ آئے گا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میرے جذبات اور محرومی کو محسوس کرو اور تمہیں مجھ پر ترس آئے۔ اگر ایسا ہو.....“ جیکولین نے رُک کر دھیرے سے سانس لی اور پست آواز میں بولی۔ ”تو مجھے معاف کر دینا۔“

”آخر ایسی کیا بات ہے؟“ جان نے متحش ہو کر کہا۔ ”تم یہ سب کیوں کہہ رہی

ہو؟..... بات کیا ہے آخر؟“

”میں جو کچھ تمہیں بتانے جا رہی ہوں، اسے بہت غور سے سنا اور درمیان میں بولنا مت۔“ جیکو لین نے کہا پھر دہسکی کا ایک بڑا گھونٹ بھر کر جان کی طرف دیکھا۔

جان نے محسوس کیا کہ جیکو لین کے ہونٹ، اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور اس کی آواز میں لرزش بھی ہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ شدید تھکا اور کشاکش میں مبتلا ہے مگر جان چپ رہا اور صبر و سکون سے انتظار کرتا رہا۔ طویل وقفے کے بعد جیکو لین نے لب کھولے۔ اس کی آواز مدہم تھی اور اس میں انجان سی غیر فطری گونج تھی جیسے وہ آواز کہیں بہت دور، کسی عمیق پاتال سے آرہی ہو۔ الفاظ اس کے ہونٹوں سے رک رک کر نکل رہے تھے اور جان کے کانوں میں نوکیلی، زہریلی سویوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ دم بخود بیٹھا تھا۔ وحشت زدہ۔ اُس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں جیسے سینے کے اندر چھوٹے چھوٹے دھماکے ہو رہے ہوں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ سچ ہے۔

جب جیکو لین چپ ہوئی تو یکایک ان کے ارد گرد گہرا سناٹا مسلط ہو گیا۔ شام کی تاریکی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سناٹا اور اس تاریکی سنانے میں وہ دونوں چپ بیٹھے تھے۔ وحشت زدہ، شکستہ، کشیدہ، اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔ یوں جیسے دونوں ہی زندہ نہ ہوں بلکہ مر چکے ہوں۔

جب کئی گھنٹیاں بیت گئیں تب جان نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھ میز پر رکھے اور بدقت تمام اپنے وجود کو گھسیٹ کر اٹھایا اور آہستہ آہستہ گلاب کی ایک جھاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جس میں ایک بھی پھول نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر خالی ویران آسمان کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے آہستہ سے گردن گھما کر جیکو لین کی طرف دیکھ کر ہونٹوں کو جنبش دی۔ اُسے اپنی آواز زندگی میں پہلی بار اجنبی محسوس ہوئی۔

”ہوں..... تو یہ سب سچ ہے؟“

جیکو لین نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جان کی جانب محض اعتراضی نظروں سے دیکھنے پر

اکتفا کیا۔

کچھ دیر بعد جان نے کہا۔ ”تم نے یہ بات اتنے عرصے تک چھپائے رکھی تو پھر اب زبان کھولنا کیوں ضروری سمجھا؟“

جیکو لین نے گلاس اٹھا کر چسکی لی۔ ”مجھے نہیں معلوم.....“ اُس کی آواز سے بے یقینی

اور کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”گزشتہ کچھ دنوں سے میں شدید ذہنی اضطراب اور کشمکش میں مبتلا تھی۔ جو احساس میرے اندر پرورش پا رہا تھا اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ برسوں پہلے جب میں نے یہ قدم اٹھایا تو ایسا لگتا تھا کہ میرا یہ فیصلہ بالکل ٹھیک اور جائز ہے۔۔۔۔۔ اور ایک لحاظ سے جائز بھی تھا کہ میں ایک عورت ہوں۔ ماں بننے کی فطری خواہش میرے اندر بھی موجود تھی اور مجھے اس کا حق بھی تھا۔ عورت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ ماں بنتی ہے۔ اور پھر جب۔۔۔۔۔ پہلے تم آئے اور پھر ڈینی تب مجھے کتنی خوش ہوئی تھی۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مکمل ہو گئی ہوں اور ادھوری نہیں، پوری عورت ہوں۔“

جان نے ہولے سے سر کو جنبش دی۔ ”لیکن اب۔۔۔۔۔؟“

”لیکن اب اتنے برسوں بعد ایک خلش نے میرے اندر سر اُبھارنا شروع کیا۔ یہ کہ شاید میں تمہارے اور ڈینی کے ساتھ نا انصافی کر رہی ہوں۔ اصل حقیقت کا جاننا تم دونوں کا اصولی اور فطری حق ہے۔ اگر میں تم دونوں کو اس حق سے محروم کر دوں گی تو یہ اخلاقی جرم ہوگا اور اس جرم کے لئے میرا ضمیر ہمیشہ مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ جان! تم قیاس بھی نہیں کر سکتے کہ ضمیر کی خلش کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔“

جیکو لین لمحہ بھر چپ رہی، پھر اس نے اضافہ کیا۔ ”اس کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے۔۔۔۔۔ وہ ہے گھر کی فضا۔ میں نے ایک ”فیملی“ اور ایک ”گھر“ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں ناکام رہی ہوں۔ ہم سب کے درمیان تکلف اور اجنبیت موجود ہے جو ”گھر“ میں نہیں ہوتی۔ تم دیکھتے ہو کہ کریگ اس طرح ہر شے سے۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہوتا جا رہا ہے جیسے اس کا ہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور یہ ساری صورت حال بتا رہی ہے کہ میں ”گھر“ نہیں بنا سکی ہوں۔“

جیکو لین نے رُک کر سانس لی اور جان کی طرف پشیمانی سے دیکھا۔ ”یہ دو وجوہ ہیں کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ مجھے اب بھی یقین نہیں کہ زبان کھول کر میں نے غلط کیا ہے یا صحیح۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ میرے دل سے وہ بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے، جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔“

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ جان بھی خاموش رہا۔ عقبی باغیچے میں اچھی خاصی گہبا گہبی ہو گئی تھی۔ تقریباً ساری ہی میزیں بھر گئی تھیں۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی آوازیں اور چھوٹے چھوٹے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ لیکن ان دونوں کو اپنے گرد و پیش کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ دونوں چپ تھے اور اپنی اپنی ذات کے

تاریک خلا میں بھٹک رہے تھے۔ جان کا چہرہ پھیکا، سپاٹ اور بظاہر کسی بھی تاثر سے عاری نظر آتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر قیامت برپا تھی۔ بیجان، اضطراب، ان گنت سوال تھے جو زبان پر آنے کے لئے بے تاب تھے مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ ہونٹ بھیجنے جیکولین کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ماں کے لئے شدید ہمدردی تھی۔



تو ساری بات یوں تھی کہ اس گھر میں رہنے والے چار افراد کے درمیان عجیب سارشتہ تھا۔ جیکولین بلاشبہ جان اور ڈینی کی ماں تھی لیکن کریگ ان کا باپ نہیں تھا۔ ڈینی اور جان بے شک بھائی تھے لیکن سوتیلے ماں ایک تھی مگر باپ الگ الگ۔ اور ستم یہ تھا کہ ان کے باپ کے بارے میں خود جیکولین بھی کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ اس کے بیان کے مطابق برسوں پہلے یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی کیونکہ کریگ جسمانی طور پر صحت مند ہونے کے باوجود باپ نہیں بن سکتا تھا کیونکہ وہ بار آور نہیں تھا۔ یہ سن کر دونوں کو حد درجہ صدمہ اور مایوسی ہوئی تھی۔ کیسا ستم ہے یہ..... دونوں اچھی نارمل ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن اپنی ذات اور ازدواجی زندگی کی فطری تکمیل سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ بڑا المیہ تھا جو خاص طور سے جیکولین کے لئے شدید صدمے کا باعث بن گیا تھا۔ ماں بننے کی خواہش ہر عورت میں ہوتی ہے لیکن جیکولین میں یہ خواہش شاید کچھ زیادہ ہی شدید تھی۔ اس کے بیان کے مطابق اولاد سے محرومی کے احساس نے اس کے دل و دماغ پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس صورت میں یہ دکھ زیادہ الم ناک اور زہریلا ہو گیا تھا کہ وہ خود ماں بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی مگر بن نہیں سکتی تھی۔ یہ تقدیر کا ایسا ستم انگیز مذاق تھا جس کی توجہ بہ ممکن نہیں تھی۔

رفتہ رفتہ جیکولین کا دکھ بہت زیادہ بڑھتا بڑھتا کریگ بھی فکر مند ہوا۔ جیکولین بہر حال اس کی بیوی تھی اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے جیکولین سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ جیکولین کے بیان کے مطابق ان کے درمیان کئی بار بات چیت ہوئی اور کئی صورتوں پر غور کیا گیا۔ ایک صورت تو یہی تھی کہ بچہ قانونی طور پر گود لیا جائے لیکن جیکولین راضی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے بچے چاہتی تھی۔ ایسے بچے جنہیں وہ اپنی کوکھ سے جنم دے۔ آخر کار کریگ کی صلاح پر دونوں نے اسپرم بینک کا رخ کیا۔

”لیکن ہمیں بہر حال کئی مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ قانونی ضابطوں کی تکمیل ضروری تھی۔ فرٹیلیٹی اسپیشلسٹ نے ہمارا نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی معائنہ بھی کیا۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ آیا ہم میں اچھے والدین بننے کی کی اہلیت و صلاحیت ہے بھی یا

نہیں۔ مالی حالت اور دیگر کوائف بھی دیکھے گئے۔ اس کے بعد ہی ہمیں وی آئی ایف کے لئے مناسب سمجھا گیا۔“

جیکو لین نے رُک کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو غور سے دیکھا۔ چند لمے بعد اس کی افسردہ آواز پھر ابھری۔

”ابتداء میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ کریگ بھی خوش تھا۔ کیونکہ اب ہماری ایک مکمل فیملی تھی کریگ، میں، دو خوبصورت بچے اور ایک گھر۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہئے تھا مجھے۔ کچھ وقت گزرا، پھر حالات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ میں تو خیر خوش اور مطمئن تھی مگر کریگ بدلتا جا رہا تھا۔ وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ اپنی ذات سے بے پرواہ ہو گیا تھا۔ اس کے سارے شوق ختم ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے تم اس کی حالت کا تجزیہ کر سکتے ہو کہ بتدریج وہ اپنی ذات کے اعتبار سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔“

”ہاں..... میرا خیال ہے میں سمجھ سکتا ہوں۔“ جان نے کہا۔

یہ گفتگو چند دن بعد ہو رہی تھی۔ وہ دونوں کچن میں بیٹھے تھے۔ سامنے وسیع دریچہ تھا جس سے عقبی باغیچہ تقریباً پورا نظر آ رہا تھا۔ سہ پہر کی پھیکی دھوپ میں جان نے باغیچے کی اجڑی ہوئی حالت کو زرا دھیان سے دیکھا، پھر سگریٹ جلا کر جیکو لین کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ تو سب ٹھیک ہے مگر! لیکن ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے۔ وہ یہ کہ میرے اور ذینی کے باپ الگ الگ کیوں ہیں؟“

”مجبوری تھی۔“ جیکو لین نے پشیمانی سے جان کی طرف دیکھا۔ ”جس شخص نے اپنے اسپرم (مادہ تولید) کا عطیہ دیا تھا، تین سال بعد اس کے اسپرم بینک میں ختم ہو چکے تھے۔ مجھے مجبوراً کسی اور.....“ جیکو لین کا ایک چپ ہو گئی۔

جیکو لین چپ ہوئی تو یلکنت جان کے ذہن میں ایک دہشت انگیز خیال نے سر ابھارا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟..... ہاں، یہ ممکن ہے۔ اور شاید بلکہ یقینی طور پر ایسا ہوا بھی ہوگا۔ اس کے اور بھی بہن بھائی..... اس نے تجسس نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ یہ سوال اس کے ہونٹوں پر چلا مگر وہ ضبط کر گیا۔ پوچھنا بے سود ہی ہوتا کہ جواب اسے معلوم تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور در ماندہ نظروں سے جیکو لین کی طرف دیکھتا رہا۔

”مدر.....!“ آخر اس نے ہونٹوں کو جیش دی۔ ”تم نے کبھی عطیہ دینے والے کا نام جاننے کی کوشش کی تھی؟“

”کی تھی۔“ جیکو لین نے پست آواز میں جواب دیا۔ ”یہ کوئی دس سال پہلے کی بات ہے۔ میرے دل میں جستجو پیدا ہوئی کہ جاننا تو چاہئے کہ عطیہ دینے والا کون تھا، اس کا نام

کیا تھا؟ چنانچہ میں نے دینک سے رابطہ کیا مگر.....“ جیکولین معا چپ ہو گئی۔

”ان کے پاس لولی ریکارڈ نہیں تھا۔“ جان نے کہا۔

جیکولین نے اثبات میں لردن کو خفیف سی جنبش دی۔

”اب اور لولی ذرا یہ نہیں ہے کہ اس شخص کا نام معلوم ہو سکے؟“

”نہیں.....“ جیکولین نے پھر قدرے پھر کر قدرے زخمی آواز میں اضافہ کیا۔ ”جان!

بھئی، اتنی افسوس ہے۔ کیونکہ اب محسوس ہوتا ہے کہ مجھے یہ قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔“

جیکولین کو بہت افسوس تھا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ جیکولین کی پشیمانی جان کے دکھ کے تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح قانون میں تبدیلی بھی جان کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے ضابطے کے تحت عطیہ دینے والوں کا طبی معائنہ ہوتا تھا اور پھر ان کے تمام کوائف باقاعدہ طور پر درج کئے جاتے تھے لیکن قانون کا دوسرا رخ یہ تھا کہ معظیوں کی فہرست اور تمام تفصیلات صیغہ راز میں رکھی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ ہونے والی ماں کو بھی ان سے اطمینان رکھا جاتا تھا اور ایک خاص مدت کے بعد ان عطیہ دینے والوں کے تمام کوائف تلف کر دیئے جاتے تھے۔

کچھ عرصہ قبل حکومت کو اس خامی کا احساس ہوا تو قانون میں تبدیلی کی گئی۔ اب ماں بننے والی خواتین اگر چاہیں تو عطیہ دینے والے کا نام اور دیگر تفصیل معلوم کر سکتی ہیں۔ تاہم یہ قدم بہت دیر سے اٹھایا گیا اور اس سے جان اور اس جیسے ان گنت افراد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اپنی ”جڑوں“ اور نام و نسب کے بارے میں کبھی بھی حقائق معلوم نہیں کر سکتے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کس سے شکوہ کریں؟ کون جواب دے گا؟

تاہم یہ ضرور ہے کہ اب بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔ کئی سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ جان کے لئے اب یہ سمجھنا دشوار نہیں رہا تھا کہ کریگ جو قدیل کی طرح روشن تھا، کیوں دھیرے دھیرے بجھ گیا؟ یقیناً یہ احساس اس کے لئے رفتہ رفتہ ناقابل برداشت ہوتا چلا گیا تھا کہ جن بچوں کو اس کی بیوی نے جنم دیا ہے وہ اس کے نہیں۔ حالانکہ اس کے کہلاتے ہیں لیکن ہیں کسی اور کے۔ یہ اُجالا ایسا ہے جو بھیک میں اُسے ملا ہے۔ بھیک، چیرٹی..... یہ خیال باشبہ اس کے لئے بے حد اذیت ناک اور سوہان روح ہو گا۔ اتنا کہ دھیرے دھیرے وہ خود اپنی نظروں سے گر گیا۔ بے شک کچھ لوگ ایسی صورت حال سے بہتر طور پر سمجھوتا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن کریگ ایسا نہیں تھا۔ نا اہلی اور بے وقعتی کے

احساس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ جیکولین سے اس کے تعلقات میں دراڑ پڑ گئی۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ انہوں نے ”میرج کاؤنسل“ سے بھی رجوع کیا لیکن بات نہیں بنی اور گھر کی اجنبی فضا گہری ہوتی چلی گئی۔

جان نے بھی بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتا کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ جوں جوں وقت گزرے گا، زخموں کے اند مال کی صورت بن جائے گی لیکن یہ خیال محض خیال خام تھا کیونکہ ہوا اس کے برعکس۔ ایک سوال کسی آسب کی طرح مسلسل اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ ہیرسین تو یقیناً نہیں ہے۔ پھر کیا ہے؟ وہ سے بھی مانہیں ہے؟

کبھی کبھی وہ بڑی شدت سے محسوس کرتا کہ اسے پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اسے پیدا کیا گیا صرف اس لئے کہ جیکولین کے جذبہٴ مامتا کی تسکین ہو سکے مگر یہ ظلم تھا، خود غرضی تھی۔ جیکولین کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایک اور سوال یہ کہ معاشرہ ایسی باتوں کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کو بھلا اس دنیا میں کیونکر الیا جاسکتا ہے جن کا کوئی پس منظر نہ ہو، نام و نسب نہ ہو۔ جان ان باتوں پر غور کرتا تو بڑا حیران ہوتا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملتا تو اسے اپنی ماں جیکولین پر شدید غصہ آتا۔ ایک نفرت سی محسوس ہوتی۔ مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی۔ غصے کی لہر اترتی تو اسے جیکولین پر ترس آتا۔ بے چاری مورت، اس نے ایسا قدم اٹھایا صرف اس لئے کہ اس کی فیملی مکمل ہو سکے اور اس کا شوہر خوش ہو سکے۔ اس کی نیت بری نہیں تھی مگر اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور وہ اس پر اب پشیمان بھی ہے۔ جب جان اس بات پر غور کرتا تو اس کا غصہ فرو ہو جاتا مگر ان متضاد کیفیات کا رد عمل یہ ضرور ہوا کہ اس کے اور جیکولین کے درمیان ایک ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی لیکن فاصلہ نہیں بڑھا۔۔۔۔۔۔ بس ایک ناقابلِ توجہہ حجاب درمیان میں حائل ہو گیا۔ دونوں بہت کم ایک دوسرے سے بات کرتے، بہت کم ایک دوسرے کا آنا سامنا کرتے اور جب سامنا ہو ہی جاتا تو کچھ شرمندہ سے نظر آتے۔ خاص طور پر جیکولین۔ ایسا لگتا جیسے وہ کسی احساسِ جرم میں مبتلا ہے۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی کہ جان نے غیر ارادی طور پر کریگ کو ڈیڈ کہنا ترک کر دیا۔ یہ بات بھی بس خود بخود ہو گئی۔ جب پہلی بار اس نے کریگ کو ”ڈیڈ“ کی بجائے ”کریگ“ کہہ کر مخاطب کیا تو کریگ زور سے چونکا، پھر اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے جان کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ جان نے ایسی بے روح، زخمی اور بے وقتی کے احساس سے مملو مسکراہٹ کا مشاہدہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

پھر لریک نے جیکولین سے تعلق ختم کیا اور گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

ہان کا یہ خیال تھا کہ اسے وقت کے ساتھ صبر آ جائے گا اور وہ جیسے تیسے صورت
حالات کو قبول کر لے گا لیکن! یہاں نہیں ہوا۔ اپنی روتس (Roots) کے بارے میں جاننے
لی نہ اہش دن بہ دن بڑھتی گئی۔ اس کا خیال ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔ اپنے باپ کو تصور میں
، یٹنے کی کوشش کرتا۔ کیا ہوگا وہ شخص جو دنیا میں اس کی آمد کا ذمہ دار ہے؟ اُس کا قد
کاٹھ، چہرہ مہرہ، رنگت، مزاج و عادات، اس شخص کی کتنی خصوصیات ہوں گی جو اسے
ورثے میں ملی ہیں؟ غصہ، صبر، تحمل، عجلت پسندی۔ اُسے کون سا رنگ پسند ہوگا؟.....
جان کو بھورا رنگ بہت پسند ہے، کیا وہ بھی بھورا رنگ پسند کرتا ہوگا؟..... دھیرے
دھیرے جان نے بالکل غیر شعوری طور پر ایک عجیب عادت اختیار کی۔ بازار میں چل رہا
ہوتا، مارکیٹ یا کسی اسٹور میں جاتا یا کسی تقریب میں، تو اس کی نظریں بغیر کسی ارادے
کے اطراف میں بھٹکانا شروع کر دیتیں، چہروں کا طواف کرتیں۔ خاص طور پر پچاس سال
کی عمر کے آس پاس والے مردوں کو بغور دیکھتا رہتا۔ چہروں کے خدو خال، آنکھوں کی
رنگت، بال اور جسمانی ساخت، اشعوری طور پر اُس کا ذہن مشابہت تلاش کرتا تھا۔ کبھی
بھی کوئی چہرہ نظر آتا جس میں اسے اپنے چہرے کی جھلک محسوس ہوتی تو چونک جاتا۔ کیا
یہ ممکن ہے؟ کیا یہ شخص میرا باپ ہو سکتا ہے؟..... ہاں، ناممکن تو نہیں۔ اس کا باپ
..... وہ جو کوئی بھی ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی بھی اس شہر میں موجود ہو۔ کسی پ میں بیٹھا
بیسر پی رہا ہو، کسی فیکٹری میں مشینوں سے اچھ رہا ہو یا کسی گھر کے لونگ روم میں بیٹھا
وی دیکھ رہا ہو اور شاید..... ہاں شاید کبھی اچانک کہیں مل جائے۔ مجھے بھی تو ہوتے
ہیں نا۔ لیکن بہر حال اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہر وہ چہرہ جس میں اُسے اپنی جھلک
محسوس ہوتی، کسی نہ کسی وجہ سے رد کرنا پڑتا۔ کبھی قد کاٹھ، کبھی آنکھوں یا بالوں کی رنگت
اور کبھی عمر۔ جان نے اپنی اس عجیب اور تکلیف دہ عادت سے پیچھا چھڑانے کی خاصی
کوشش کی لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ دراصل اُسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔
بس خود اس کی نظریں چہروں کو مٹولنے لگتی تھیں۔

چلتے چلتے یکایک اُسے جوڈی کا خیال آیا۔



جوڈی کا خیال آیا تو اس کے سینے کے اندر کوئی شے چیخ کر ٹوٹی۔ ایک تیز، دو دھاری
ٹیس اٹھی اور رگوں میں دوڑتی چلی گئی۔ جوڈی کہاں ہوگی؟ وہ کیسی ہوگی؟..... کئی ماہ ہو
گئے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ نہ جانے کیا سوچتی ہوگی؟ شاید بہت دکھی ہوگی اور اس

سے یقیناً نفرت کرنے لگی ہوگی۔ لیکن جان بھی کیا کرتا، دل کا رشتہ نہ توڑتا تو کیا کرتا۔
مجبور تھا، جس اذیت میں گھر گیا تھا اس سے نہات کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

جان نے افرودہ سی سانس لی۔ چلتے چلتے بیٹے دنوں کے ان گنت مناظر تصور میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ان مناظر میں جوڑی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ہنستی، مسکراتی، صبح کی پہلی کرن کی طرح روشن، گلاب کی کلی کی طرح حسین اور دلفریب، زندگی سے بھرپور، ذہین، شائستہ۔ اُس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک سلیقہ مند اور گھر گھر ہست عورت کا اثاثہ تصور ہوتی ہیں۔ یہ دونوں کوئی دو سال سے ایک دوسرے کے دوست تھے بلکہ زیادہ سچ تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ہر چند کہ ان کے درمیان شادی کے موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی مگر یہ تقریباً طے ہو چکا تھا کہ آئندہ زندگی میں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہوں گے۔ یہ احساس کم از کم جان کے لئے بے حد جاں فزا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کی آئندہ زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ بھلا جوڑی جیسی لڑکی شریک سفر کے طور پر کتنوں کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر پھر اُس نے یکا یک جوڑی سے ملنا بند کر دیا اور سب اس کا شخص اتنا تھا کہ اس کے ذہن میں وہم بیٹھ گیا تھا۔

جوڑی قریبی شہر میں رہتی تھی اور ہر سنیچر کو جان سے ملنے آیا کرتی تھی۔ جان کو وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب ان کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک ایشیائی ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ جوڑی کو بریانی اور شامی کباب بہت مرغوب تھے اور وہ اکثر ایشیائی ریسٹورانوں کے چکر لگایا کرتی تھی۔ وہ دونوں بریانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ جان کی کسی بات پر جوڑی کھلکھلا کر ہنسی تو یکا یک جان کے ذہن میں ایک خیال نے سر اٹھایا اور وہ جوڑی کی شکل دیکھنے لگا۔

جیکو لین کے بیان کے مطابق اس شخص کے اسپرم بینک میں ختم ہو چکے تھے جو جان کا نامعلوم قدرتی باپ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اسپرم دوسری عورتوں میں بارآوری کے لئے استعمال کئے گئے ہوں گے اور ان عورتوں کی تعداد کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ دو، چار، چھ اور اس کا مطلب پھر یہ ہوا کہ جان کے کچھ اور بہن بھائی بھی ہوں گے۔ اگرچہ یہ ضروری تو نہیں مگر اس امکان کو قطعی طور پر رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ راستہ چلتے جب جان چہروں میں اپنی مشابہت تلاش کرتا تھا تو اس کے ذہن میں بھائی اور بہن کا تصور بھی ہوتا تھا۔ اس وقت جوڑی کھلکھلا کر ہنسی تو وہ یکا یک ہم گیا..... کیا یہ ممکن ہے.....؟

جوڑی کے والدین میں اس وقت علیحدگی ہو گئی تھی جب وہ محض پانچ سال کی تھی۔ اس

کا باپ ذرا ہی آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ دو سال بعد ٹریفک حادثے میں جوڈی کی ماں بھی چل بسی تھی۔ تب اس کی پرورش رشتے کی ایک خالہ نے کی تھی مگر دو تین سال ہوئے اس کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ باپ نے آسٹریلیا جانے کے بعد کبھی جوڈی کی خبر نہیں لی۔ جوڈی نے بیان کے مطابق خالہ کا کہنا تھا کہ جوڈی کے باپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ بالکل ہی اُتعلق اور بے خبر ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ جوڈی کو یہ تک علم نہیں تھا کہ اس کا باپ آسٹریلیا کے کس علاقے میں رہتا ہے۔ جان کے ذہن میں اکثر اس خیال نے کچھ کے لگائے تھے کہ ایسا کیوں تھا؟ باپ کو بیٹی سے دلچسپی کیوں نہیں تھی؟

جان غور سے جوڈی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور جو خیال اس کے ذہن میں سانپ کی طرح کلبایا تھا اس کا اثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں کے چہروں میں تھوڑی سی مشابہت بہر حال موجود تھی۔ آنکھوں کی بناٹ اور رنگت اور ہنسنے کا انداز، خاص طور پر بات کرتے وقت بائیں ہاتھ کو جنبش دینے کا انداز دونوں کا تقریباً ایک جیسا تھا..... تو کیا یہ ممکن ہے؟..... جان نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ پھر مدھم آواز میں بولا۔

”جوڈی! کیا واقعی تمہیں اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟“

جوڈی یکا یک چپ ہو گئی۔ چند لمحوں حیرت سے جان کو دیکھتی رہی، پھر سر جھکا کر بولی۔

”یہ تمہیں میرے باپ کا خیال اچانک کیسے آ گیا؟“

”پتا نہیں..... بس یوں ہی۔“ جان شپٹا گیا۔

جوڈی نے بایں ہاتھ ہلایا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ وہ آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ اب کہاں ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔“

”تم نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی؟“ جان نے سرسری طور پر پوچھا۔

”نہیں۔ جب اسے میرا خیال نہیں تو میں اس کی پرواہ کیوں کروں؟“ جوڈی نے بے پروائی سے کہا۔

جان کے ہونٹوں پر ایک سوال چلا جو اس کی پیدائش کے بارے میں تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ بڑی معیوب بات ہوتی اور یقیناً جوڈی کی دل آزاری کا باعث بنتی۔ ویسے بھی اس بات کا امکان بظاہر نہیں تھا کہ جوڈی کو علم ہوگا۔ ماں اور خالہ اس دنیا میں اب نہیں تھیں۔ جوڈی کو اپنی پیدائش کے بارے میں کوئی بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی؟ چنانچہ وہ چپ رہا اور رشک بھری نظروں سے جوڈی کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا۔

اگلے چند دن جان کے لئے شدید کشمکش کے تھے۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے اس نے کئی دلیلیں اور تاویل میں تراشیں۔

نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، چہرہ کے نین نقش میں مماثلت اتفاقیہ ہے۔ اکثر افراد ہم شکل ہوتے ہیں جبکہ ان میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ لیکن بات نہیں بنی۔ وہم بڑھتا گیا۔ ایک سوال..... دہشت بھراسوال، اگر زندگی جوڑی کے ساتھ گزارنی پڑی تو آنے والے بے شمار شب و روز اس وہم کے بوجھ تلے گزریں گے۔ ایک شک و شبہ ذہن پر ہمیشہ مسلط رہے گا۔ کیا یہ درست ہوگا؟ ہرچند کہ یہ ضروری نہیں کہ اگر دو افراد میں مشابہت ہو تو ان کے درمیان رشتہ بھی ہو۔ لیکن فرض کرو کہ اس کے اور جوڑی کے درمیان کوئی رشتہ..... یہ خیال اتنا دہشت ناک تھا کہ جان اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔

ویک اینڈ آیا تو وہ صبح گھر سے نکلا، اسٹیشن پہنچا، ٹرین پکڑی اور برائین چلا گیا۔ اس کے بعد جوڑی سے اس نے ملاقات نہیں کی۔ جوڑی نے کئی بار فون کیا، ملنے کی کوشش بھی کی مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گیا۔ دراصل وہ اپنے آپ میں اتنی ہمت بھی نہیں کر پاتا تھا کہ جوڑی کا سامنا کر سکے۔ آخر کار جوڑی بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ بہر حال جبراً جان کے گلے کا ہار نہیں بننا چاہتی تھی۔

”جوڑی!“

جان نے چلتے چلتے اس کا نام اپنی زبان سے ادا کیا اور ٹھنڈی سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ جوڑی کو کھونے کا ملال اسے ساری زندگی رہے گا۔



جب وہ دفتر کی عمارت کے سامنے پہنچا تو دو بج چکے تھے۔ اُس نے تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں طے کیں اور ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ کمرے میں زیادہ افراد نہیں تھے، صرف ایک مرد اور ایک عورت۔ اس نے استقبالیہ میں اپنا نام بتایا پھر الگ تھلگ بیٹھ گیا۔ مرد دیوار پر آویزاں تصاویر دیکھنے میں مصروف تھا جبکہ عورت ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

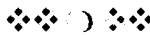
وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور غیر ارادی طور پر عورت، مرد اور استقبالیہ کلرک کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ وہی تجسس، وہی خلش لیکن بالکل غیر ارادی..... اس آدمی کا ماتھا کیسا ہے؟ اور اس عورت کی آنکھیں؟ نہیں، خاصا فرق ہے۔ اور مرد کے چہرے کی ساخت اور بالوں کی رنگت، مگر اس کی عمر بہت کم ہے۔ اُس نے اکتا کر سامنے میز پر رکھے میگزین میں سے ایک اٹھایا، سرورق پر نظر ڈالی۔ سرورق پر فٹ بال کے ایک مشہور کھلاڑی کی تصویر تھی۔ اس کی نظر بالکل غیر ارادی طور پر کھلاڑی کے خدوخال پر بھٹکی۔ آنکھیں، ناک، پیشانی اور بال..... یکا یک جان جھنجھلا گیا۔ کیسا عذاب ہے؟ کیسے اس عادت سے پیچھا چھڑائے؟

اُس نے اُسکا کر رسالہ واپس میز پر ڈال دیا۔
 اُسے کوئی بیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر مستقبلِ کلرک نے اسے مخاطب کیا۔
 ”مسٹر براؤن آپ کے منتظر ہیں۔“
 ”شکریہ۔“

راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا۔ اختتام پر سرخ رنگ کا دروازہ تھا۔ اُس نے دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہوا۔ مسٹر براؤن ایک مرسید، مگر خوش مزاج آدمی تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کی درخواست کی۔ جان جھکتا، اکرسی پر بیٹھ گیا۔ مسٹر براؤن نے اپنی کرسی سنبھالی اور کرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟“
 ”جی ہاں.....“ جان نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دراصل ایک چھوٹا سا انونی مسئلہ درپیش ہے۔“ وریات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔
 ”فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں مسٹر ہیرس؟“ مسٹر براؤن نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہیرس! جان کے سینے میں ایک تیز سُوئی چبھی۔ اس نے افسردگی سے سانس لی اور پے۔ آواز میں بولا۔

”مسٹر براؤن! دراصل بات یہ ہے کہ میں..... میں اپنا خاندانی نام ڈیڈ پول کے ذریعے تبدیل کرنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے۔“
 آخری الفاظ اس نے بدقت تمام ادا کئے اور پھر دبی زبان سے اپنی ماں جیکولین کے آپ کا نام ادا کیا۔ ”کلارک“ اور متاسفانہ مگر اُمید بھری نظروں سے مسٹر براؤن کی طرف دیکھا۔



آسیب

جب مجھے اپنے چھوٹے سے شہر میں ملازمت نہیں ملی اور برسرِ روزگار ہونے کی ہر آس ناکام عاشق کے دل کی طرح ٹوٹ گئی تو میں نے بوریا بستر باندھا، بطور زادراہ اماں کی دعائیں لیں اور اس بڑے شہر میں چلا آیا۔

میرا ایک دوست زبیر جس سے برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اس شہر میں سکونت پذیر تھا۔ اس نے اپنے گھر کی بیٹھک عارضی طور پر مجھے دے دی۔ پھر حصولِ ملازمت کے لئے سڑک نور دی شروع ہوئی۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک دفتر سے دوسرا دفتر۔ ابھی جوتوں کے تلے پوری طرح ہسے نہیں تھے کہ ایک دفتر میں ملازمت مل گئی جو میری توقع اور پسند کے مطابق نہیں تھی مگر بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق میں نے اسے ہی غنیمت جانا۔ زبیر نے کہا۔ ”پکڑ لو اس نوکری کو..... ایک بار پاؤں جم تو جائیں، بعد میں کوئی بہتر ملازمت تلاش کر لینا۔“

ملازمت پر لگ گیا تو پھر رہائش کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔

اس بڑے شہر میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ دنیا کی ہر شے۔ حتیٰ کہ نوکری بھی۔ مگر کچھ اشیاءِ مفقوت ہیں اور قسمت والے ہی کو ملتی ہیں مثلاً مروت، رواداری، سکون، کل کا اعتبار اور مکان۔ جب جوتوں کے تلے نصف سے زیادہ گھس گئے اور کوئی قاعدے قرینے کا مکان ملنے کے آثارِ نظر نہیں آئے بلکہ حصولِ رہائش کی ہر آس ناکام عاشق کے دل کی طرح ٹوٹنے لگی تو ایک دن اچانک اس مکان کے بارے میں اطلاع ملی۔

مکان مجھے پسند آیا۔ دو کمرے، گھن، آئین، باورچی خانہ اور ایک اسٹور روم۔ اوپر چھت پر بھی ایک چھوٹا سا کمرہ۔ مکان کی بائیں جانب ایک نشادہ لگی تھی۔ جس میں ایک پرانا درخت ایسا تادہ تھا اور گہرے سبز پتوں سے لدی پھندی اس کی شاخیں نصف چھت پر سایہ کئے رہتی تھیں۔ مکان کا داخلی دروازہ کچی میں تھا۔ جبکہ عقبی کمرے کا کشادہ دریچہ سڑک کی جانب کھلتا تھا۔ مکان کا محل وقوع مجھے پسند آیا۔ اس میں اتنی گنجائش بھی تھی کہ میری

اماں اور چھوٹے بہن بھائی آرام سے رہ سکتے تھے۔ ایک اور اچھی بات یہ تھی کہ مکان زیر کے گھر سے محض چند سو گز کے فاصلے پر تھا۔

”مکان تو اچھا ہے۔“ زیر نے کہا۔ ”کرایہ بھی مناسب ہے۔ مگر.....“

میں نے سوالیہ نظروں سے زیر کو دیکھا۔ ”بھوت.....؟“

”ہاں، سامنے والا پنواری کہہ رہا تھا کہ مکان آسیب زدہ ہے۔“

”مجھ سے بھی دو ایک افراد نے کہا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن تم کیا واقعی یہ سمجھتے

ہو کہ اس مکان میں بھوت ہے؟“

”پتا نہیں۔“ زیر نے کہا۔ ”مناسب ہو گا کہ پہلے اچھی طرح چھان بین کر لی

جائے۔“

چنانچہ چھان بین کی گئی۔ چند ایک افراد کا کہنا تھا کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ پچھلا

کرائے دار اسی بناء پر مکان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ مکان میں رونما ہونے والے

ناقابل توجیہ واقعات سے وہ اور اس کے بیوی بچے ڈر گئے تھے۔ انہوں نے گھر میں

سائے چلتے پھرتے دیکھے تھے اور آوازیں سنی تھیں۔ تصدیق یا تردید کے بغیر سابقہ کرایہ

دار سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ وہ کسی دوسرے شہر منتقل ہو گیا تھا۔ مالک مکان سے

اس معاملے پر گفتگو ہوئی تو اس نے مکان میں کسی بھوت پریت کی موجودگی سے صاف

انکار کیا۔

”میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں کئی سال اس میں خود رہ چکا ہوں۔“

”پھر آپ نے مکان چھوڑا کیوں؟“

”ارے جناب! میرا کنبہ بڑا ہے۔ اس مکان میں ضرورت کے مطابق گنجائش نہیں

تھی۔ مجبوراً رہائش کے لئے دوسرا بندوبست کرنا پڑا۔“

”مگر لوگ کہتے ہیں کہ سابقہ کرائے دار.....“

مالک مکان ہنسا۔ ”اس کی تو بات ہی نہ کیجئے..... اس نے تو کئی سال سے میرے کہنے

سننے کے باوجود کرائے میں ایک میسے کا اضافہ نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ذرا سخت رویہ

اختیار کیا تو اس نے بھوت پریت کی کہانی مشہور کر دی..... مقصد صرف یہ تھا کہ میں کرایہ

نہ بڑھاؤں۔“

”تو گویا بھوت پریت کی کہانی محض ایک انتقامانہ کارروائی تھی؟“ زیر نے کہا۔

”جی ہاں۔“

”تو پھر مکان گزشتہ کئی ماہ سے خالی کیوں پڑا ہے؟“ میں نے جرح کی۔ ”اس شہر میں

تو رہائش کی بے حد قلت ہے۔ لوگوں کو جھوپڑی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ اس صورت میں ایسا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ کا مکان جو خاصا اچھا ہے، کئی ماہ سے خالی پڑا ہے۔

”عجیب بات تو ہے۔“ مالک نے ٹھنڈی سانس لی۔ چاندی کی ڈبیا سے ایک عدد پان بآمد کیا اور کٹے میں دبایا۔ ”دیکھئے محترم! آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی کہانیاں مشہور ہو جائیں تو ان کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہی صورت میرے مکان کے ساتھ ہے۔ پچھا کر اے دار تو چلا گیا مگر اس محلے میں بد قسمتی سے میرے کئی بد خواہ ہیں جو ان کہانیوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مکان کے خواہش مند آتے ہیں لیکن جب آسب کے بارے میں سنتے ہیں تو غائب ہو جاتے ہیں۔“ مالک مکان نے رک کر ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں نے تو جناب! اسی بناء پر کرایہ بھی کم کر دیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مکان کسی طرح آباد ہو جائے۔ مگر بات بنتی ہی نہیں۔ آپ یقین کیجئے، مکان ہر طرح محفوظ ہے۔ اس میں کوئی بھی ضرر رساں شے نہیں ہے۔“

”یہ تو آپ کا بیان ہے۔“ زبیر نے جرح کی۔ ”فرض کیجئے اس مکان میں واقعی کچھ ہے تو؟“

مالک مکان نے تیسری بار سرد سانس بھری، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کو کب تک بلانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”ایک ڈیڑھ ماہ تک۔“ میں نے جواب دیا۔

مالک مکان نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں آپ کے سامنے ایک تجویز رکھتا ہوں۔ آپ اس مکان میں رہئے۔ میں آپ سے ایک ماہ کا کرایہ نہیں لوں گا۔ اگر مکان ہر طرح سے محفوظ محسوس ہو تو اپنی والدہ کو بلا لیجئے گا لیکن خدانخواستہ بات اس کے برعکس ہو تو مکان چھوڑ دیجئے گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ نیا مکان تلاش کرنے میں، میں خود آپ کی مدد کروں گا۔ کہئے، منظور ہے؟“

میں نے زبیر کی طرف اور زبیر نے میری طرف دیکھا۔

واپسی میں زبیر نے کہا۔ ”تو پھر کیا خیال ہے؟“

”یار! مجھے تو یہ تجویز خاصی معقول لگتی ہے۔“

”مگر.....“

”سنو۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”میں ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور جوان آدمی ہوں۔

بات پریت اور روحوں کو نہیں مانتا۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ مکان میں کوئی آسب وغیرہ

نہیں ہے۔ تاہم اگر فرض کر لیا جائے کہ بات اس کے برعکس ہے اور مکان میں کوئی بھوت صاحب واقعی قیام پذیر ہیں تو بھی مجھے یقین ہے کہ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ پاس پڑوس میں رہنے والے بھی افراد نے مکان کے آسیب زدہ ہونے کی تصدیق نہیں کی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی غیر معمولی بات کا مشاہدہ نہیں کیا۔

”تو پھر.....؟“ زیر نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔

”میں مکان میں رہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک ماہ کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ اگر مکان میں واقعی کسی آسیب کا سایہ ہے تو اس عرصے میں یہ بات ظاہر ہو جائے گی اور میں مکان چھوڑ دوں گا ورنہ.....“

”یار! پھر بھی۔“ زیر نے متذبذب ہو کر قطع کلام کیا۔ ”یوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو امتحان میں ڈالنا کچھ مناسب تو نہیں۔ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو.....“

”مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اطمینان رکھو۔“

”سوچ لو یار! مجھے فکر رہے گی۔“

زیر کا یہ جملہ مجھے اچھا لگا۔ مجھے فکر رہے گی۔ اس دورِ ناپرساں میں جب ساری قدریں بیوہ کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں، جب نفسا نفسی اور افراتفری نے آدمی کے حواس مختل کر دیئے ہیں، جب آدمی ہجوم میں بھی تنہا ہوتا جا رہا ہے اور اسے پڑوس کی خیریت پوچھنے کا لالچ بھی نہیں ہے تو کسی کا یہ کہنا اچھا لگتا ہے کہ اسے فکر رہے گی۔ یہ محض چند الفاظ ہی تو ہیں۔ لیکن بے وقستی کے اس دور میں یہ الفاظ انمول ہیں۔ میں نے ممنونیت سے اپنے دوست کو دیکھا، پھر ایک سگریٹ جلائی۔

”زیر! تم فکر نہ کرو..... مجھے کچھ نہیں ہو گا۔“ آخر کار میں نے کہا۔ ”بھوت پریت کے بارے میں بچپن سے سنتے آرہے ہیں لیکن کبھی کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ بدروحیں ہوتی ہیں یا نہیں، کبھی کبھی یہ جاننے کا شوق پیدا ہوتا ہے..... لہذا میرے خیال میں کوئی حرج نہیں ہے اگر ایک ماہ اس مکان میں گزارا جائے اور دیکھا جائے کہ مکان واقعی آسیب زدہ ہے یا نہیں، میں یہ تجربہ ایک شغل کے طور پر کرنا چاہتا ہوں..... اور اطمینان رکھو، اگر وہاں کوئی بھوت ہے تو ہو، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا بلکہ میں ہی اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دوں گا۔“

زیر نے ٹھنڈی سانس لی اور مجھے گھورا۔

پہلی رات زیر نے میرے ساتھ گزاری۔ ہم رات گئے تک چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے اور ساتھ ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر بھوت کا انتظار کرتے رہے۔ ابھی کچھ

نظر آئے گا۔ کوئی سایہ، چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں یا لپپاتی ہوئی زبان۔ کوئی دروازہ خود بخود
 ملے گا یا گلاس میز سے گر کر ٹوٹ جائے گا لیکن کچھ نہ ہوا۔ بھوت اگر تھا بھی تو اس رات
 اس نے آرام کرنے پر اکتفا کیا۔ رات گئے ہمہ منوں سو گئے۔

اگلے دن زیر اپنے بچوں کو لے کر کچھ دن کے لئے اپنے آبائی گھر چلا گیا کہ وہاں اس
 فی چھوٹی خالہ کے بڑے دیور کی چھوٹی بیٹی کی شادی خانہ آبادی وغیرہ کا سلسلہ تھا۔ جاتے
 ہاتے وہ تاکید کر گیا کہ اگر مجھے ذرا بھی کسی ناخوشگوار صورتحال سے دوچار ہونا پڑے تو
 میں فوراً مکان چھوڑ دوں اور اس کے مکان کی بیٹھک میں منتقل ہو جاؤں۔ میں نے چابی
 اس کے ہاتھ سے لے کر جیب میں رکھی اور وعدہ کیا کہ اس کی ہدایت پر پوری طرح عمل
 کروں گا۔



ایک ہفتہ گزر گیا۔

سات دن، سات راتیں۔ نہ پتا ہلا، نہ دروازہ کھلا یا بند ہوا اور نہ کوئی آواز سنائی دی۔
 کو میں بھوت پریت اور ارواح خبیثہ کا بالکل قائل نہیں ہوں، اس کے باوجود میں شاید غیر
 شعوری طور پر کچھ غیر معمولی اور مجیر العقول وقوے کے رونما ہونے کا منتظر تھا۔ ساتھ ہی یہ کہ
 شاید اندر سے کچھ خوفزدہ بھی تھا۔ آتے جاتے غیر ارادی طور پر شک بھری نظروں سے
 مختلف اشیاء کو گھورتا۔ یہ گلاس کیا اسی جگہ رکھا تھا؟ کیا کھڑکی کا پردہ میں نے اتنا ہی کھولا
 تھا؟ یہ دروازہ تو شاید پہلے نصف سے کم کھلا تھا، اب پورا کیسے کھل گیا؟..... شام کے
 بھٹ پٹے میں اور رات کے پرسکوت سننے میں میری نگاہ خود بخود ادھر ادھر بھٹکتی۔ شاید
 کسی سائے، کسی ہیولے کی جستجو میں۔ دل و دماغ میں ایک انجانا وسوسہ جاگزیں رہتا۔ لیکن
 سات دن گزر گئے۔ اور کچھ نہ ہوا۔ میں دھیرے دھیرے مطمئن ہو گیا۔

لیکن آٹھویں دن پہلی بار مجھے ایک ناقابلِ توجیہ تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔

شام کا وقت تھا۔ خاموشی اور تاریکی چاروں اور محیط تھی۔ میں صحن میں بیٹھا لیپ کی
 روشنی میں اماں کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیپ کی روشنی میں اس بناء پر کیونکہ حسب
 معمول بجلی چلی گئی تھی۔ ہمارے یہاں بہت سی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ مثلاً مہنگائی، سیاسی
 وعدے، آنے والا کل اور زندگی۔ ویسے ہی بجلی کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ ایک شوخ ادا محبوبہ
 کی طرح آنکھیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ جھلک دکھاتی ہے، مسکراتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے۔
 تب تیسری بار بجلی غائب ہوئی تو میں نے سوچ ہی آف کر دیا اور لیپ جلا لیا۔ لیپ کی

زرد روشنی میں خیر خیریت کے رسمی الفاظ ذرا خوشخط حروف میں لکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ معاً میرے کانوں میں ایک آواز آئی..... ایک خفیف سی آہٹ، پھر ایک منظم سی سرگوشی۔ زیادہ سچ یہ ہے کہ میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ بلکہ صرف محسوس کیا کہ آہٹ اور سرگوشی سنی ہے۔ غیر ارادی طور پر گردن خود بخود گھومی اور میں نے اندر کمرے میں جھانکا۔ اسی وقت دروازے کی مدم سی چرچاہٹ ابھری جو بالکل واضح تھی اور مجھے صاف سنائی دی۔ میں چند ثانیے ساکت و صامت بیٹھا رہا اور قدرے سراسیمہ نظروں سے کمرے میں دیکھتا رہا۔ پھر کسی اندرونی تحریک کے زیر اثر خود بخود اٹھا، لیپ ہاتھ میں لیا اور بے آواز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گیا اور سہمی ہوئی مگر تجسس آمیز نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ دائیں جانب دوسرا کمرہ تھا۔ مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ بائیں طرف ایک کٹھڑی یا اسٹنڈر روم تھا، اس کا دروازہ البتہ کھلا تھا اور چرچاہٹ کی آواز نہ لبا۔ اسی دروازے کے کھلنے سے ابھری تھی۔ عقب میں دریچہ تھا جو نصف کھلا ہوا تھا، اور اس کا پردہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

میں چند لمحے دروازے اور دریچے کے پردے کو دیکھتا رہا۔ ذہن میں الجھن تھی۔ آخر وہ آواز کیسی تھی؟ دروازہ کیوں چرچایا تھا؟..... میں نے ہوا سے لہراتے پردے کو دیکھا۔ یقیناً یہی بات ہے۔ شاید دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا۔ دریچے سے ہوا کا جھونکا آیا اور دروازہ چرچاہٹ کے ساتھ مزید کھل گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دریچے کا پیٹ ہوا سے ہلا ہو اور چرچاہٹ کی آواز اس سے ابھری ہو۔ ہاں، یہی بات ہو سکتی ہے۔

مجھے قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ پھر میں آگے بڑھا، دریچے کا پیٹ بند کر کے چٹخنی لگائی اور واپس مڑا۔

معاً مجھے رکنا پڑا۔

وہ کیا شے تھی؟ یہ طے کرنا اور وضاحت کرنا شاید سہرے لئے ممکن نہیں۔ یہ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے کہ واقعی کوئی شے تھی یا محسوس میرا وہم تھا۔ مجھے یکایک ایک ہیولہ سا نظر آیا تھا۔ ایک انسانی وجود۔ غیر مرئی۔ جو نظر نہیں آ رہا تھا مگر محسوس ہو رہا تھا..... طویل القامت اور جسیم۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اور گواہ کی آنکھیں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں تاہم صاف طور پر اور یقین کی حد تک محسوس ہو رہا تھا کہ دو جلتی ہوئی سرخ اور پُر تیش آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں..... میرے دل کی دھڑکن یکایک بڑھ گئی۔ ہاتھ پیروں میں سنناٹا ہونے لگی تھی۔ شاید ماتھے اور گردن پر پسینے کے دو چار قطرے بھی

اب آئے تھے..... میں کئی منٹ تک ساکت و صامت کھڑا رہا اور سراسیمہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا، شک کے حصار میں گھرا ہوا۔ کیا واقعی میں اُسے دیکھ رہا ہوں؟ کیا واقعی وہ ہے؟ یا پھر بات محض اتنی سی ہے کہ میرے دہم نے اس کا نا دیدہ وجود تراشا ہے؟..... میں نے سر کو ہولے سے جھکا اور غور سے اسے دیکھا۔
 ”کون ہو تم.....؟“

یہ بات میرے ہونٹوں سے نکلی تھی۔ مگر میں نے خود نہیں کہی تھی، خود بخود کہی تھی۔ میری آواز کمرے کی گہری خاموشی میں گونجی تو یکایک محسوس ہوا کہ اس کے بدن میں جنبش ہوئی ہے۔ پھر شاید اُس نے کچھ کہا، جو سنائی نہیں دیا۔ بس محسوس ہوا کہ اس نے کچھ کہا ہے۔ پھر میں نے اُسے جنبش کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ معانفہ اور ہوا کے ایک سبک جھونکے کی مانند چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پتھر کی طرح ساکت اور ٹھہری ہوئی آنکھوں سے کھلے دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک اس طرح چونکا جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے آنکھ کھلی ہو۔ وحشت بھری نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ درپچہ، اسٹور روم کا دروازہ اور وہ جگہ جہاں وہ کھڑا تھا۔ پھر میں آہستہ آہستہ چل کر صحن میں آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظر صحن اور آنگن میں بھٹک رہی تھی۔ کہاں گیا وہ؟..... صحن اور آنگن میں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید وہ اوپر چلا گیا تھا۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ الجھن، خوف اور تذبذب میں گرفتار۔ یہ سب کیا تھا؟ جو کچھ میں نے نہیں دیکھا، پھر بھی دیکھا، کیا واقعی دیکھا تھا؟..... کیا واقعی وہ ایک انسانی ہیولہ تھا؟ کیا لوگ سچ کہتے ہیں؟ یہ مکان سچ سچ آسیب زدہ ہے؟..... میں نے گردن گھما کر ایک بار پھر اس مقام پر نظر ڈالی، جہاں میرے احساس کے مطابق وہ کھڑا تھا۔ چند ثانیے دیکھتا رہا، سر کو زور زور سے جھکا اور آہستہ سے ہنستا۔ پتہ نہیں کیسی ہنسی تھی وہ اور کیوں آئی تھی؟ مجھے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

کچھ دیر میں ذہنی انتشار اور وحشت میں کمی ہوئی تو میں نے ذرا سکون اور اعتماد کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔ جو تجربہ ہوا تھا، اسے اپنے تصور میں دوبارہ دیکھنے کی کوشش کی۔ دروازے کی چرچراہٹ، آہٹ اور ایک غیر مرئی انسانی ہیولہ..... مگر میرا ذہن متاثر تھا۔ یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ میں واقعی کسی آسیب۔ ر موجودگی سے دوچار ہوا تھا۔ دہم بھی ہو سکتا ہے۔ مکان کے بارے میں کئی کہانیاں سنی ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا ذہن ان سے پہلے ہی متاثر ہوا اور لاشعوری طور پر کسی بھوت کو دیکھنے کا خواہش مند ہو..... ہاں، یہی بات ہو

سکتی ہے۔ کسی آسیب کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دروازہ ہوا سے چرچرایا ہوگا۔ آہٹ میرے وہم نے سنی اور انسانی ہیولہ میرے متاثر ذہن نے تراشا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ مجھے خواہ مخواہ پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے طے کیا۔

اگلے دو ہفتوں میں ایسے تجربات دو بار ہوئے۔ ایک بار لیمپ دو مرتبہ خود بجھا اور دوسری بار کوٹھڑی کا دروازہ آپ سے آپ کھل گیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ دروازہ نہ صرف میں نے بند کیا تھا بلکہ کنڈی بھی لگا دی تھی۔ دونوں ہی موقعوں پر مجھے آہٹ سننے کا گمان بھی گزرا اور اس کی موجودگی کا احساس بھی ہوا۔ اور دونوں ہی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ کوٹھڑی سے نکلا اور صحن سے گزر کر اوپر چلا گیا۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اوپر گیا ہے۔

ان تجربات کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ مکان میں واقعی کوئی بدروح موجود ہے۔ کچھ تو اس بناء پر کہ میں بھوت پریت کا قائل نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب آدمی مرتا ہے تو اس کا جسم مٹی میں مل کر ختم ہو جاتا ہے اور روح آسمانوں پر چلی جاتی ہے۔ بھوت پریت، چڑیل، ارواحِ خبیثہ، یہ سب بیمار، کمزور اور توہم پرست ذہنوں کی اختراع ہیں۔ ایک وہم زدہ ذہن اندھیرے میں طرح طرح کی اشکال اور اشیاء دیکھتا ہے۔ نہ صرف بھوت پریت بلکہ جن، پری اور دیوبھی۔ جبکہ ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ لیمپ کا بجھنا، کنڈی کا گرنا اور دروازے کی چرچراہٹ یا تو اتفاق تھا یا ہوا کی کارستانی۔ اور انسانی پیکر میرے پرانگندہ اور متاثرہ ذہن نے تراشا تھا۔ دوسرے اس بناء پر کہ اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تھا، تو بے ضرر تھا۔ محض ایک غیر مرئی ہیولہ۔ بے وزن، غیر مادی۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ وہ کوٹھڑی سے نکلتا تھا اور اوپر چلا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ چونکہ مکان خالی اور ویرانی پڑا ہے اس بناء پر وہ اس میں بسیرا کرتا ہے۔ مکان آباد ہوگا تو خود ہی چلا جائے گا۔

جس شام کنڈی گرنے اور دروازہ کھلنے کا واقعہ پیش آیا، میں صحن میں بیٹھا تھا۔ چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھا۔ کانوں میں چرچراہٹ کی آواز آئی تو نظر خود بخود کمرے میں چلی گئی۔ پھر میں اٹھا اور بے آواز قدموں سے چل کر کچن میں داخل ہوا۔ یہ عمل غیر ارادی تھا۔ میری نگاہ دروازے پر جمی ہوئی تھی۔ محسوس ہوا کہ وہ، اگر تھا تو، اسٹور روم سے برآمد ہوا اور چند لمحوں کے لئے کمرے کے وسط میں ٹھہرا، پھر صحن کی طرف بڑھ گیا۔ گو میں اسے

دیکھ نہیں سکتا تھا، پھر بھی میری نظر اس کا تعاقب کرتی رہی۔

جب وہ چلا گیا اور مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ کمرے میں اب کوئی نہیں ہے تو میں آگے بڑھا اور دروازے کا جائزہ لیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں نے دروازہ بند کیا تھا اور کنڈی بھی لگائی تھی۔ پھر کنڈی کیسے گری اور دروازہ کیسے کھلا؟

میں نے آگے بڑھ کر جائزہ لیا۔ کنڈی ذرا ڈھیلی ہے۔ کبھی جمبی کواڑ ہلے تو خود بخود گر جاتی ہے۔ پھر نگاہ در پیچے کے کھلے پٹ کی طرف گئی اور میرے ذہن میں خیال ابھرا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہوا کا جھونکا آیا ہو اور کنڈی گر گئی ہو؟

وہ رات کافی بے چینی میں گزری۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کیا اور معمول کے مطابق تیار ہو کر ساڑھے آٹھ بجے دفتر کے لئے گھر سے نکلا۔ بس اسٹاپ چوراہے سے ذرا آگے تھا۔ جب میں اسٹاپ پر پہنچا تو توجہ میں چالیس افراد کے ایک ہجوم نے کھینچی جو قریبی گلی میں موجود تھا۔ بس اسٹاپ پر جو افراد بس کے انتظار میں کھڑے تھے، ان کی توجہ بھی ہجوم ہی کی جانب تھی۔ میں نے یوں ہی روروی میں ایک بارلش بزرگ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے محترم؟ یہ لوگ گلی میں کیوں جمع ہیں؟“

بزرگ نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر تلخ لہجے میں بولے۔ ”لاشیں ملی ہیں

بھی۔“

”لاشیں.....؟“ میں نے شپٹا کر کہا۔

”ہاں..... دو لاشیں ہیں۔ بوروں میں بند تھیں۔ دونوں کو گولی ماری گئی تھی۔“

بزرگ نے یہ بات اس طرح کہی جیسے خود کلامی کر رہے ہوں۔ ”کیا وقت آ گیا ہے۔ نہ خوف خدا، نہ آدمیت کا احترام۔ آدمی جانور بنتا جا رہا ہے۔ کسی بات کا کوئی احترام نہیں رہا۔ پہلے کہیں ہفتوں میں ایسا کوئی سانحہ ہو جاتا تھا۔ اب لاشیں روزانہ بوروں اور کوڑے کے ڈرموں میں ملنے لگی ہیں۔ آدمی اور کیڑے کوڑے میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ اگر یہی حالت رہی تو.....“

برگ بڑبڑاتے رہے۔ میں غیر ارادی طور پر ہجوم کی طرف بڑھ گیا۔

چہ میگوئیاں کرتے لوگوں کے درمیان سے راستہ بنا کر میں آگے بڑھا اور بوروں سے برآمد ہونے والی لاشوں پر نظر ڈالی۔ دو پولیس افسر لاشوں کے پاس تھے اور حسب عادت ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں لوگوں سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ میں نے ذرا غور سے دونوں لاشوں کو دیکھا۔ ایک لاش ایک ادھیز عمر آدمی کی تھی، جبکہ دوسری ایک نوجوان لڑکے کی تھی۔ اس کی عمر بیس سال سے کم لگتی تھی۔ ان دونوں کے کپڑوں پر پھیلا ہوا خون خشک

ہو کر سیاہ پڑنے لگا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں مرے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔ غالباً چوبیس گھنٹے سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ فضا میں ایک تیز اور حد درجہ ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جو یقینی طور پر لاشوں سے اُٹھ رہی تھی۔

میں نے رومال جیب سے نکال کر ناک پر رکھا اور افسردہ نظروں سے نوجوان لڑکے کا چہرہ دیکھا۔ گودہ چہرہ اخراج خون اور موت کے باعث مرجھا کر زرد، بے رونق اور ڈراؤنا ہو گیا تھا مگر ناک نقشے اور قد کاٹھ سے عیاں تھا کہ بڑا وجیہ، خوش شکل اور جاذب نظر رہا ہو گا۔ جدھر سے گزرتا ہو گا لڑکیاں پلٹ کر دوسری بار دیکھنے اور اس کی وجاہت پر دل و جان تار کرنے کی آرزو کرتی ہوں گی۔ مگر وہ وجاہت اب مر چکی تھی۔ حالانکہ ابھی اس کی پوری عمر باقی تھی۔ ابھی یقیناً اُسے بہت کچھ کرنا تھا۔ کسی سے محبت کرنی تھی اور گھر بسانا تھا اور بچے پالنے تھے اور بوڑھی ماں کی خدمت کرنی تھی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب نہ وہ کسی سے محبت کرے گا، نہ گھر بنائے گا اور نہ اپنی محبت کرنے والی ماں کی خدمت کرے گا۔ کیونکہ اس کے جسم میں گولیوں کے پانچ نشان ہیں اور اس کی لاش ٹاٹ کے بورے سے برآمد ہوئی ہے.....!

میری توجہ خود بخود قریب کھڑے ایک مدقوق سے آدمی کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ”سب سے پہلے عبداللہ بھائی نے دیکھا تھا۔ بدبو کی وجہ سے انہیں کچھ شک ہوا۔ چنانچہ انہوں نے شاکر بھائی کو اور مجھے آواز دے کر بلایا۔ پھر ہم لوگ پولیس کو بلا لائے۔“

”کون ہیں یہ لوگ؟ کیا اسی علاقے کے ہیں؟“ اس کے ساتھی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ مدقوق آدمی نے کہا۔ ”ہم نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”شاید رات میں کسی وقت یہاں لاشیں رکھی گئی ہوں گی۔“

”ہاں۔“

”کسی نے دیکھا نہیں تھا؟“

”کیا بات کرتے ہو یا! اگر دیکھا ہوتا تو کیا وہ حرامی یہاں سے بھاگ کر جانے پاتے جنہوں نے بورے رکھے تھے۔ سالوں کے ٹکڑے نہ کر دیتے۔“ مدقوق آدمی نے ذرا غصے سے کہا۔

”یا! بڑی افسوس ناک بات ہے۔“ دوسرے آدمی نے رنج سے کہا۔ ”جانے بیچارے

کون ہیں یہ دونوں؟“

مدقوق آدمی نے ٹھنڈی سانس لی اور سر ہلایا۔

میں یکا یک مڑا اور ایک عالم وحشت میں تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔

اُس دن دفتر میں قطعاً دل نہ لگا۔ گزشتہ شام کا واقعہ، پھر دونوں لاشیں۔ میں نے خود کو فائلوں میں مصروف کرنے کی کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔ پھر اخبار اٹھایا تو دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ پورا اخبار دل آزار خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ قتل، اغواء، چوری، ڈکیتی، زنا اور جانے کیا کیا۔ گوان دونوں لاشوں کا ذکر کہیں نہیں تھا جو صبح میں نے دیکھی تھیں کیونکہ اخبار والوں کو ابھی ان کا علم نہیں ہوا ہوگا۔ مگر دیگر چار لاشوں کا ذکر موجود تھا جو شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دن قتل پائی گئی تھیں۔ ایک لاش یورے میں ملی تھی، ایک کوڑے کے ڈرم میں، ایک لاش ایک زیر تعمیر عمارت میں پائی گئی تھی۔ جبکہ چوتھی لاش جس کا سر کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا، ایک نالے کے کنارے جھاڑیوں میں ملی تھی۔

ان لاشوں کے علاوہ دو وارداتیں اغواء کی ہوئی تھیں۔ تین کاریں اور چار موٹر سائیکلیں چھین لی گئی تھیں۔ ایک بڑے تاجر کے بنگلے پر ڈاکہ پڑا تھا اور ڈکیت نقد رقم کے علاوہ زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء لوٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

شہ سرخی کے ساتھ ایک بڑے وزیر کا بیان بھی چھپا تھا۔ ”مجرموں اور تخریب کاروں کو اب مزید من مانی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“ گویا سارے جرائم اب تک اس کم بخت کی اجازت سے کئے گئے تھے۔

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور افسردہ نظروں سے پہلے صفحے کی چھوٹی بڑی سرخیوں کو دیکھتا رہا جو زہریلے کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ کیا ضرورت ہے اخبار پڑھنے کی؟ کیا حاصل ہے؟ محض تصنع اوقات اور کچھ نہیں۔ زندگی میں آزار کی پہلے ہی کوئی کمی نہیں۔ مہنگائی، چور بازاری، ملاوٹ، رشوت، غبن، بے مروتی، زر پرستی اور نہ جانے کیا کیا۔ کیا ضرورت ہے کہ اخبار پڑھ کر دکھوں میں اور اضافہ کیا جائے۔ سنتے ہیں، پہلے کوئی زمانہ تھا جب صبح طلوع ہوتی تھی تو فرحت اور تازگی لے کر آتی تھی۔ اب اپنے دامن میں خوف، بے یقینی اور رنج لے کر آتی ہے۔ اخبار پڑھنے سے بہتر ہے کہ آدمی کامک پڑھ لیا کرے۔ کم از کم اس کا دل تو نہیں دکھے گا۔

میں خاموش بیٹھا تھا کہ صدیق میری میز پر آ گیا۔ ”کیا بات ہے بھئی..... آج بہت اُداس ہو؟“

”ہاں یار!“ میں نے پڑمردگی سے کہا۔ ”آج صبح صبح دو لاشیں دیکھی ہیں۔ تب سے دل خراب ہو رہا ہے۔“

”اچھا.....کہاں؟“

میں نے پوری بات بتائی پھر کہا۔ ”اور یہ اخبار بھی دیکھو۔ لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔“
صدیق ہنس کر بولا۔

”چھوڑو بھی یار! کیا فضول کی بات لے کر بیٹھ گئے ہو۔ ارے میاں! یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ دو چار افراد مار دیئے گئے، ایک آدھ ڈاکہ پڑ گیا، چند کاریں چھن گئیں تو کیا؟ کون سی قیامت آگئی۔ یہ تو روز کی بات ہے۔ تم خواہ مخواہ منہ لٹکا کر بیٹھ گئے ہو۔“
”مگر یار! وہ انسان تھے۔“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی.....؟“ صدیق طنز یہ انداز میں ہنسا۔

میں نے جلتی ہوئی نظروں سے اسے گھورا۔ ”صدیق! مجھے تعجب ہے کہ تم ایسی بات کہہ رہے ہو۔ یار! وہ لوگ بھی انسان تھے لیکن بے گناہ مار دیئے گئے۔ ان کی لاشیں بوروں اور کوڑے کے ڈھیر میں ملی ہیں۔ سر بریدہ اور برہنہ۔ اور تم ہنس رہے ہو۔ کیا معصوم انسانوں کا مرنا محض ایک لطیفہ ہے کہ اس پر ہنسا جائے؟“
صدیق کا ایک سنجیدہ ہو گیا۔

”نہیں..... لطیفہ نہیں ہے، ماتم ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے، کم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہو گا کیا؟ تم رنج کرو گے، میں آنسو بہاؤں گا۔ مگر ہو گا کچھ نہیں۔ یہ نفسا نفسی یونہی چلتی رہے گی۔ کیونکہ وہ لوگ جو سب کچھ کر سکتے ہیں، وہ اپنے آراستہ ایوانوں میں بیٹھے شطرنج کے کھیل میں مصروف ہیں۔ میرا گھوڑا مر گیا ہے، میں اس کا فیل ماروں گا۔ ہمارے تمہارے بین کی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ اسی لئے میں ہنستا ہوں۔ کیونکہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ماتم کا یہ میرا اپنا انداز ہے۔ میں اپنے آپ پر ہنستا ہوں۔ اپنے صبح و شام پر ہنستا ہوں اور اس خوف پر ہنستا ہوں جو میرے دل میں ہر پل جاگزیں رہتا ہے۔ یہ ہنسی دراصل خود فریبی ہے۔ اور ایسی ہنسی بجائے خود ایک ماتم ہوتا ہے۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔



اس واقعے کے چوتھے دن میرے علاقے میں گولی چل گئی۔
سب کیا تھا؟ پہل کس نے کی تھی؟ اس ضمن میں کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔
جتنے منہ اتنی باتیں۔ البتہ ایک بات طے تھی کہ کچھ لوگ باہر سے آئے تھے اور ان کا تعلق

ایک خاص گروہ یا پارٹی سے تھا۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ پستول اور رائفلیں۔ ممکن ہے پٹرول بم بھی رہے ہوں۔ میرے علاقے میں رہنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد کو اس جماعت سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں جس سے حملہ آوروں کا تعلق تھا۔ اور غالباً باہر سے آنے والوں کا مقصد ایسے ہی لوگوں کو ”سزا“ دینا تھا۔ مگر انہوں نے بلا تفریق گولی چلا دی۔ جواب میں علاقے کے لوگوں نے بھی فائرنگ کی اور پٹرول بم پھینکے۔ دس پندرہ منٹ کے مختصر وقفے میں سات جانیں تلف ہوئیں جن میں دو بچے بھی شامل تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بیس کے قریب بتائی گئی۔

پولیس نے ”حسب معمول“ نہایت ”مستعدی“ کا مظاہرہ کیا اور اس وقت موقع پر پہنچی جب حملہ آور وہاں سے جا چکے تھے۔ پولیس نے زخمیوں کو فوراً طبی امداد مہیا کرنے کی بجائے کاغذی کارروائی پر زیادہ توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زخمی فٹ پاتھ پر ہی مر گیا۔ پھر پولیس نے بازار کی مکمل ناکہ بندی کر دی اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ لوگ حراست میں لئے گئے جن میں دو چار ہی ایسے تھے جو واقعی فائرنگ میں ملوث تھے۔ حملے کے فوراً بعد ساری دکانیں اور چائے خانے بند ہو گئے تھے اور بازاروں میں ہر طرف موت کی دیرانی مسلط ہو گئی تھی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ میں سہ پہر کے وقت کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ (کیونکہ میرے پاس کوئی کامک نہیں تھا) تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے زیر کھڑا تھا۔ میں نے تعجب سے کہا۔

”ارے یار!..... تم کب آئے؟“

”آج صبح ہی آیا ہوں۔“ زیر نے جواب دیا۔

”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”سب خیریت تو ہے؟ بچے اور بھائی ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا؟ اور تمہاری اماں کیسی ہیں؟ کیا وہ بھی آئی ہیں؟“

”نہیں..... وہ فی الحال وہیں رہیں گی۔“ زیر نے جواب دیا۔ ”ان کا دل وہاں اپنے آبائی گھر میں زیادہ لگتا ہے۔“

”اچھا یار! تم بیٹھو۔ میں چائے بناتا ہوں۔“

میں چائے بنا کر لایا تو زیر اخبار پڑھ رہا تھا۔ کپ ہاتھ میں لے کر اس نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ پھر سڑپ کی آواز کے ساتھ ایک چسکی لے کر بولا۔

”یار! کل تو یہاں بڑا ہنگامہ ہوا۔“

”ہاں یار!“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن ہنگامہ کا ہے کو، خونریزی کہو۔ سات افراد

مارے گئے۔ کئی زخمی ہوئے۔ اور مجھے پتہ چلا ہے کہ دو تین زخمیوں کی حالت نازک ہے۔ شاید ہی بچ سکیں۔“

”اللہ اپنا رحم کرے۔“ زبیر نے کہا۔ ”سنا ہے دو گروہوں میں تصادم ہوا تھا۔“
 ”ہاں..... کچھ ایسی ہی بات تھی۔“ میں نے چسکی لی۔ ”جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے مطابق ایک خاص جماعت سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد باہر سے آئے تھے اور ان کا مقصد ایک مخالف جماعت سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں کو نشانہ بنانا تھا۔ مگر انہوں نے بلا تفریق و تمیز گولی چلا دی۔ جواب میں ادھر کے لوگوں نے بھی فائرنگ کی۔ سننے میں آیا ہے کہ کوئی دس پندرہ منٹ خونریزی کا بازار گرم رہا، پھر حملہ آور فرار ہو گئے۔“ میں نے رک کر سانس لی۔ ”یار! مرنے والوں میں ایک سات سال کا بچہ بھی شامل تھا۔“
 ”یار! بڑا افسوس ہوا۔“ زبیر نے سگریٹ جلائی۔ ”مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر تھی۔ اس لئے فرصت ملنے ہی بھاگ کر ادھر آیا۔“

میں نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میں تو آفس میں تھا۔ شام کو آیا تو پورے واقعے کا علم ہوا۔“

”بس اللہ ہی کرم کرنے والا ہے۔“ زبیر نے زور سے سانس لی، پھر قدرے وقفہ دے کر بولا۔ ”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ مکان کے بارے میں تمہاری کیا رپورٹ ہے؟ کیا کسی بھوت سے ملاقات ہوئی؟“
 ”نہیں۔“

زبیر چونک کر بولا۔ ”یعنی تمہارا مطلب ہے کہ وہ کہانی بے بنیاد تھی۔ مکان میں کوئی آسیب نہیں ہے؟“

”یار.....!“ میں نے ذرا الجھ کر کہا۔ ”بات اس طرح نہیں ہے۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے میرا وہم ہی ہو۔ لیکن گزشتہ چوبیس پچیس دنوں میں کم از کم تین بار مجھے مکان میں کسی نادیدہ ہستی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی ہیولہ کمرے میں موجود ہے۔ وہ نظر بالکل نہیں آتا۔ نہ ہی کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ بس محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی سایہ ہے۔ وہ اس سامنے والی کوٹھڑی سے برآمد ہوتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔ اس لئے میں ابھن میں پڑ گیا ہوں۔ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مکان میں واقعی آسیب ہے یا نہیں۔“

”کیا واقعی؟“ زبیر سنسنیل کر بیٹھ گیا اور تجسس آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔
 میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ”لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے آوازیں سنی تھیں،

سائے چلتے پھرتے دیکھے تھے اور دوسری محیر العقول سرگرمیاں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس تو ضرور ہوا مگر شک و شبہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے وہم ہی ہو۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ میرا ذہن سنی سنائی باتوں سے متاثر ہو اور اسی بناء پر مجھے کسی سائے یا ہیولے کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ فرض کرو، مکان میں کوئی سایہ ہے، تو بھی میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی اہم بات نہیں ہے۔ جب مکان آباد ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ وہ چلا جائے گا۔“

”یار! میں سمجھا نہیں؟“ زیر نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ مکان بے ضرر ہے اور تشویش کی کوئی بات نہیں ہے؟“

”ہاں..... میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔“

زیر تھوڑی دیر چپ رہا اور حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ جلائی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”تو گویا تم مطمئن ہو؟“

”ہاں۔“

”تو پھر کیا خیال ہے؟..... کب تک اماں کو بلا رہے ہو؟“

”ابھی نہیں۔“ میں نے بھی ایک سگریٹ سلگائی۔ ”سردست میرا انہیں بلانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”کیوں.....؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”میں آسیب سے ڈرتا ہوں یار!“

زیر نے الجھ کر مجھے گھورا۔

”یار! کمال ہے۔ عجیب بات کرتے ہو تم۔ ابھی کہہ رہے تھے کہ مکان محفوظ اور بے ضرر ہے۔ اور اب کہہ رہے ہو کہ آسیب سے ڈرتے ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ اگر یہ مکان پسند نہیں تو دوسرا ڈھونڈ لیتے ہیں۔“

میں نے گہری نظروں سے زیر کو دیکھا، پھر اٹھ کر دریتچے تک گیا اور پردہ سر کا کر باہر جھانکا۔ سڑک اور چوراہا صاف نظر آرہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں اور کہیں کہیں اکا دکا افراد آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر گزشتہ دن کے سانحے کی بناء پر چہل پہل اور رونق بالکل نہیں تھی۔ ایک نحوست، ویرانی اور سوگواریت فضا میں کھلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شے خوفزدہ اور سہمی ہوئی ہے۔ میں نے پلٹ کر زیر کی طرف دیکھا۔

”میں مکان کی بات نہیں کر رہا۔“ آخر کار میں نے افسردہ آواز میں کہا۔ ”میں باہر کی بات کر رہا ہوں۔ آسیب تو باہر ہے..... سڑکوں پر اور گلیوں میں..... نٹ پر، ہر کونے میں

اور ہر مکان کی چوکھٹ پر..... اور گھات لگائے بیٹھا ہے کہ کب موقع ملے اور وہ اپنی
 لپپاتی خون آلود زبان سے انسانی زندگیوں کو چاٹ لے۔ زیر! مکان میں اگر آسیب ہے
 بھی تو وہ بے ضرر ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ مگر باہر کا آسیب خون آشام ہے اور ہر گھر
 میں اور ہر آنگن میں اپنا منحوس سایہ پھیلانے ہوئے ہے۔“ میں نے رُک کر سانس لی۔
 ”اور اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ ابھی اماں کو نہیں بلاؤں گا۔“
 پھر میں چپ ہو گیا۔ زیر حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔



پاکستانی
 ڈاٹ کام

اگر

جب کار روانہ ہوئی تو سہ پہر شروع ہو رہی تھی۔ موسم خلاف توقع بہت اچھا تھا۔ آسمان صاف تھا اور ہر طرف چمکتی چمکتی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور فضا خاصی گرم تھی۔ رام گاڑی چلا رہا تھا۔ سیتا اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی جبکہ ملتا دیوی، شیاام اور گیتا پچھلی سیٹ پر براجمان تھیں۔ گیتا تین سال کی تھی جبکہ شیاام کا چھٹا سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں عادت کے مطابق آپس میں لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ وجہ وہی تھی، جس پر وہ دونوں اکثر جھگڑتے تھے یعنی سپر مین اور بیٹ مین میں سے کون زیادہ طاقت ور ہے۔ گیتا بیٹ مین کی فین تھی جبکہ شیاام کا ہیرو سپر مین تھا۔

گیتا پُر جوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”بیٹ مین، سپر مین کو مار سکتا ہے۔“
 ”نو چانس۔“ شیاام نے بھی اسی جوش اور یقین سے کہا۔ ”سپر مین بہت اسٹرانگ ہے۔ وہ بیٹ مین کو کل Kill کر سکتا ہے۔“

ملتا دیوی افسردگی سے مسکرائیں۔ جانے آج کل کے بچے قتل، خون اور ہتھیاروں کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ شیاام کے پاس جو کھلونے تھے ان میں بندوقیں، پستول اور ٹینک وغیرہ شامل تھے۔ یہی حال گیتا کا تھا۔ پولیس کار، رائفل، بیٹ مین اور نہ جانے کیا کیا۔ دونوں کبھی کبھی لان میں باقاعدہ جنگ کا کھیل کھیلتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھر بناتے تھے، پھر گھروں اور رائفلوں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے تھے، ڈز..... ڈز..... ڈز..... پھر کھیل میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے مرنے کا سواگ بھی رچاتے تھے۔

”میری گولی تمہیں لگ گئی ہے۔ تم مر جاؤ۔“

”اچھا.....“ گیتا کہتی۔ ”مگر اگلی بار تم مرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

گیتا آنکھیں بند کر کے گھاس پر اونڈھی لیٹ کر مر جاتی۔

یہ موت اور ہتھیار اور گھروں پر حملہ..... یہ سب کیا ہے؟ کیسے کھلونے اور کھیل ہیں

.....؟ ملکا دیوی کو تعجب ہوتا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ ڈر بھی لگتا تھا۔ وہ بھی تو بچی تھیں۔ گویا اس بات کو مدت بیت گئی مگر جب ان کا بچپن تھا تو وہ گڑیوں سے کھلتی تھیں، ہنڈکھیاں پکاتی تھیں اور گڑیوں کا بیاہ رچاتی تھیں اور گھروندے بناتی تھیں۔ مگر آج کل کے بچے گھروندے نہیں بناتے، گھر توڑتے ہیں اور بندوقس چلاتے ہیں۔ ڈز..... ڈز.....

دونوں کے لڑنے جھگڑنے کی آواز ذرا بلند ہوئی تو رام نے انہیں ڈانٹا۔
 ”شیام! گیتا! شور مت کرو..... داوی کو آرام کرنے دو۔“ پھر اُس نے ملکا دیوی سے کہا۔ ”اماں! تم آرام سے تو ہونا۔“
 ”ہاں بیٹا! تم فکر نہ کرو۔“

”سیتا! تم نے اماں کی دوائیں تو رکھ لی ہیں نا؟“ اس نے سیتا سے پوچھا۔
 ”ہاں..... میں نے سب چیزیں رکھ لی ہیں۔ دوائیں، مالا، رام جی کی مورتی اور رامائن۔“ سیتا نے جواب دیا۔ ”بس ایک چیز رہ گئی ہے۔“
 ”کیا؟“

”پتلی کی تصویر۔“ سیتا نے جواب میں کہا۔ ”شیام نے اس کا شیشہ توڑ دیا تھا نا۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ تصویر بعد میں آجائے گی۔“

چند لمحے بعد ملکا دیوی نے پوچھا۔ ”رام! کتنی دیر میں پہنچیں گے وہاں؟“
 ”اماں! ذرا دور رہے۔ میرا خیال ہے آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔“ رام نے راؤنڈ اباؤٹ پر سرخ بتی دیکھ کر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

ملکا دیوی نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر ارادہ بدل دیا۔ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی اور خالی خالی نظروں سے باہر دیکھا۔ کاراب راؤنڈ اباؤٹ کر اس کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور کشادہ سڑک پر ہموار رفتار سے رواں تھی۔ سڑک کے ایک جانب چھوٹے چھوٹے درختوں کی طویل قطار تھی۔ درختوں کے عقب میں دور تک سبزے سے ڈھکا میدان تھا جس میں کہیں کہیں اکا دکا پیڑ اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے جبکہ دوسری جانب سرخ اینٹوں والے خوبصورت مکانات تھے، قطار اندر قطار، اور سنہری دھوپ میں وہ مکان کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

ملکا دیوی ایک حیرت آمیز دلچسپی سے ان مکانوں کو دیکھتی رہیں۔ مکان، گھر، چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر جن میں چھوٹے چھوٹے لوگ، چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی زندگیاں جیتے ہیں۔ گھر..... ملکا دیوی کے لئے گھر ہمیشہ ایک خواب

کی مانند رہا تھا۔ اور ان کا سارا جیون اور جیون کا ایک ایک پل اس خواب کی تعبیر کی جستجو میں گزر گیا تھا۔ جب تک بچپن تھا، تب تک احساس نہیں تھا کہ اپنے گھر اور کرائے کے مکان میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ان کے پتا کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے، کچیریل کی چھت، مختصر سامن اور چھوٹا سا آنگن، دروازے پر پھٹا ہوا ٹاٹ کا پردہ جھولتا رہتا۔ مکان کی حالت اور ان کے پتا کی مالی حالت میں برائے نام فرق بھی نہیں تھا کہ دونوں ہی خستہ تھیں۔

مکتا دیوی کی عمر کوئی گیارہ بارہ سال تھی جب پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ جس گھر میں وہ رہتی ہیں وہ ان کا نہیں، پرایا ہے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ گھر اپنا نہ ہو تو آدمی کتنا بے وقعت ہوتا ہے اور یہ احساس اس بناء پر ہوا کیونکہ ایک دن انہوں نے مالک مکان چوبے لال کو اپنے پتا پر ناراض ہوتے دیکھا اور سنا۔ کئی ماہ سے کرایہ ادا نہیں ہوا تھا۔ چوبے لال پتلا ہو رہا تھا اور ان کے پتا جی خوشامد کر رہے تھے۔

”اگر آپ نے کرایہ جلدی ادا نہیں کیا تو سامان اٹھا کر پھکوا دوں گا۔“

”نہیں چوبے لال جی! ایسا نہ کہیں..... میں جلد ہی کوئی بندوبست کروں گا۔“

اطمینان رکھیں۔“

مکتا دیوی کے دل میں دراڑ پڑ گئی۔ وہ مکان جو ہمیشہ انہیں اپنا سا لگتا تھا، جانا پہچانا، اب غیر محسوس ہونے لگا۔ من میں ایک آرزو ابھری۔ اپنے گھر کی آرزو..... ایک ایسا گھر ہونا چاہئے جس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک کیل اپنی ہو۔ اور کبھی ایسا نہ ہو کہ کوئی چوبے لال سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کی دھمکی دے۔ ان کے پتا کیدار ناتھ کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ ”اپنا“ گھر بنا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں اپنے گھر کی آرزو پختہ ہوتی چلی گئی۔ شادی ہوئی، وہ انگلستان پہنچیں۔ اپنے گھر کا خواب پھر بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ ان کے پتی گھنشیام بھی ایک سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ایک فیکٹری میں ایبر جاب کرتے تھے۔ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی کی کفالت کی ذمہ داری بھی ان کے سر تھی۔ آمدنی کا ایک حصہ ہر ماہ نکل جاتا تھا۔ کونسل کے فلیٹ میں رہائش تھی۔ کرائے کی ادائیگی اور دیگر اخراجات کے بعد اتنا بچتا ہی نہ تھا کہ گھنشیام جی مکان خریدنے کے بارے میں سوچ بھی سکتے۔ مکتا دیوی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ گھنشیام جی انگلستان میں رہتے ہیں، ان کے مالی حالات یقیناً بہتر ہوں گے لہذا انہیں مکان مل جائے گا۔ اپنا مکان۔ ذاتی۔ جس کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک کیل ان کی اپنی ہوگی۔ لیکن یہ آرزو تشنہ ہی رہی۔

آدی پیاسا ہو اور پانی نہ ملے تو پیاس اور بڑھتی ہے۔ منزل نظروں سے اوجھل ہو تو منزل تک پہنچنے کی تڑپ میں اور بھی شدت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال مکتا دیوی کا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرا اور اپنے گھر کا خواب پورا ہوتا نظر نہ آیا، ویسے ویسے ان کی خواہش بڑھتی گئی۔ کچھ بھی ہو، ایک دن وہ اپنا گھر ضرور بنائیں گی۔ گھنشیام جی ایک صابر اور قانع آدمی ہیں۔ ان کی خواہشات محدود ہیں۔ جو کچھ اور جتنا کچھ میسر ہے، اس میں خوش رہتے ہیں۔ لیکن وہ اس صورت حال کو بدل دیں گی۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھائیں گی۔ ان کے دل میں اُمنگ پیدا کریں گی اور ان کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر جدوجہد کریں گی۔ اور ایک دن..... ہاں، ایک دن اپنا سپنا ضرور پورا کریں گی۔

اپنا گھر.....!

گھنشیام جی نے ایک بار خود بھی کہا تھا۔

”مکان کی خواہش تو میری بھی ہے۔ سر پر اپنی چھت ہو تو آدمی کو تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ میرے حالات نے اب تک اجازت نہ دی۔ مگر اب تم آگئی ہو تو دونوں مل کر کوشش کریں گے اور بچوں کے لئے ایک گھر بنائیں گے۔“

مگر ابھی رام اور رادھا چھوٹے ہی تھے کہ گھنشیام جی مکتا دیوی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بیماری بظاہر معمولی سی تھی مگر جان لیوا ثابت ہوئی۔ بستر مرگ پر آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہوں نے آبدیدہ ہو کر مکتا دیوی سے کہا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا..... میں تمہیں کوئی شکھ نہ دے سکا۔“

پتی کا خیال آیا تو مکتا دیوی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو کر بیٹے دنوں کے جنگل میں گم ہو گئیں۔



کاراب ایک ایسی سڑک پر چل رہی تھی جس پر دورویہ گھنے درخت تھے۔ ان کا چھدرا سایہ کسی تجریدی تصویر کی طرح سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ دائیں جانب قدرے اونچائی پر مکانوں کی قطاریں تھیں جن کے بیرونی باغیچوں میں گلاب، ڈھلیا اور فوشیا اور دوسرے پودے لگے تھے۔ مکتا دیوی نے ذرا حسرت سے ان چھوٹے چھوٹے باغیچوں کو دیکھا۔ انہیں پھول پھولاری کا بھی بہت شوق تھا۔ کونسل کے فلیٹ میں کوئی عقبی باغیچہ نہیں تھا جس میں پھول پودے لگائے جاسکتے۔ صرف ایک چھوٹی سی پختہ بالکنی تھی۔ مکتا دیوی اس بالکنی میں چند گلے رکھ کر اپنا شوق کسی حد تک پورا کر لیا کرتی تھیں لیکن سوچتی رہتی تھیں کہ جب بھی مکان لیں گی تو اس بات کا خیال رکھیں گی کہ مکان میں کشادہ پائیں باغ ضرور ہوتا کہ

وہ ایک خوبصورت باغیچہ بنائیں۔ اور اس میں ڈھیر سارے زرد گلاب لگائیں۔ انہیں زرد گلاب بہت پسند تھے۔ مگر یہ آرزو بھی تکمیل ہی رہی۔
 یکایک ان کی توجہ رام کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اماں! تم نے موسیٰ کو چٹھی لکھ دی ہے؟“

”ہاں..... کل ہی تو لکھی تھی۔“ انہوں نے مدہم آواز میں جواب دیا۔
 ”انہیں اس بارے میں تو کچھ نہیں لکھا ہے نا؟“ اُس نے اس پر بطور خاص زور دیا۔
 ”نہیں۔“ مکتا دیوی نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”اور کبھی لکھنا بھی نہیں۔“ رام نے مزید کہا۔ ”خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے وہ لوگ۔“
 مکتا دیوی چپ رہیں۔

سیتا نے اپنے شانوں تک آتے ہوئے بالوں کو ہولے سے جھکا دیا۔ ”اب اُن لوگوں کو یہاں کے حالات اور مسائل کے بارے میں کچھ معلوم تو ہے نہیں۔ وہ ان سب باتوں کو اپنی نظر سے دیکھیں گے اور یہودہ باتیں کریں گے۔ انہیں تو سمجھایا بھی نہیں جاسکتا۔“
 ”ہاں..... یہ تو ہے۔“ رام نے بیک دیو مرمر میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور اماں! تم نے چاچی کو بھی چٹھی لکھی تھی؟“
 ”ہاں۔“

”تم نے روپے کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے؟“
 ”ہاں۔“

”وہ شاید برا تو مانیں گی۔ مگر کیا، کیا جائے؟ جتنا روپیہ انہوں نے مانگا تھا، اتنا بھیجنا تو ممکن نہیں تھا۔ اس لئے کم بھیجا ہے۔ تم نے لکھ تو دیا ہے نا، کہ ابھی گنجائش نہیں۔“
 ”ہاں، لکھ دیا ہے۔“ مکتا دیوی نے مدہم آواز میں کہا۔

سیتا نے ایک بار پھر اپنے سیاہ چمکیلے بالوں کو جھکا دیا۔ ”یہ تو واقعی بڑی مصیبت ہے۔ ہاں والے تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہاں نوٹوں کے پیڑ لگے ہیں۔ جب ہمیں ضرورت پڑتی ہے، توڑ لیتے ہیں۔“ اُس کا لہجہ کچھ اور خشک اور تیکھا ہو گیا۔ ”اب انہیں کون سمجھائے کہ یہاں ہمارے سر پر بھی دس طرح کے خرچے ہیں۔ اوپر سے بچوں کی ذمہ داری۔ اب اتنا کہاں سے لائیں کہ ان کی آئے دن کی مانگیں پوری کریں۔ لیکن انہیں ان باتوں سے کیا غرض۔ کبھی موسیٰ نے مطالبہ کر دیا، کبھی چاچی نے، کبھی اس نے، کبھی اُس نے۔ میں تو کبھی بھی تنگ آ جاتی ہوں۔“

مکتا دیوی نے سیتا کے ترشے ہوئے جدید فیشن کے بالوں، گردن میں چمکیلے طلائی ہار

اور کانوں میں جھولتے ہیروں کے ٹاپس کو دیکھا اور افسردگی سے مسکرائیں۔

پھر انہوں نے کھڑکی سے باہر نظریں جمادیں۔ کاراب ایک موڑ پر گھوم رہی تھی۔ کونے والے مکان کا بیرونی باغچہ خاصا کشادہ تھا۔ باغیچے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ گلاب کے کئی پودے تھے جن میں سفید، سرخ اور زرد گلاب کھلے ہوئے تھے..... زرد گلاب..... انہوں نے پڑمردگی سے سانس لی۔

گھنشیام جی تو چلے گئے تھے۔ اب مکنا دیوی تھیں اور دو چھوٹے چھوٹے بچے، رام اور رادھا۔ اور ایک مسلسل پرکھشا تھی۔ تاہم انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اس پرکھشا میں، اس آزمائش میں ہاریں گی نہیں۔ لڑتی رہیں گی۔ اپنے لئے نہیں، بچوں کے لئے۔ اُن کی اپنی زندگی تو محرومی اور انتظار میں بیت گئی تھی۔ محرومی کہ انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کا ہاتھ اس بھکاری کے کشکول کی طرح خالی رہا تھا جیسے سارا دن صدا لگانے کے بعد بھی بھیک نہ ملی ہو۔ اور انتظار کہ کبھی تو وہ دن آئے گا جب انہیں ان کے ایک سنے کی تعبیر ملے گی۔ ایک گھر، جو اُن کا اپنا ہوگا۔ ایک ایک اینٹ، ایک ایک کیل ان کی ملکیت ہوگی۔ اور وہ اپنی ذات کے پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ اس گھر میں رہ سکیں گی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بچوں کو بھی اس محرومی اور انتظار سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ ہمت باندھی اور حالات سے لڑنا شروع کیا۔

اب دھیان آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ اُن کی جدوجہد کی کہانی بائیس تیس برسوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور اب انہیں یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ اتنی لمبی مدت تک وہ حالات کے پُر خار راستے پر ننگے پاؤں چلی تھیں۔ کیا واقعی؟..... مڑ کر دیکھتی ہیں تو حد نظر تک زخمی پیروں کے نشان نظر آتے ہیں اور انہیں یقین آتا ہے کہ واقعی وہ اس راستے پر قدم بہ قدم چلی ہیں۔ مگر یہ سفر آسان بہر حال نہیں تھا۔ بڑے آزار سہے تھے انہوں نے۔ بہت دکھ اٹھائے تھے۔ ہر شام مرتی تھیں اور ہر صبح جیتی تھیں۔ اور ہر چند کہ جینے اور مرنے کا یہ عمل حد درجہ اذیت ناک تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ صرف ایک مقصد کے لئے، یہ کہ ان کے بچے ہیں اور بچوں کے لئے، رام اور رادھا کے لئے وہ وقت کی ساری بدشگونیاں اپنے سر لے لیں گی لیکن بچوں پر آج نہیں آنے دیں گی۔ تعلیم تو تھی نہیں لہذا انہوں نے کبھی بچوں کے اسکول کے کچن میں برتن مانجھے، کبھی ہسپتال میں فرش صاف کیا، کبھی کپڑے سیئے اور کبھی کسی سپر اسٹور میں اٹھانے دھرنے کا کام کیا۔ بیچ بیچ میں اکثر بیکاری کا سامنا بھی ہوا۔ تب حکومت کی طرف سے ملنے والے بیکاری الاؤنس پر گزارا کرنا پڑا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور ضرورتیں مار دیں۔ معمولی کپڑے پہنے اور سردیوں

میں صرف ایک بھدا سا کوٹ پہن کر گزرا کیا۔ مگر بچوں کو کبھی کسی محرومی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ انہیں اچھا کھلایا، اچھا پہنایا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی بروقت پوری کی۔

اپنے گھر کی آرزو ان صبر آزما دنوں میں بھی ہر پل موجود رہی۔ مگر اب انہوں نے اپنی اس تمنا کا مرکز رام کو بنالیا تھا۔ بڑا ہوگا تو گھر خریدے گا اور میرا سپنا پورا ہو جائے گا۔ وہ رام کو دیکھتیں اور اس کے بڑھتے ہوئے قد کاٹھ پر نظر ڈالتیں تو ان کا حوصلہ اور بڑھتا۔ ہاں، رام ضرور ان کی یہ حسرت پوری کرے گا۔ وہ کام جو ان کے پتا نہیں کر سکے، پتی سے نہ ہو سکا، وہ بیٹا کرے گا اور ان کا یہ خواب جو جان کا روگ بن گیا ہے، انجام کار شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ وہ سوچتیں اور خوش ہوتیں۔

وقت گزرا۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ رادھا کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہوئی اور وہ اپنے پتی کے ساتھ ناروے چلی گئی۔ پھر رام کی شادی ہوئی۔ سیتا گھر آئی۔ کچھ اور سے بیٹا، گھر میں شام اور گیتا کا اضافہ ہوا۔ اور پھر آخر کار وہ دن آیا جب مکان خریدا گیا۔ کچھ رقم رام نے جمع کی تھی، کچھ روپیہ ان کے پاس تھا جو انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے برسوں میں پس انداز کیا تھا۔ وہ سارا روپیہ انہوں نے رام کو دے دیا۔

”بس اب اور دیر کرنا مناسب نہیں۔ مکان لے ہی لو۔“ انہوں نے کہا تھا۔ ”بچوں کو کرائے کے نہیں، اپنے مکان میں پلٹنا بڑھنا چاہئے۔“

جس دن مکان کی چابی ملی اور انہوں نے پہلی بار ”اپنے“ گھر میں قدم رکھا، وہ ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔ سب سے انمول اور مبارک۔ اتنا کہ ہر تہوار سے بڑا۔ گو بڑھاپا تھا اور ناتوانی، پھر بھی وہ سارے گھر میں ماری ماری پھریں، چپے چپے کو پیار سے دیکھا، کھڑکیوں اور دروازوں پر نظر ڈالی اور ان کا من خوشی، آسودگی اور غرور سے بھر گیا۔ آخر کار ان کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ یہ مکان ان کے بیٹے کا ہے، گویا ان کا ہے۔ اب کوئی چو بے لال دروازے پر آکر سامان باہر پھینکنے کی دھمکی نہیں دے سکتا۔ اور نہ کوئی کونسل مکان خالی کروا سکتی ہے۔ ملنا کو پہلی بار ہاں، زندگی میں پہلی بار طمانیت، افتخار اور تحفظ کا بھرپور اور بے پایاں احساس ہوا۔

پہلے سات دنوں میں ہر صبح انہوں نے معمول سے زیادہ سے پوچا میں صرف کیا اور گھر کی خیر و برکت اور اپنے بچوں کے لئے صحت و سلامتی اور ترقی و کامرانی کے لئے پرارتھنا کی۔

یہ کوئی سات ماہ پہلے کی بات ہے۔

ایک ایک ان کی توجہ شام اور گیتا کی طرف چلی گئی۔ ایک بار پھر ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس بار وجہ نزاع وہ خود تھیں۔ گیتا کہہ رہی تھی کہ دادی میری ہیں، جبکہ شام کا اصرار تھا کہ دادی اس کی ہیں۔ گیتا یکا یک گھومی اور اچک کر مکنا دیوی کی گود میں بیٹھ گئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

”دادی! تم میری دادی ہونا؟“

”ہاں بیٹا!“ انہوں نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”نہیں، نہیں..... تم میری دادی ہو۔“ شام ان سے لپٹ گیا۔

”نہیں..... دادی میری ہیں۔ تم الگ ہو۔“ گیتا چلائی۔

”نہیں..... میری ہیں۔“ شام نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”دادی! تم بتاؤ، کس کی دادی ہو تم؟“ گیتا نے پوچھا۔

مکنا کے سینے میں کوئی شے چیخ کر ٹوٹی۔ انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”بیٹا! میں تم دونوں کی دادی ہوں۔“

”نہیں، نہیں..... تم میری ہو..... تم میری ہو۔“ گیتا چلائے لگی۔

”نہیں، میری ہیں۔“ شام اور بھی زیادہ زور سے مکنا دیوی سے لپٹ گیا۔

ایک ایک سیتا نے گردن گھما کر شام اور گیتا کو ڈانٹا۔ ”چپ رہو تم دونوں..... فضول کی باتیں مت کرو اور الگ ہٹ کر بیٹھو۔“

مکنا دیوی نے ہولے سے دونوں بچوں کو خود سے الگ کر دیا۔

رام نے معا کار کی رفتار کم کی۔ دائیں جانب ایک سڑک نظر آرہی تھی۔ رام نے کار اُس طرف موڑی، پھر کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور کار ایک چھوٹے سے کار پارک میں رُکی۔ سامنے ایک عمارت تھی۔ یک منزلہ، جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ دائیں ہاتھ والا حصہ چوکور تھا جبکہ بائیں جانب ایک وسیع گول کمرہ تھا۔ دونوں حصوں کے درمیانی فاصلے میں جو کوئی بیس فٹ تھا، ایک کشادہ راہداری بنائی گئی تھی۔ راہداری میں ہی ایک دفتر تھا اور اس سے متصل انتظار گاہ۔ دونوں بچوں کو انتظار گاہ میں بٹھایا گیا۔ پھر رام، سیتا اور مکنا دیوی دفتر میں گئے جہاں ایک دہلی پتلی عورت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اس عورت کا نام بیٹی تھا۔ وہ ایک خوش مزاج عورت تھی مگر اس کے چہرے سے افسردگی اور تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ وقت اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ کھو بیٹھی ہو۔ اس نے نرم آواز اور دوستانہ لہجے میں ان سے باتیں کیں۔

زیادہ دیر نہیں لگی۔ محض پندرہ منٹ میں ضروری امور طے ہو گئے۔ پھر اس نے رام اور سیتا سے کہا۔

”ٹھیک ہے..... اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“

جب وہ دفتر سے باہر آئے تو پینی نے مکتا دیوی سے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیے۔“ مکتا دیوی نے منوں وزنی قدم آگے بڑھایا۔

پینی انہیں گول کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرہ اصل سنگ روم تھا۔ کمرے میں چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے لگے تھے جو خاصی اچھی حالت میں تھے۔ ایک طرف ٹیلی ویژن رکھا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر ڈامینو، تاش کی گڈی اور شطرنج کا ڈبہ قرینے سے رکھا تھا۔

مکتا نے ہر اسان نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنے سینے کے اندر دل کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھی انگریز عورت تھی جو صوفے پر نیم دراز تھی اور غالباً سو رہی تھی۔ جبکہ دوسرا ایک ایشین مرد تھا۔ سر پر ایک ملگجی سی ٹوپی، آنکھوں پر پلاسٹک کے سیاہ فریم کا چشمہ، چھوٹی سی داڑھی جس کا ایک ایک بال سفید تھا۔ ہاتھ میں بید کی چھڑی۔ وہ ایک کرسی پر ایک جانب قد رے جھک کر بیٹھے ہوئے تھے اور مکتا دیوی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نظریں ملیں تو وہ ہولے سے مسکرائے۔

مکتا دیوی کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی افسردہ مسکراہٹ ابھری۔

پینی نے مکتا دیوی سے نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ یہاں بیٹھے، میں ابھی آتی ہوں۔“ لیکن مکتا دیوی بیٹھیں نہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہیں اور کھڑکی سے باہر کار پارک کی جانب پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہیں جہاں رام، سیتا اور بچے کار میں بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کار کو اشارت ہوتے اور ریٹکتے ہوئے دیکھا۔ کار سڑک پر آئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ تبھی یکایک ان کے کانوں میں آواز آئی۔

”آداب عرض بہن!“

انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ عمر رسیدہ ایشین بزرگ جو کرسی پر بیٹھے تھے، اب اٹھ کر چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مکتا دیوی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”آداب۔“

”میرا نام محمد علی ہے۔“ بزرگ نے کہا اور ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

مکتا دیوی نے پڑمردگی سے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔

”کیا آپ یہیں رہیں گی؟“ محمد علی نے پوچھا۔

ملتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری مگر کچھ کہا نہیں۔

قدرے توقف کے بعد محمد علی نے کہا۔ ”شاید آپ کی بیٹی ہے وہ۔“ انہوں نے کار کی

طرف اشارہ کیا۔

”نہیں..... بہو ہے۔“

”اچھا، اچھا.....“ محمد علی نے ہولے سے کہا۔ ”ابھی جب آپ آئی تھیں تو میں نے

راہداری میں آپ کو دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کی بیٹی اور داماد ہیں۔ مگر..... وہ

دونوں بچے تو بہت ہی پیارے ہیں۔“ انہوں نے رک کر افسردگی سے سانس لی۔ ”شاید

مجھے کہنا تو نہیں چاہئے لیکن اگر آپ خیال نہ کریں تو..... آپ کو یہاں آنے کی ضرورت

کیوں پڑی؟“

ملتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”اصل میں گھر میں جگہ کی کچھ کمی تھی۔ اور پھر

میری بہو.....“ وہ یگانگت جھجک کر چپ ہو گئیں۔ پھر لمحہ بھر رک کر بولیں۔ ”کچھ اور

پریشانیاں بھی تھیں۔ اس لئے۔“

”اچھا، اچھا..... میں سمجھا۔“ محمد علی نے تھکے ہوئے انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”ایسا

ہی ہوتا ہے۔ کیا، کیا جائے۔ اختیار کی بات نہیں ہے۔ جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ اور پھر بیٹا اور

بہو.....“ وہ یکایک رُکے، پھر کہنے لگے۔ ”مگر بہن! آپ پریشان نہ ہوں۔ شروع میں

جی گھبرائے گا مگر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں اسٹاف کے لوگ اچھے

ہیں۔ خیال رکھتے ہیں۔ اور ہاں، دو اپنے ہم زبان اور بھی ہیں یہاں۔ میں آپ کو ملواؤں

گا ان سے۔ یہ ”اولڈ پیپلز ہوم“ برا نہیں۔ سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تاکہ تنہائی کا

احساس زیادہ تکلیف نہ پہنچائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ جلدی ہی ہم لوگوں میں گھل مل

جائیں گی۔“

ملتا دیوی نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کار اب موڑ پر پہنچ کر دائیں جانب گھوم رہی

تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ شام اور گیتا عقی اسکرین سے عمارت کی طرف ہی دیکھ رہے

تھے۔ شاید وہ ایک نظر اور دادی کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معاً ان کے کانوں میں

دونوں بچوں کی آواز گونجی۔

’دادی میری ہیں..... دادی میری ہیں.....‘

پھر کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ملتا دیوی نے زور سے سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر

آنکھوں کی نمی خشک کی۔

پھر انہوں نے محمد علی کی طرف دیکھا۔

”اب جو بھی ہو، سمجھو تا تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ان کی آواز سے بے بسی چھلک رہی تھی۔
 لمحہ بھر چپ رہیں، پھر کہنے لگیں۔ ”ویسے میرے بیٹے اور بہو نے وعدہ کیا ہے کہ پابندی
 سے مجھ سے ملنے کے لئے آیا کریں گے۔“

”ہاں..... وہ ضرور آئیں گے۔ اگر انہیں وقت ملا تو۔“ محمد علی نے شکستہ آواز میں کہا۔

”اگر.....؟“ ملتا دیوی نے سہم کر ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ محمد علی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لیا۔ ”ملتا دیوی! اس ”ہوم“
 سے باہر جو دنیا ہے نا، وہ بہت زیادہ مصروف ہے..... کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہر
 شخص بھاگ رہا ہے..... اندھا دھند بھاگ رہا ہے، خواہشوں اور ضرورتوں کے پیچھے۔
 لیکن خواہشیں اور ضرورتیں ہیں کہ پوری ہی نہیں ہوتیں۔ کیسی کیسی ”مجبوریاں“ ہیں
 ”پیاروں“ کی اور کیسی کیسی مصروفیات۔ دوستوں سے ملنا ملانا، پارٹیاں، میٹنگیں، بیوٹی
 سیلون اور نہ جانے کیا کیا..... ہر شخص تصنع اور نمائش کے جنگل میں گم ہے۔ اور لطف یہ
 ہے کہ اس جنگل سے باہر وہ نکلتا بھی نہیں چاہتا بلکہ اور گم ہونا چاہتا ہے۔ اور ہر چند کہ اس
 کے پاس سب کچھ ہے، بہت کچھ ہے۔ پھر بھی بیچارہ بے حد کنگال و فلاح ہے کہ اس کے
 پاس وقت نہیں ہے۔ میں یہاں سات ماہ سے ہوں۔ میرے بیٹے نے بھی کہا تھا کہ ہفتے
 میں دو بار میرے پاس آیا کرے گا۔ دو ماہ تک اُس نے اپنے وعدے کی آبرورکھی۔ مگر اب
 مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ کبھی کبھی صرف پندرہ منٹ کے لئے۔ کیا کرے غریب۔ مجبور
 ہے۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔“

محمد علی کی آواز دھیرے دھیرے معدوم ہو گئی۔

ملتا دیوی نے زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور اپنے دل کو دھیرے دھیرے
 ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔



اور تب میں نے زبان سے خون کے قطرے پونچھے۔ آنکھوں کا جالا صاف کیا۔ جسم پر جمی برسوں کی پھپھوندی جھاڑی اور اپنے اندرون کا غیر مرئی دروازہ کھول کر باہر نکلا اور حیران ہوا۔

میرے چاروں طرف، دائیں بائیں، آگے پیچھے جو دنیا تھی وہ کچھ اجنبی، نامانوس اور بے مہر تھی۔ ہوا مسموم تھی اور تیل اور بارود کی بو سے بوھل۔ فضا میں سرمی کیلا اور کثیف غبار تھا اور جس اور گھٹن۔ اتنی گھٹن کہ سانس لینے میں نہ صرف دشواری ہو رہی تھی بلکہ ہر سانس کے ساتھ زہریلی کثافت پھپھڑوں میں سرایت کرتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چند ایک بار پورا منہ کھول کر سانس لی اور تازہ ہوا اندر اتارنے کی کوشش کی جس میں ناکام رہا۔ پھر اندر کی گھٹن خارج کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکام رہا۔ پھر میں مزید حیران ہوا۔ کیا بات ہے؟ یہ فضا میں اتنا زہر کیوں؟ اتنا جس اور گھٹن کیوں؟ تازہ اور لطیف اور حیات افروز ہوا کا کوئی جھونکا کیوں نہیں آتا؟ آخر ایسا کیا ہوا ہے؟ پہلے تو یوں نہیں تھا۔ فضا پہلے بھی گوبالکل شفاف اور فرحت افزا نہیں تھی۔ کم ہی سہی لیکن فضا اور ہوا میں تازگی اور راحت کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ مگر اب کیوں نہیں؟..... کہیں کرۂ ارض کی ساری کھڑکیاں بند تو نہیں ہو گئیں؟..... خوف کی ایک سرد لہر میرے خستہ وجود کے اندر دوڑی۔

پھر میں نے اپنے آپ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اپنے کہنے جسم کی عمارت کو، جو دو کھمبوں پر ایستادہ ہے، غور سے دیکھا۔ عمارت؟ یہ تو محض ایک تہمت ہے۔ عمارت اب کہاں رہی۔ ایک زمانہ تھا، یہ عمارت جب واقعی پُر شکوہ اور خوبصورت تھی اور اپنے دونوں ستونوں پر نہایت فخر و وقار اور اعتماد سے کھڑی تھی۔ آنے جانے والے معارک کر ایک بار پُر ستائش نظر آئے۔ اس کے ظاہری روپ اور وجاہت کو ضرور دیکھتے تھے اور مرعوب ہوتے تھے۔

مگر پھر یوں ہوا کہ زمانے کے ستم، حالات کی بے مہری اور وقت کی چیرہ دستیوں نے اُس کے کُسن پر شب خون مارنا شروع کیا۔ بنیادوں کو دیمک چاٹنے لگی۔ رفتہ رفتہ سب کچھ ملیا میٹ ہوا۔ وقت کے چوروں نے سیندھ لگائی اور عمارت کے اندر جو سونا چاندی، ہیرے موتی اور جواہرات تھے، سب لوٹ کر لے گئے۔ عمارت، عمارت نہ رہی ایک اُجاڑ، ویران، آسیب زدہ کھنڈ بن گئی جس میں مُردہ خواہشیں اور اُمیدیں چڑھیلیں بن کر بین کرتی پھرتی ہیں۔ اور میں چپ چاپ ان کی ماتمی آوازوں کو سنتا رہتا ہوں۔

تو میں نے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی اور سر سے پاؤں تک نیلی نیلی رگوں کو دیکھا اور ان کے اندر دوڑتی ہوئی لہو کی ندیوں کی سرسراہٹ سننے کی کوشش کی۔ پہلے یہ ندیاں بہت پُر جوش اور شوریدہ سر ہوا کرتی تھیں۔ بالکل پہاڑی ندیوں کی طرح جھاگ اُڑاتی، اُچھلتی، پھاندتی، گاتی، گنگناتی ایک عالمِ مستی میں بہتی تھیں۔ مگر اب ان کا سارا جوش اور مستی ماند پڑ چکی ہے۔ اب یہ کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح رک رک کر، سنبھل سنبھل کر، چپکے چپکے بہتی ہیں۔ اتنی ست روی سے کہ آہٹ تک نہیں ملتی۔ اور کبھی کبھی تو شبہ ہوتا ہے کہ شاید رک ہی گئی ہیں۔ یہی حال دل کا ہے۔ دل کہ زندگی کی علامت ہے۔ دھڑکتا رہتا ہے تو آدمی زندہ رہتا ہے، رکتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے اور آدمی ناکامیوں، دُکھوں اور حسرتوں کا زارِ راہ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ دل تندرست ہو تو بظاہر کائنات میں رنگ بھرتا ہے اور ایک ایک نظر سے لطف و مسرت کشید کرتا ہے۔ بیمار اور مضحل ہو تو ہر شے بے رنگ، پھیکی اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ میرا دل بھی کبھی بہت توانا تھا۔ جوش و جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ لپک کر آسمان کو چھونا چاہتا تھا۔ وقت کی گردش کو روک دینے کا حوصلہ رکھتا تھا اور 'تھا' چونکہ صیغہ ماضی ہے لہذا یہ گئے گزرے دنوں کی باتیں ہیں اور اب خواب و خیال ہوئیں۔ اب نہ وہ جوش ہے اور نہ وہ حوصلہ۔ اب دل تھک چکا ہے۔ مضحل ہو گیا ہے اور کسی معذور آدمی کی طرح چند قدم چلتا ہے تو ہانپ جاتا ہے اور دیر تک ہانپتا رہتا ہے۔

پھر میں نے گردن جھکائی اور اپنے پیروں پر نظر ڈالی۔

میں نے دیکھا کہ ان دوستوں میں، جن پر میرے جسم کی اوپری خستہ عمارت ایستادہ ہے، ہلکی سی لرزش ہے۔ گو انہیں جسم کا بوجھ سہارنے میں دقت ہو رہی ہے۔ میرے پاؤں کٹے پھٹے ہیں۔ ان میں کدھر۔ سیاہ، بد صورت دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ میں اس بد صورتی اور دراڑوں کو چھپانے کے لئے جوتے پہنے رہتا ہوں۔ ان جوتوں پر پینٹھ برسوں کی دلاؤزار مسافت کی تھکن اور گرد لپٹی ہوئی ہے۔ جب میں جوتا تبدیل کرتا ہوں تو یہ تھکن اور گرد

نئے جوتوں سے لپٹ جاتی ہے۔ جب میں اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا تو مجھے ان پر بڑا ترس آیا۔ پینسٹھ سال تک یہ پاؤں، یہ خستہ اور مظلوم مگر تابعدار اور فرمانبردار پاؤں اس ناکارہ اور بے فیض جسم کا بوجھ ڈھوتے رہے ہیں۔ اور ہر چند کہ کبھی کبھار احتجاج کرتے ہیں مگر نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ بے چارے۔

میں چند لمبے کچھ احساسِ جرم اور کچھ ہمدردی اور مومنیت سے اپنے پیروں کو دیکھتا رہا۔ پھر لردن گھمائی اور پیچھے نظر ڈالی۔ حدنگاہ تک دھندھی۔ گزرے دنوں کی دھند۔ جسم اور دل کی طرح نظر بھی اب کمزور اور بیمار ہو چکی تھی۔ چنانچہ مجھے پینسٹھ برسوں کی طویل گزرگاہ پر بہت دور تک ٹھیک ٹھیک نظر نہیں آتا۔ میں ہاتھوں کا چھجا بنا کر اور آنکھیں میچ کر، تمام تر بصارتی قوت ایک مرکز پر لا کر، بہت دھیان سے دیکھتا ہوں لیکن اس طویل گزرگاہ پر مجھے کوئی پھول نظر نہیں آتا۔ کوئی رنگ، کوئی تنویر دکھائی نہیں دیتی۔ اور جو کچھ نظر آتا ہے، وہ بہت دلازار ہے۔ اوڑ کھا بڑ، گرد و غبار، کانٹوں کی چادر بکھی ہوئی۔ یہاں وہاں خون کے دھبے جو میرے پیروں کے زخم اور سفرِ حیات کی صعوبتوں کے گواہ ہیں۔ اس راہ گزر پر کہیں کوئی درخت نہیں، کہیں کوئی سایہ نہیں، کہیں پانی کا کوئی چشمہ نہیں۔ ہاں، جس ہے اور گھٹن ہے۔ مجھے تعجب ہوا، اس راہ گزر پر میں نے عمر کا سفر طے کیا ہے؟..... پھر میں نے اور آگے دیکھنے کی کوشش کی مگر بے کیف، بے روح نظر دھند میں گم تھی۔

میرے ذہن میں معاً ایک خیال اُبھرا۔ آگے کیا ہے؟ جہاں تک بیمار نگاہ کام کرتی ہے، اس سے آگے کیا ہے؟..... پھر اس خیال نے ایک شدید خواہش کی صورت اختیار کی۔ ایک ہوک سی اُٹھی۔ ایک خلش، بے چینی..... اضطراب..... ہاں، آگے کیا ہے؟ مجھے چلنا چاہئے۔ جہاں تک نظر آتا ہے، اس سے آگے بھی تو میرا وجود موجود ہے۔ مگر کیسا ہے؟..... مجھے لگتا ہے، شاید زندگی کے کسی موڑ پر، وقت کی کسی کج ادائی کے طفیل میں اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا۔ کہاں بچھڑا تھا؟ میں نے یاد کے ویران جزیروں کو کھنگالا۔ کچھ شکلیں اُبھریں۔ ایک لکھوری اینٹوں والی گلی، ایک سانخوردہ دروازہ جس پر ٹاٹ کا ایک بوسیدہ اور دریدہ پردہ پڑا جھول رہا ہے۔ ایک بیڑ جو اس سانخوردہ دروازے کے پیچھے یعنی گھر کے آنگن میں ایستادہ ہے۔ پھر سرخ کپریوں کی ایک چھت، دروازے سے کچھ فاصلے پر بجلی کا ایک بد رنگ کھمبا، جس کے تین تاروں میں سے ایک میں پھٹی ہوئی پتنگ مفتوحہ اور ہزیمت زدہ قوموں کے سرگلوں پر چم کی طرح شرمندگی سے جھول رہی ہے۔ پتنگ..... میں قدرے حیران ہوا۔ کیا وہ پتنگ اب بھی اس تار پر موجود ہوگی؟..... پھر کچھ اور شکلیں اُبھریں۔ ایک بلند، سرخ عمارت، ریلوے پلیٹ فارم، چلتے پھرتے لوگ، ایک طویل

بد رنگ ریل گاڑی اور اس کا مہیب انجن، لوہے کی ایک بچ، پرانی اور بھدی..... اور..... اور..... ذرا ٹھہرو۔ یہ کیا ہے؟ میرے کانوں میں یہ آواز کیسی ہے؟ کوئی مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ آواز بہت دور سے، پچاس سال کے طویل فاصلے سے آرہی ہے۔
 ”آؤ بیٹا! چلیں۔ گاڑی اب جانے ہی والی ہے۔“

”اماں.....!“

یکایک میں مضطرب ہوا۔ دل اگرچہ مضطرب، ناتواں اور بیمار ہے، مچل اٹھا۔ چلنا چاہئے۔ دیکھنا چاہئے ٹاٹ کے اس پردے کو۔ آنگن میں لگے بیڑ کو، اس پلیٹ فارم کو اور اس بچ کو۔ ہاں، یاد آ رہا ہے۔ میں اس بچ پر بیٹھا تھا اور وہیں کہیں اپنے آپ سے جدا ہوا تھا۔ ایک بار مجھے وہاں ضرور جانا چاہئے۔ ہاں ایک بار..... اور اپنے آپ سے مل لینا چاہئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہر چند کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے، میں اب بھی وہیں بیٹھا ہوں اور اپنا منظر ہوں۔

تب میں نے ہمت جمع کی۔ بند مٹھی کو غور سے دیکھا۔ جستجو کا زار راہ گانٹھوں میں باندھا اور اپنے جسم کے کھنڈر کو اپنے ناتواں پیروں پر گھسیٹنا شروع کیا۔

میں حیران ہوا۔ میرے چاروں طرف لوگ تھے۔ آتے ہوئے لوگ، جاتے ہوئے لوگ۔ ہر شخص اپنے آپ میں گم تھا اور ایک دوسرے سے بے خبر۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ مہیت ناک انجن سے کثیف دھواں نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ سارے ڈبوں کے دروازے کھلے تھے اور مسافر ان دروازوں سے یا تو اتر رہے تھے یا چڑھ رہے تھے۔ گہری نیلی یونیفارم میں ملبوس ایک فربہ شخص انجن کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جھنڈی تھی اور وہ لا تعلق نظروں سے ٹرین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور اترتے چڑھتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ اس طرح گویا وہ رو بوٹ ہو۔ کتنی عجیب بات ہے، اور تیر خیز بھی۔ یہ پورا نظارہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا برسوں پہلے تھا۔ ٹرین اور مہیب انجن اور مسافروں کا ہجوم اور گاڑی اور سبز جھنڈی۔ ابھی گاڑی جھنڈی ہلائے گا اور گاڑی چلی جائے گی۔ چند منٹ میں نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ یونہی ہوتا ہے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ٹھہرتی نہیں، ہمیشہ چلی جاتی ہے۔

میری حیرت کا دوسرا سبب وہ آہنی بچ تھی جو شیڈ کے ایک سائخوردہ ستون کے قریب ایستادہ تھی۔ اس کے رنگ دروہ میں سرمو فرق نہیں پڑا تھا۔ اسی بچ پر میں بیٹھا تھا۔ اور اب اس پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ دس گیارہ سال کا۔ اس

کے قریب ہی زمین پر ایک تھیلا اور ایک چھوٹا ٹرنک دھرا تھا۔ وہ عورت اپنے بیٹے کو سمجھا رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ اٹھے گی اور بیٹے سے کہے گی۔

”آؤ بیٹا! اب چلیں۔ گاڑی اب چھوٹنے ہی والی ہے۔“

تو بیشتر اشیاء کو ثبات ہے نہ دوام۔ وقت رکتا نہیں، چلتا رہتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ گاڑی بھی پلیٹ فارم پر رکتی ہے، پھر چلی جاتی ہے۔ مگر کچھ منظر نہیں بدلتے۔ اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔ اور کچھ آوازیں بھی زندہ رہتی ہیں اور بار بار گونجتی ہیں۔ جیسے میری اماں نے کہا تھا اور جیسے یہ عورت ابھی کہے گی۔

”آؤ بیٹا! چلیں۔ گاڑی اب چھوٹنے ہی والی ہے۔“

بنج کے پیچھے، چند قدم کے فاصلے پر بک اسٹال ہے۔ برسوں پہلے اس بک اسٹال کے طویل کاؤنٹر پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُردو کے اخبار، رسالے اور کتابیں بچی رہتی تھیں۔ اب ایک بھی رسالہ یا اخبار اُردو کا نظر نہیں آتا۔ میں نے مایوسی سے اسٹال پر نظر ڈالنے کے بعد پھر بنج کو دیکھا اور اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔

”ہاں..... میں دیکھ سکتا ہوں..... میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہوں۔“

”کیا کہا تم نے.....؟“ اُس نے معاً سوال کیا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ دیکھنے میں جہاندیدہ اور باخبر نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی مسافت اور تجربے کی گرد تھی۔ اس کی آنکھیں گو عمر رسیدہ تھیں مگر ان میں ایک ایسی مقناطیسی چمک تھی، جو مقابل کو متاثر و مرعوب کرتی ہے۔ جب میں اس کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مربیانہ انداز میں مسکرایا۔

”تم نے کچھ کہا تھا؟“

میں یکا یک زبوس ہو گیا۔ ”یہ جو بنج ہے نا.....“ میں نے انگشت سے اشارہ کیا۔ ”میں دیکھ سکتا ہوں کہ میں اس بنج پر بیٹھا تھا۔“

اس کی مسکراہٹ میں بزرگانہ نرمی تھی۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

میں نے ذہن کو ٹٹولا۔ ”کوئی نصف صدی پہلے کی۔“

”گویا ایک عمر بیت گئی۔“ اس نے کہا۔

”ہاں.....“ میں نے اپنی آواز سنی جو ماضی کے کسی دور افتادہ ویرانے سے آرہی

تھی۔ ”میں اس بنج پر بیٹھا تھا۔ اماں میرے ساتھ تھیں۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔

تبھی اماں نے کہا تھا۔ چلو بیٹا! اب گاڑی چھوٹنے ہی والی ہے۔ اور.....“ میں سٹپا

کر چپ ہو گیا۔
”پھر.....؟“

”پھر میں اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا۔“

”بچھڑ گیا تھا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھا۔

”بچھڑنا شاید درست نہیں ہے۔“ میں نے تذبذب کے ساتھ اعتراف کیا۔ ”زیادہ بچ

یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے۔ خدا حافظ کہا تھا ایک دوسرے کو۔“

”اس کے چہرے پر، جس پر بزرگی اور دانش کا نور تھا، ایک لمحے کے لئے تاسف کی دھندلاہٹ اُبھری۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھوم کر گرد و پیش پر گہری نظر ڈالی۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھا، گاڑی پر ایک پل کے لئے نگاہ ٹھہری۔ پھر اس نے بچ پر نظر مرکوز کی۔

”تو تم گاڑی میں بیٹھ گئے تھے؟“

”ہاں۔“

”اور پھر گاڑی چھوٹ گئی تھی؟“

میری آواز نصف صدی کے فاصلے سے اُبھری۔ ”ہاں۔“

”میں دیکھ سکتا ہوں۔“ اُس نے گھمبیر اور پُر یقین آواز میں کہا۔ ”تم گاڑی میں کھڑکی

کے قریب بیٹھے ہو اور باہر دیکھ رہے ہو، بچ کی جانب، جہاں تم بیٹھے ہو۔ اگرچہ تم اپنی اماں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو چکے ہو مگر پھر بھی وہیں بیٹھے ہو۔ اور گاڑی کے ڈبے میں بھی

ہو، اور کھڑکی سے اپنے آپ کو دیکھ رہے ہو۔ حسرت سے، مایوسی سے اور شاید خوف سے۔

اور گاڑی آہستہ آہستہ ریگ رہی ہے۔ آگے بڑھ رہی ہے۔ حتیٰ کہ کچھ دیر میں اسٹیشن سے

نکل کر انجانی، دور دراز منزلوں کی جانب روانہ ہو جاتی ہے مگر..... مگر تم وہیں بچ پر بیٹھے

رہ جاتے ہو۔ ہے نا.....؟“

میں نے ششدر ہو کر اسے دیکھا۔ ”ہاں..... بالکل یونہی ہوا تھا۔ لیکن تمہیں کیسے

اندازہ ہوا؟“

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک بار پھر غلٹ سے لپکتے جھپکتے لوگوں پر ایک

نظر ڈالی۔ پھر مہیب انجن سے بلند ہونے والی سیٹی کی تیز سماعت شکن آواز سنی۔

”یونہی ہوتا ہے۔“ اُس نے اس آدمی کی طرح کہا جو باہر ہی نہیں، اندر کے رموز و

اسرار سے بھی واقف ہوتا ہے۔ ”ہم سب کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی جگہ اور کسی بہانے اپنے

آپ سے اچانک بچھڑ جاتے ہیں۔ سفر کا یہی رمز ہے۔ ہم ہمیشہ اپنے ساتھ سفر نہیں

کرتے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ پھر گاڑی چھوٹ جاتی ہے اور ہم اپنا ایک وجود پلیٹ فارم پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اور.....“

”اور پھر کبھی اپنے آپ سے نہیں مل پاتے۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہے۔“ وہ پُر خیال انداز میں کہنے لگا۔ ”گوشاز ہی ہوتا ہے مگر ہو جاتا ہے کہ ہم اچانک کسی موڑ پر اپنے سامنے آ جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے ہی سہی، لیکن اپنی باز دید کے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور جب ہم اپنے آپ کو خود اپنے سامنے پاتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں۔ زمانی فاصلے کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر۔ یہ تبدیلیاں کبھی کبھی اتنی زیادہ اور دلآزار ہوتی ہیں کہ ہم اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں پاتے۔“

”اچھا.....“ میں نے سہم کر کہا۔

”ہاں۔“ اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی ہیرے کی انی جیسی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے کھنڈر میں سرایت کرتی محسوس ہوئیں۔ ”شاید تم بھی خود اپنی تلاش میں آئے ہو؟“

میں نے خجالت آمیز مگر اعترافانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”اور کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو پہچان لو گے؟“

میرے اندر تشکیک کا ایک بھنور بنا۔ ”تم نے ابھی خود ہی کہا تھا، زمانی فاصلے بہت کچھ بدل دیتے ہیں۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ.....“ پھر میں شپٹا کر چپ ہو گیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ عورت اب بچ سے اٹھ گئی تھی اور نپے تلے قدموں سے ایک کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کے بیٹے نے چھوٹا ٹرنک اٹھا لیا تھا۔ جبکہ تھیں عورت کے ہاتھ میں تھا۔ میں افسردہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا اور میرے ذہن میں ایک احساس ابھرتا رہا۔ ابھی وہ دونوں ڈبے میں سوار ہو جائیں گے۔ پھر انجن کی سیٹی گونجنے لگی۔ گارڈ جھنڈی ہلا کر اشارہ دے گا اور گاڑی روانہ ہو جائے گی اور وہ دونوں چلے جائیں گے۔ کیا واقعی؟..... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ لڑکا ٹرین میں جانے کے باوجود نہ جائے اور اپنے آپ کو اسی بچ پر چھوڑ جائے جیسے برسوں پہلے میں خود کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

یہ ایک متوحش ہو کر میں نے بچ کی طرف دیکھا۔ مگر بچ خالی تھی۔

میری دونوں ٹانگیں دیر سے میرے خراب و خستہ بدن کا بوجھ اٹھائے کھڑی تھیں اور اب احتجاج کرنے لگی تھیں۔ میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ ٹانگیں مجھے کوئے اور بد دعا دینے لگیں، مجھے بچ پر بیٹھ جانا چاہئے۔ چنانچہ آگے بڑھا اور بچ پر بیٹھ گیا۔ تاہم وہ کہ اس

کے چہرے پر استقامت کا نور بھی تھا، میرے قریب ہی کھڑا رہا اور دھیان سے مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں مجھے نروس کر رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ ڈبے میں سوار ہو چکی تھی اور کھڑکی کے قریب بیٹھی اُداس نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

دفعۃً انجن نے سیٹی بجائی۔ پھر گڑگڑاہٹ کی آوازیں اُبھریں اور گاڑی نے ریٹنا شروع کیا۔ میری نظریں بدستور عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو پلک جھپکائے بغیر پلیٹ فارم کی ایک ایک شے کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں گاڑی پلیٹ فارم سے آگے بڑھ کر دوسرے مناظر میں گم ہو جائے گی۔ آنے والے دنوں میں وہ عورت نئے نئے مناظر سے دوچار ہوگی۔ لیکن یہ منظر شاید اس کی آنکھوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کیونکہ کچھ منظر کبھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔

پھر میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی آواز اپنے کانوں میں اُترتے ہوئے محسوس کی۔ ”مگر تم اپنے آپ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

ایک وحشت سی میرے بدن کے در و دیوار سے یوں ٹکرائی جیسے بھونچال آیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے استخوانی ہاتھ کی نیلی نیلی رگوں کو دیکھا اور ذہن کو جو بھونچال کی زد میں تھا، سنبھالنے کی کوشش کی جس میں محض جزوی طور پر کامیاب ہو سکا۔ پھر میں نے قدرے خجالت اور کچھ مجرمانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ کافی دیر سے یہ خیال مجھے بری طرح ڈرا رہا تھا کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گا۔ مگر میں کیا جواب دوں گا؟ بھلا کوئی بھی اس سوال کا کوئی شافی جواب کیسے دے سکتا ہے کہ وہ کیوں اپنے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پڑمردہ آواز میں کہا۔ ”یہ سوال خود میں نے بھی اپنے آپ سے کئی بار کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب مجھے نہیں ملا۔ چنانچہ میں نہیں جانتا کہ کیوں اپنی جستجو میں یہاں آیا ہوں۔ شاید..... شاید میں شرمندہ ہوں یا شاید کوئی بچھتاوا ہے۔ یا شاید یوں ہے کہ میں خوفزدہ تھا۔ اور ’آج‘ سے بھاگ کر ’کل‘ میں جانا چاہتا تھا۔ گزرے ہوئے ’کل‘ میں۔ شاید یہ بھی فرار کی ایک صورت ہے۔ مگر جب ہم اپنے آپ سے بھاگتے ہیں تو پھر اپنے آپ سے ہی ملنا چاہتے ہیں۔ اس ’میں‘ سے جو ہم سے کچھڑ چکا ہے۔ ہے نا.....؟“ میں نے پریشانی سے سر کو جنبش دی۔ ”میں شاید اپنی بات کچھ ٹھیک طرح سے کہہ نہیں پایا۔ تاہم امید ہے تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے۔“ میں نے رک کر زور سے سانس لی۔ ”اپنے آپ سے ملنے کے لئے کبھی کبھی تمہارا من بھی تو چپٹا ہوگا۔“

”ہاں.....“ اُس نے سر ہلا کر اتفاق کیا۔ ”ہم آوازوں اور یادوں کے حصار سے کبھی نہیں نکل پاتے۔ اور کبھی کبھی واپس جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ گزرا ہوا کل ایک محفوظ و مامون پناہ گاہ بھی ہے۔“ اس نے رک کر مجھے غور سے دیکھا پھر سوال کیا۔ ”مگر تم اب تک کہاں تھے؟“

”اندھیرے کے زندان میں۔“

”کیا کرتے تھے؟“

”دیوار چاٹتا تھا۔“

”دیوار چاٹتے تھے؟“

”ہاں.....“ میں نے بیچاری سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”اندھیرے کے اس زندان کی دیواریں محدودی اور دکھ کے مٹی گارے سے بنی ہیں۔ اور اندھیرا اتنا گہرا اور دبیز ہے کہ تم اسے ہاتھوں سے چھو کر محسوس کر سکتے ہو۔ اس اندھیرے میں کوئی روزن نہیں، کوئی درزن نہیں۔ چنانچہ روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے نہ ہوا کی کسی رمق کا احساس ہوتا ہے۔ بس ایک گھپ اندھیرا ہر پل مسلط رہتا ہے۔“ میں نے رک کر زور سے سانس لی اور اپنی آواز کا ارتعاش محسوس کیا۔ ”اور میں اکیلا نہیں تھا۔ اور بھی لوگ تھے بلکہ ہیں۔ اتنے زیادہ کہ میں انہیں شمار بھی نہیں کر سکتا۔ ہم سب اندھیرے کی اس مہیب اور دم گھونٹ دینے والی دیوار کو زبانوں سے چاٹتے تھے۔ بے تحاشا چاٹتے تھے تاکہ دیوار ختم ہو تو روشنی اندر آئے، ہوا اندر آئے، خوشبو اندر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کے اس پار اُجالا ہے۔ اور تازہ ہوا اور خوشبو اور رنگ اور ہر شے کا اثبات۔ تو صرف اس مقصد سے کہ ہم بھی ہوا میں..... تازہ ہوا میں سانس لے سکیں اور روشنی سے اپنے آپ کو اُجال سکیں اور اپنے اثبات کا تعین کر سکیں۔ ہم جی جان سے دیوار کو چاٹتے تھے حتیٰ کہ ہمارے جسموں کی ایک ایک رگ چپختے لگتی تھی۔ سائیس پھول جاتی تھیں اور زبانیں اس طرح زخمی ہو جاتی تھیں کہ ان سے خون ٹپکنے لگتا تھا۔ لیکن ہم بہر حال ہمت نہیں ہارتے تھے۔ دیوار کو چاٹتے ہی رہتے تھے حتیٰ کہ دیوار بس تھوڑی سی رہ جاتی تھی اور تب ہم بہت تھک جاتے تھے اور یہ سوچ کر کہ دیوار اب تھوڑی سی رہ گئی ہے، اک ذرا ہستانے کے لئے لیٹ جاتے تھے اور.....“ میں یکایک سہم کر چپ ہو گیا۔

”اور پھر تمہیں نیند آ جاتی تھی؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”ہاں۔“ میں نے زخمی آواز میں اعتراف کیا۔

”اور جب تمہاری آنکھ کھلتی تھی تو منکشف ہوتا تھا کہ دیوار پھر بڑھ کر جوں کی توں ہو

گئی ہے؟“

”ہاں..... اور تب ایک شدید بچھتاوا گھیر لیتا تھا۔ آخر میں سستانے کے لئے لینا کیوں؟ نہ لیتا تو آنکھ بھی نہ لگتی۔ اک ذرا سی ہمت اگر اور کر لیتا، تھوڑی سی مشقت اور جھیل لیتا تو پوری دیوار چائے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور تب میرے چاروں طرف اُجاا ہوتا، تازہ ہوا سانسوں کو نہال کرتی اور خوشبو سے جان و جسم مہک جاتے اور..... اور.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

اُس نے تجتس اور ترحم سے مجھے دیکھا۔

”مگر ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے نا۔“ میں نے رنج سے سر کو جنبش دی۔ ”ہونی کا اپنا رمز ہے، اپنے اسرار ہیں جنہیں ہم کبھی سمجھ نہیں پاتے۔ اور ہونی کے ہاتھوں میں کھلونا بنتے رہتے ہیں۔“ میں نے رک کر افسردگی سے سانس لی۔ ”خیر، تو دیوار پھر اُٹھ جاتی تھی اور تب میں ایک بار پھر اپنے آپ کو آمادہ کرتا تھا۔ ایک بار پھر حوصلہ اکٹھا کرتا تھا اور از سر نو دیوار چائے میں جت جاتا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ کتنا وقت گزر چکا ہے اور کب سے میں..... ہم سب دیوار چاٹ رہے ہیں۔ شاید صدیاں بیت گئی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ دیوار اب بھی جوں کی توں ہے۔“

”میں نے زمانے دیکھے ہیں اور صدیوں کا سفر کیا ہے۔“ اُس کی آواز میں تجربے اور آگاہی کی جھلک تھی۔ ”میں بستی بستی، مگر نگر گھوما ہوں۔ اور میں نے لوگوں کو دکھ کی سیاہ دیوار چاٹتے دیکھا ہے مگر دیوار ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی..... یہ دیکھو.....“ آخری دو الفاظ کہہ کر اس نے یکایک منہ کھول دیا اور پوری زبان باہر نکال دی۔

میں نے اپنے جسم میں ایک سر دلہر کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کی زبان پر چھالوں کا گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”پھر تم اپنے آپ سے ملنے نکل کھڑے ہوئے؟“

میں نے رفتہ رفتہ ویران ہوتے پلیٹ فارم پر نظر ڈالی۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ کیوں؟ بس دل میں اک ہوک اُٹھی اور میں چل پڑا۔ اپنے آپ سے اور اس فضا سے، اس ہوا سے، ان مناظر سے اور اس زمین کے چپے چپے سے ملنے کے لئے جس پر میرے قدموں کے نشان ہیں اور جن سے میں بچھڑ گیا تھا۔ ایک بار ان سب سے مل لوں اور ایک بار اپنے آپ کو دیکھ لوں اور گزری یادوں میں چند لمحے جی لوں۔ پھر..... پھر واپس چلا جاؤں گا۔“

”اور دیوار چائے میں جٹ جاؤ گے۔“

”اور کروں گا بھی کیا؟ دیوار تو چائنا ہی ہے۔“

”لیکن دیوار تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

”یوں ہی ہوتا آیا ہے اور شاید یونہی ہوتا رہے گا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”دیوار تو

ختم نہیں ہوتی لیکن چور دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“

”چور دروازہ.....؟“

”ہاں.....“ میں نے تاسف سے سر کو جنبش دی۔ ”ہم سب کی زندگی میں ایک چور

دروازہ ہوتا ہے۔ ہم شب و روز دیوار چاہتے ہیں اور جب دیوار ختم نہیں ہوتی اور ہم میں

مزید حوصلہ باقی نہیں رہتا تو ہم چپکے سے چور دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔“

وہ چند لمحے گہری استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر معامسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ

بہت شفیق تھی اور دعا دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پھر وہ یکایک گھوما اور آگے بڑھنے لگا۔

میں نے دیکھا، اس کی چال میں اعتماد تھا جیسے اسے معلوم ہو کہ کیسے قدم اٹھاتے ہیں اور

کیوں کر پاؤں زمین پر دھرتے ہیں۔ چلنا بجائے خود ایک ہنر ہے۔ اور بڑے رمز کا حامل

ہے۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانے کے لئے بہت ذہانت، یقین اور اپنی ذات پر پورے

اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس امر کی بھی کہ چلنے والے کو علم ہو کہ اسے کہاں جانا ہے؟

اس کی منزل کہاں ہے؟ جو لوگ قدم اٹھانے کے ہنر سے واقف نہیں ہوتے، وہ بھٹک

جاتے ہیں اور یا پھر ٹھوکر کھاتے ہیں اور راستے ہی میں گر جاتے ہیں۔“

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، تب میں نے گرد و پیش میں نظر ڈالی۔ گاڑی جا چکی

تھی اور پلیٹ فارم تقریباً دیران ہو گیا تھا۔ لیکن اس عورت اور اس کے لڑکے کے چہرے

ابھی بھی میری آنکھوں میں موجود تھے۔ کھڑکی سے جھانکتا ہوا اس کا اُداس چہرہ اور اس کے

قریب ہی بیٹھا ہوا اس کا بیٹا۔ میں نے معاً زور سے سانس لی اور گردن کو خم دے کر بچ کے

خالی حصے کو دیکھا۔ لیکن وہ لڑکا وہاں نہیں تھا۔ بچہ صرف میں بیٹھا تھا۔ لیکن میں یقین سے

کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے، وہ وہاں بیٹھا ہو لیکن میری نظر اسے دیکھنے سے قاصر رہی ہو۔

کون جانے.....!



اسٹیشن کی سرخ عمارت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔

مگر میرے قدم اٹھانے اور دھرنے کے عمل میں وہ یقین اور اعتماد نہیں تھا جس کا اظہار اس

بزرگ اور جہاں دیدہ آدمی کی چال سے ہوا تھا۔ سڑک بھری پری اور پُر ہجوم تھی۔ کاریں،

بسیں، رکشے اور ریڑھیاں آ، جا رہی تھیں۔ دکانوں میں گاہکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

فٹ پاتھ پر لوگ چھوٹی چھوٹی دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب عمارتیں کھڑی تھیں۔ بوڑھی، بد رنگ عمارتیں۔ بچپن میں، میں جنہیں اکثر دیکھتا تھا اور اچھی طرح پہچانتا بھی تھا۔ مگر اس وقت وہ کچھ اجنبی سی نظر آ رہی تھیں۔ شناسائی کا رشتہ شاید کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ صفائی نام کو نہیں تھی۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر کوڑا کرکٹ ہی نہیں، کہیں کہیں گوبر کے ڈھیر بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ منظر ہر چند کہ میرا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا تھا، پھر بھی کچھ غیر سادگ رہا تھا۔ کیا بات ہے؟ اس پورے منظر میں کچھ ایسی بات کیوں ہے جو نظر نہیں آتی مگر محسوس ہوتی ہے۔ جیسے شہر کے مزاج میں کچھ تکلف، کچھ بدگمانی در آئی ہے۔ بدگمانی؟..... میں نے سہم کر سوچا اور رشک بھری نظروں سے عمارتوں کو دیکھا، درختوں کو دیکھا۔ آسمان اور آسمان کے پیش منظر میں تیرتے بادلوں کو دیکھا اور ہوا کی سرسراہٹ سنی اور یوں محسوس کیا جیسے وہ سب مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

”کون ہوتم.....؟“

”میں.....“ میں نے بیچارگی سے کہا۔ ”میں ہوں۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟“ لیکن مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ وہ سب بدستور مجھے بدگمانی سے دیکھتے رہے۔

فضا مسموم اور آلودہ تھی۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی۔ ہوا میں تیل اور بارود کی وہی بو تھی جو مجھے مسلسل محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ بو ہر جگہ تھی۔ زمین کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق میں اور مغرب میں، شمال میں اور جنوب میں، میدانوں میں اور گھاٹیوں میں، رگزاروں میں اور کوہساروں پر، یہ بو ہر جگہ موجود تھی۔ لگتا تھا، یہ بو اب زمینی آب و ہوا کا مستقل جز بن چکی ہے۔ میں نے چند ایک بار ناک سکوڑ کر اس بو کو سونگھا اور پھر معاً چونکا۔ ارے یہ کیا ہے؟..... اس فضا اور ہوا میں یہ خون کی بو کیسی ہے؟..... ہاں، خون کی بو۔ وہی ترش اور تیز بو جو تازہ تازہ کٹے ہوئے حلقوم سے اُلتے خون سے اُٹھتی ہے اور فضا میں پھیل جاتی ہے۔

آخر کیا بات ہے؟ کیا میری حس شامہ میں کچھ نقص ہو گیا ہے یا میری ناک کچھ زیادہ ہی اور غلط طور پر حساس ہو گئی ہے؟..... میں جہاں بھی جاتا ہوں، تیل اور بارود کے ساتھ ساتھ اکثر خون کی بو بھی محسوس ہوتی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ اور اگر یہ میرا وہم نہیں بلکہ یہ بو واقعی موجود ہے، تب تو یہ بڑی پریشان کن اور الم ناک بات ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اس دنیا کی فضا اور ہوا کبھی بھی بالکل صاف و شفاف، مفرح، صحت افزا اور نیر آلودہ نہیں رہی، کچھ نہ کچھ کثافت اس میں ضرور رہی ہے۔ مثلاً اس میں فرقے اور

ذات پات کے زہر کی ملاوٹ ہمیشہ رہی ہے۔ نفرت اور تعصب کی کثافت سے بھی کبھی یہ پاک نہیں رہی۔ پھر اس میں جہالت اور توہم پرستی کے کریہہ اور غلیظ جراثیم بھی پلتے رہے ہیں۔ مذہبی جنون اور رنگ و نسل کا رنگ بھی اس میں شامل رہا ہے۔ یہ سب آلودگیاں کیا کچھ کم تھیں کہ اب اس میں تیل، بارود اور خون کی بو بھل اور ہلاکت خیز بو بھی شامل ہو گئی ہے۔ آخر آدمی..... بے چارہ آدمی، بے کس و مجبور آدمی اب سانس کیسے لے گا؟

میں قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ کچھ اس طرح کہ میں وہاں تھا، پھر بھی نہیں تھا۔ ہاں، یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ہم ایک جگہ ہوتے ہیں، پھر بھی وہاں نہیں ہوتے۔ اور کبھی جہاں نہیں ہوتے، وہاں موجود ہوتے ہیں۔ تو میں وہاں نہیں تھا، پھر بھی تھا۔ اور وہاں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا۔ اور میرا وجود، میرے جسم کا صدیوں پرانا پنجر ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ میری بوڑھی اور کمزور آنکھیں زمین کے چپے چپے کو نور سے دیکھ رہی تھیں اور قدموں کے وہ نشان تلاش کر رہی تھیں جو ان راستوں پر میں نے برسوں پہلے چھوڑے تھے لیکن ہر گزرتے لمحے، ایک احساس زیاں مجھے گھیر رہا تھا کیونکہ میرے قدموں کے نشان بس کہیں کہیں تھے۔ اور وہ بھی بہت دھندلے پڑ گئے تھے۔ اتنے مدہم کہ انہیں پہچاننے میں مجھے دشواری پیش آرہی تھی۔ تاہم غنیمت تھا کہ سارے نشان معدوم نہیں ہوئے تھے۔ کچھ نشان مدہم ہی سہی، موجود تھے۔ میں ان ہی کی نا دیدہ انگلی تھام کر آگے بڑھتا رہا۔

کچھ دیر میں، میں چوراہے پر پہنچ گیا جو شہر کے تقریباً مرکز میں واقع ہے۔ اور صبح سے رات گئے تک بے حد مصروف رہتا ہے۔ اس چوراہے پر دو بڑے فرقوں کی عبادت گاہیں جو بالکل آمنے سامنے ہیں اور ایک دوسرے کو نہایت ادب اور احترام سے دیکھتی رہتی ہیں لیکن یہی بات دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ ہر چند کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے تئیں احترام اور رواداری کا لفظی مظاہرہ کرتے رہتے ہیں لیکن جب عمل کا سہ آتا ہے تو..... شہر کے مرکز میں واقع ہونے کے سبب اس چوراہے پر صبح سے شام تک اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ بچپن میں اکثر ابا کے ساتھ یہاں آتا تھا اور ہجوم دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ تب ابا کہتے تھے کہ شہر کی آبادی کا پانچواں حصہ دن میں کم از کم ایک بار اس چوراہے سے ضرور گزرتا ہے۔ شاید اس کا سبب دونوں عبادت گاہیں ہیں۔ نیز ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس چوراہے کے چاروں کونوں پر مختلف النوع دکانیں ہیں۔ ہوٹل اور چائے خانے ہیں۔ خوانچے اور ریڑھی والوں کی بھی بھرمار رہتی ہے۔ پھر کباب فروش اور چاٹ فروش بھی ہیں اور وہ بھی جو پلاؤ

اور حلیم کی دیکیں لے کر آتے ہیں اور فٹ پاتھ پر اپنی چھوٹی چھوٹی دکانیں سجا کر بیٹھتے ہیں۔ سارا دن چوراہا مختلف آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ اس گونج میں گھنٹیوں کی ٹن ٹن اور ہارن کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں اور شام کے سے تو یہ شور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ کان پڑی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی ہے۔“

میں چوراہے پر پہنچ کر نیم کے گھنے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور حیرت اور تجسس سے اور کچھ توقع بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چونکہ ابھی شام شروع نہیں ہوئی تھی، اس بناء پر خلقت نسبتاً کم تھی۔ میں نے باری باری ذرا شوق سے دونوں عبادت گاہوں کی جانب دیکھا۔ ان کی نظریں بھی میری طرف اُنھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ان کی نظروں میں شناسائی ہوگی، اپنائیت ہوگی اور مسرت، کہ ایک لڑکا جو اُن کے سائے میں پلا بڑھا تھا اور برسوں پہلے ان کے دامن سے بچھڑ کر دور چلا گیا تھا، کچھ وقت کے لئے ہی سہی، واپس آ گیا ہے مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ کوئی شے چنچ کر میرے وجود کے اندر ٹوٹی کیونکہ میں نے دیکھا کہ دونوں عبادت گاہوں کی نظروں سے گرجوئی اور مسرت کا اظہار نہیں ہوا تھا بلکہ ان کی پیشانیوں پر قدرے بے نیازی اور تکلف کا تاثر تھا جیسے وہ مجھے پہچان گئے ہیں لیکن کچھ شک و شبہ بھی ہے۔ یہ کون ہے؟ صورت تو یقیناً کچھ پہچانی سی لگتی ہے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بہرہ دیا ہو۔ بہرہ دیا..... میں نے سہم کر ان سے نظریں چرائیں اور نیم کے پیڑ کی طرف دیکھا۔ پیڑ کی گھنی شاخوں میں کچھ چڑیاں غور چانے میں مصروف تھیں۔ لیکن نہ پیڑ نے مجھے پہچانا اور نہ ہی چڑیوں نے مطلق توجہ کی۔ دفعۃً میری نظر ایک گلہری پر پڑی جو پیڑ کی ایک نچلی شاخ کے عقب سے برآمد ہوئی تھی۔ میں نے اُسے پر اُمید نظروں سے دیکھا۔

”کیا تم بھی مجھے نہیں پہچانتی ہو؟“

گلہری نے ایک لمحے کے لئے رُک کر اک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی۔ اس کا منہ تھوڑا سا کچھ اس طرح کھلا، گویا استہزائی انداز میں مجھ پر ہنسی ہو۔ پھر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی اوپری شاخوں کے درمیان گم ہو گئی۔

تو گویا کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ یا شاید یوں ہے کہ پہچان تو سب گئے ہیں لیکن تکلف برت رہے ہیں۔ شاید کسی بدگمانی میں مبتلا ہیں۔ یا ممکن ہے، انہیں مجھ سے کوئی شکایت ہو۔ مگر تکلف کیوں؟..... شکایت کیسی؟ اور تکلف کا سبب کیا ہو سکتا ہے، یہ کون مجھے بتائے گا؟ میں نے افسردگی سے سوچا اور ایک بار پھر گرد و پیش میں دیکھا۔ اب بھیڑ بھاڑ میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ آ رہے تھے۔ لوگ جا رہے تھے۔ لیکن کسی نے میرے وجود

کو..... خراب و خستہ وجود کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ کسی نے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ اور اگر کسی کی چلتی ہوئی نظر مجھ پر پڑ بھی گئی تو اس میں شناسائی کی کسی رمق کا احساس مجھے نہیں ہوا۔ ایک اور لرزہ خیز خیال نے بھی مجھے ستانا شروع کیا۔ کیا بات ہے؟ لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ پورا چوراہا بھرا ہوا ہے۔ طرح طرح کے لوگ ہیں۔ کالے گورے، خوبصورت بد صورت، خوش لباس اور بد لباس۔ وہ جن کے چہروں پر سورج روشن ہیں۔ اور وہ بھی جن کے چہروں پر رات گہری ہو چکی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسرے کے وجود سے قطعی لاتعلق اور بے خبر ہے۔ جیسے کوئی بھی دوسرے شخص کو پہچانتا نہیں۔ یوں لگتا ہے، گویا ہر شخص اپنی ذات کے خول میں بند ہے اور باہر جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ دوسرے آدمی سے خوفزدہ ہے اور بھروسا کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ کون جانے وہ کب وار کر بیٹھے کہ آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اب شاید اعتبار کا موسم ختم ہوا اور رسم شناسائی کفن پوش ہوئی۔ اور..... اور آدمی شاید اب واقعی تنہا رہ گیا ہے۔

یہ احساس اذیت ناک اور جاں سوز تھا۔ میں کچھ دیر تک ایک المناک رو کو اپنے بدن کی ویران گلیوں میں دوڑتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔ پھر میں نے دونوں ستونوں کو حرکت دی اور ایک بار پھر اپنے بدن کو گھسینا شروع کیا۔



میں اپنے قدموں کے دھندلے نقوش تلاش کرتا ہوا چلتا رہا۔ گرد و پیش سے بے نیاز، اپنے آپ سے بے خبر، اپنے آپ میں گم۔ مگر خود اپنی ہی اُننگی تھا مے ہوئے۔ ان مقامات پر گیا جہاں میرے نقوش پا مجھے لے گئے۔ پھر دفعۃً میں چونکا۔ حیران ہوا۔ ارے یہ کیا ہے؟ یہ..... یہ تو میرا گھر ہے۔ کیا واقعی؟..... شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میرا گھر میرے سامنے تھا۔ وہ گھر جہاں میں نے بے شمار شب و روز گزارے تھے۔ وہی گھر..... اور میری تمام حیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں اور آنکھیں گھر کے در و دیوار پر جمی ہوئی تھیں اور میرا جسم سر سے پاؤں تک منجمد ہو چکا تھا۔ اس ایک لمحے میں، ایک لمحے کے لئے شاید میں مر گیا تھا۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک خاص لمحے میں، ایک لمحے کے لئے مر جاتے ہیں۔ اور ایسے لمحات زندگی میں ان گنت بار آتے ہیں۔ گویا ہم زندگی میں ان گنت بار مرتے ہیں۔

مگر اب گھر کی شکل و صورت بدل چکی تھی۔

کپھریل کی چھت غائب ہو چکی تھی۔ اُس کی جگہ پختہ چھت تھی اور اس پر ایک کمرہ۔

دروازہ بھی بدل گیا تھا۔ اور اس پر ٹاٹ کا پردہ بھی نہیں تھا۔ یکایک مجھے ایک شدید قلق اور احساسِ زیاں نے گھیر لیا۔ وہ کائی زدہ بھورے کپھریل کہاں گئے؟ اور ٹاٹ کا دریدہ پردہ۔ وہ کپھریل اور پردہ تو میرے بچپن کا ایک انمول جز اور میری یادوں کا لازمی حصہ تھے۔ ان کے بغیر تو شاید میرا بچپن مکمل نہیں ہوتا۔ میرے زادراہ میں سرخ کپھریل اور ٹاٹ کا پردہ بھی تو شامل تھے۔ لیکن وقت نے یہ کیا، کیا کہ میرے زادراہ کا ایک قیمتی حصہ مجھ سے چھین لیا۔ اب تو سفرِ حیات اور بھی دشوار ہو جائے گا۔ میں چند منٹ چھت کے اوپر تعمیر شدہ کمرے اور کتھی دروازے کو دیکھتا رہا، پھر نگاہ پیڑ پر پڑی اور معا مجھے سکون سا محسوس ہوا۔ سب کچھ نہیں چھنا تھا۔ گھر کے آگن میں کم از کم وہ پیڑ موجود تھا۔

میں نے مختا اور چور نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ مگر گلی میں سناٹا تھا۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں چپکے چپکے آگے بڑھا۔ ایک بار پھر دائیں بائیں نظر ڈالی۔ پھر ہاتھ بڑھایا اور گھر کی دیوار کو چھوا۔ انگلیاں دیوار سے چھوئیں تو ایک رو، ایک عجیب، انجانی رو میرے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی۔ ایک ایسا نشاط انگیز لمس مجھے سرشار کر گیا جس میں جان پہچان کی گرمی تھی اور جس سے میں مدت سے محروم تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس لمس کو جس میں شناسائی کی حرارت اور لذت اگرچہ مدہم تھی، مگر موجود تھی، اپنے وجود میں اترتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔ کم از کم میرے گھر نے مجھے پوری طرح فراموش نہیں کیا تھا۔ ”کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“ اچانک میں نے مدہم سی سرسراتی ہوئی آواز سنی۔ اس آواز کے ارتعاش سے پتہ چلتا تھا کہ بہت دور سے، وقت کے طویل فاصلے سے آئی ہے۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹا، گھوم کر اُسے دیکھا۔ وہ لیپ پوسٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

”تم.....“

”ہاں.....“ اُس کی آواز کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔

میرا سارا وجود دوسرے پاؤں تک منجمد ہو گیا اور لمحوں کا سفر منقطع ہو گیا اور میرے ارد گرد ہر شے جامد ہو گئی۔ بالآخر وہ میرے سامنے تھا جس کی جستجو میں، میں برسوں کا سفر طے کر کے واپس آیا تھا۔ میں چند پل کیلئے ساکت و صامت ہو کر اُسے..... اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ خود اپنے روبرو ہونا ایک قیامت خیز تجربہ ہے اور میں اس تجربے سے دوچار تھا۔ خدایا..... خدایا..... خود اپنے مقابل، خود اپنے سامنے ایک عکس کی مانند..... مگر ایک دوسرے سے قطعی مختلف۔ سکتے کی حالت کئی لمحے رہی۔ پھر میں حالتِ خواب سے چونکا۔ زور سے سانس لی۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اپنی آواز سنی۔

”میں تو تمہیں وہاں ڈھونڈ رہا تھا۔ پلیٹ فارم۔ یاد ہے نا، تم بچ پر بیٹھے تھے اور.....“

”اور تم مجھے بچ پر بیٹھا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“ اُس کی آواز میں رنج بھی تھا اور طنز بھی۔

”ہاں..... کیونکہ اماں نے کہا تھا، بس اب چلو گاڑی چھوٹنے والی ہے۔“ میں نے آزدگی سے کہا۔ ”میں سیدھا دیں گیا تھا۔ اسی پلیٹ فارم پر۔ وہاں سب کچھ تقریباً دیا ہی ہے، جیسا اس وقت تھا۔ وہ بچ بھی موجود ہے۔ مگر تم وہاں نہیں تھے۔“

”ہاں۔ کیونکہ آج یکم محرم نہیں ہے۔“ اس نے پہلو بدلا۔

میں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ محرم کی پہلی تاریخ تھی جب تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ اب میں ہر محرم کی پہلی تاریخ کو وہاں جاتا ہوں اور سارا دن وہاں رہتا ہوں اور آتے جاتے مسافروں اور گاڑیوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید تم آؤ۔ مگر.....“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔

میں نے سینے کے اندر کسی شے کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا۔ پہلی محرم۔ یہ بات مجھے کیوں یاد نہیں رہی؟ ہاں، یہی تاریخ تھی جب ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ کیا وقت کی دیمک نے میری یادداشت کو بھی چاٹنا شروع کر دیا ہے؟ ورنہ یہ ستم کیونکر ہوا کہ میں اتنی اہم تاریخ بھول گیا۔ یہ تاریخ بھی تو میرے زاد سفر کا ایک بیش قیمت جز تھی۔ میں نے رنج اور کسی قدر معذرتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اپنی آواز سنی۔

”تو تم ہر پہلی محرم کو وہاں جاتے ہو.....؟“

”ہاں، اور اُس گاڑی کا انتظار کرتا ہوں جو تمہیں لے گئی تھی۔ اس امید پر کہ شاید وہ گاڑی لوٹ آئے۔“ وہ ایک پل کے لئے رُکا، پھر سوال کیا۔ ”کیا گاڑیاں کبھی واپس بھی آتی ہیں؟“

”میں ”جانے“ کے اسرار سے آگاہ نہیں، لہذا کیا کہہ سکتا ہوں؟“ میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

پھر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک بے حد شگفتہ، شاداب، تروتازہ اور روشن نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے منور تھے۔ اس کے بال سیاہ ریشم کی مانند چمکیلے اور ملائم تھے۔ اس کے گالوں پر گلاب کھلے تھے اور اس کا چہرہ اُمیدوں اور اُمنگوں سے فردزاں تھا۔ اور اس پر وہی تابناکی تھی جو ہاتھ بڑھا کر سورج کو مٹھی میں پکڑ لینے کے حوصلے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور سر سے پاؤں تک وہ کسی نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اُس کے سراپے میں ابھی ”دنیا“ نے کوئی ”ملاوٹ“ نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی ”وقت“ نے اُس کے وجود پر شب خون مارا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر یکایک خوش ہوا.....

’یہ میں ہوں۔‘..... یہ خیال میرے ذہن میں فخر کے ساتھ آیا تھا..... ’یہ میں تھا۔‘..... مگر یہ دوسرا خیال تاسف اور شرمندگی اور پچھتاوے سے مملو تھا..... میں نے افسردگی سے پیشانی پر انگلی پھیری۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ چند لمحے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔
 ”کیا پوچھا تھا تم نے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”یہی کہ جب تم نے اس دیوار کو چھوا تھا تو کیسا محسوس ہوا تھا؟“

”دراصل ہم اپنی ذات کے، اپنے وجود کے چھوٹے چھوٹے حصوں سے اکثر نکھڑتے رہتے ہیں۔“ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر دیوار کی جانب دیکھا۔ ”خوشبو، سانس، لمس، آنکھیں، لمحات، ہم یہاں وہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے باقی ماندہ وجود میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ان سے ہمارا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اس گھر میں.....“ میں نے پورے مکان پر ایک نظر ڈالی۔ ”اس گھر میں، میں اپنی ذات کے کئی چھوٹے چھوٹے حصے چھوڑ گیا تھا۔ ابھی جب میں نے دیوار کو ہاتھ لگایا تو اچانک منکشف ہوا کہ میرا وہ لمس جس سے میں برسوں پہلے نکھڑ گیا تھا، دیوار میں موجود ہے۔ اور اس نے مجھے پہچان بھی لیا ہے۔ اور جب اس لمس سے میری انگلیوں کا وصال ہوا تو.....“ میں نے زور سے سانس لی۔ ”میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کیسا محسوس ہوا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ میری سانسیں اب وہ نہیں رہیں، خوشبو وہ نہیں رہی اور لمس بھی وہ نہیں رہا۔ دیوار کو چھوا تو اپنے لمس سے دوبارہ آشنا ہوا، جس سے برسوں سے محروم تھا اور جو بہت مختلف ہے۔ اس لمس میں خوشبو تھی، حرارت تھی اور تازگی اور فرحت تھی۔ اور.....“ میں یکایک پڑمردگی سے سانس لے کر چپ ہو گیا۔

وہ چند لمحے ترس آمیز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔
 ”مگر گھر تو اب بدل گیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے گھر کو دیکھا۔ ”وہ کھیریل کی چھت نہیں ہے۔ وہ ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ نہیں ہے۔ کچھ اور تبدیلیاں بھی ہو گئی ہیں۔ جانتے ہو، ان تبدیلیوں کو دیکھ کر مجھے کیا محسوس ہوا تھا؟“

”کیا محسوس ہوا تھا؟“

”ایک بار میں نے ایک آدمی کو دیکھا تھا۔“ میری آواز میں زیاں کا تاثر تھا۔ ”کسی وجہ سے اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹ دیئے گئے تھے اور ان کی جگہ پلاسٹک اور اسٹیل کے بنے ہوئے مصنوعی ہاتھ اور پیر لگا دیئے گئے تھے۔ ساتھ میں ایک واکنگ اسٹک بھی تھا

دی گئی تھی جس کے سہارے وہ لنگڑا کر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ جب میں نے مکان پر نظر ڈالی تو اچانک محسوس ہوا، میرے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ کر مصنوعی ہاتھ پاؤں لگا دیئے گئے ہوں اور مجھے نیم اپانچ بنا دیا گیا ہو۔ گھر اور آدمی کے وجود میں ایک گہرا علامتی رشتہ ہے۔ گھر آدمی کی تکمیل ہے اور آدمی گھر کے معاشرتی تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ جب گھر میں تبدیلی ہوتی ہے تو دونوں کے درمیان یہ رشتہ کبھی کمزور پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بالکل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گھر تہذیب کی بنیاد ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مگر سب کچھ تو نہیں بدلا ہے۔ بیرونی دیوار موجود ہے۔ اور..... آنگن میں پیڑ بھی ایستادہ ہے۔“

”ہاں۔ اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ پیڑ ابھی تک موجود ہے۔“ میں نے معاقدے خوش ہو کر کہا۔

”یاد ہے، یہ پیڑ تم نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر اس مسکراہٹ میں گرجوشی نہیں تھی۔

”ہاں.....“ میں مزید خوش ہوا اور یاد کے پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ”میں اس وقت شاید دس سال کا تھا۔ ابا پودا لے کر آئے تھے۔ اور میں نے ان کے ساتھ مل کر ان ہاتھوں سے زمین میں گڑھا کھودا تھا۔“ میں نے اس کے ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”اور پودا لگایا تھا۔“

(میرے تصور میں اپنے تینوں بچوں کی شبیہ ابھری)

”اور اب یہ پیڑ بڑا تو ہو گیا ہے، اپنے پورے قد و قامت کو پہنچ گیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مگر کیا بات ہے، درخت میں پتے بہت کم ہیں۔ ساری شاخیں نکلی نظر آتی ہیں۔ نیچے سایہ بھی برائے نام ہی ہوگا۔ اور غالباً اتنا بے فیض کہ کوئی تھکا ہارا آدمی سائے میں بیٹھ کر دو گھنٹی سستا بھی نہیں سکتا۔“

”صرف یہی نہیں، بلکہ اس پیڑ میں پھل پھول بھی نہیں لگتے۔ سارا سال پیڑ بالکل ننگا رہتا ہے۔“

”پھل پھول نہیں لگتے؟“ میں نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”شاید مٹی زرخیز نہیں ہے۔ یا شاید آب و ہوا موافق نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیڑ ہی گھر

والوں سے باغی ہو گیا ہو۔“

میں نے رنج سے پیڑ کو دیکھا اور اپنے دل میں درد کی ایک گہری ٹیس کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔

(ساتھ ہی میرے تصور میں میرے تینوں بچوں کی شبیہ ایک بار پھر ابھری)



گلی کے عقب میں ایک چھوٹا سا گلیارہ تھا جو ایک وسیع و عریض میدان میں نکلتا تھا۔ بچپن میں، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس میدان میں گلی ڈنڈا، گیرٹی اور اکثر فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ میدان کے دو اطراف میں چوٹی جنگلا تھا جبکہ باقی دونوں جانب گھنی جھاڑیوں کی قطار تھی۔ کہیں کہیں چند ایک درخت بھی تھے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گلیارے سے گزر کر میدان میں آئے۔ کنارے پر ٹھہر کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور ایک بار پھر میرے وجود میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔

میدان اب دیا نہیں رہا تھا جیسا میرے بچپن میں تھا۔ گھاس نام کو نہیں تھی۔ زمین بھی ناہموار ہو گئی تھی۔ کوڑا کرکٹ، پتھر، روڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ دو بوڑھی لائیں جھاڑیوں کے پاس بیٹھی جگالی میں مصروف تھیں۔ ایک گدھا میدان کے وسط میں کھڑا تھوٹھنی اٹھائے پُر شکایت نظروں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ میدان کے مشرقی کنارے پر ایستادہ بجلی کے کھمبے پر ایک فائنٹ بیٹھی تھی اور لا اعلقی سے اطراف کے پورے منظر کو اس طرح دیکھ رہی تھی، گویا اس کے لئے پوری دنیا اور دنیا کے تمام مظاہر محض اک حلقہ دام خیال ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

میدان اب چھوٹا بھی ہو گیا تھا۔ کیونکہ میدان کے مغربی حصے میں کچھ مکانات بن گئے تھے۔ جب ہم دونوں چلتے ہوئے میدان کے وسط میں پہنچے تو معاً اُس نے کہا۔

”تہیں یاد ہے، ایک بار تم نے..... میں نے اس میدان میں ایک جگنو پکڑا تھا؟“

”بھول بھی کیسے سکتا ہوں؟“ میں نے گردن جھکا کر سیدھے ہاتھ کی بند مٹھی کو دھیان سے دیکھا۔ ”وہ گہری شام اب بھی مجھے یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ بہت تیرگی تھی اس شام، اتنی کہ کوئی بھی شے صاف صاف بھائی نہیں دیتی تھی۔ تبھی اچانک میں نے..... تم نے اس جگنو کو دیکھا تھا۔ روشن، جگمگ کرتا ہوا۔ وہ جھاڑیوں کے اوپر اُڑ رہا تھا۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے یکایک دوڑا۔ وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی کی طرف اُڑ گیا۔ میں برابر اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اور گو بہت تھک گیا تھا۔ بری طرح ہانپنے لگا تھا مگر ہمت نہیں ہارا۔ بس ایک جتو، ایک لٹن میرے دل میں تھی۔ یہ کہ اس جگنو کو پکڑنا ہے۔ اور آخر

دی گئی تھی جس کے سہارے وہ لنگڑا کر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ جب میں نے مکان پر نظر ڈالی تو اچانک محسوس ہوا، میرے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ کر مصنوعی ہاتھ پاؤں لگا دیئے گئے ہوں اور مجھے نیم اپانچ بنا دیا گیا ہو۔ گھر اور آدمی کے وجود میں ایک گہرا علامتی رشتہ ہے۔ گھر آدمی کی تکمیل ہے اور آدمی گھر کے معاشرتی تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ جب گھر میں تبدیلی ہوتی ہے تو دونوں کے درمیان یہ رشتہ کبھی کمزور پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بالکل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گھر تہذیب کی بنیاد ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مگر سب کچھ تو نہیں بدلا ہے۔ بیرونی دیوار موجود ہے۔ اور..... آنگن میں پیڑ بھی ایستادہ ہے۔“

”ہاں۔ اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ پیڑ ابھی تک موجود ہے۔“ میں نے معاف قدرے خوش ہو کر کہا۔

”یاد ہے، یہ پیڑ تم نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر اس مسکراہٹ میں گرجوٹی نہیں تھی۔

”ہاں.....“ میں مزید خوش ہوا اور یاد کے پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ”میں اس وقت شاید دس سال کا تھا۔ ابا پودا لے کر آئے تھے۔ اور میں نے ان کے ساتھ مل کر ان ہاتھوں سے زمین میں گڑھا کھودا تھا۔“ میں نے اس کے ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”اور پودا لگایا تھا۔“

(میرے تصور میں اپنے تینوں بچوں کی شبیہ ابھری)

”اور اب یہ پیڑ بڑا تو ہو گیا ہے، اپنے پورے قد و قامت کو پہنچ گیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مگر کیا بات ہے، درخت میں پتے بہت کم ہیں۔ ساری شاخیں نکلی نظر آتی ہیں۔ نیچے سایہ بھی برائے نام ہی ہوگا۔ اور غالباً اتنا بے فیض کہ کوئی تھکا ہارا آدمی سائے میں بیٹھ کر دو گھنٹی سستا بھی نہیں سکتا۔“

”صرف یہی نہیں، بلکہ اس پیڑ میں پھل پھول بھی نہیں لگتے۔ سارا سال پیڑ بالکل تنگا رہتا ہے۔“

”پھل پھول نہیں لگتے؟“ میں نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”شاید مٹی زرخیز نہیں ہے۔ یا شاید آب و ہوا موافق نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیڑ ہی گھر

والوں سے باغی ہو گیا ہو۔“

میں نے رنج سے پیڑ کو دیکھا اور اپنے دل میں درد کی ایک گہری ٹیس کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔

(ساتھ ہی میرے تصور میں میرے تینوں بچوں کی شبیہ ایک بار پھر ابھری)



گلی کے عقب میں ایک چھوٹا سا گلیارہ تھا جو ایک وسیع و عریض میدان میں نکلتا تھا۔ بچپن میں، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس میدان میں گلی ڈنڈا، گیزری اور اکثر فٹ بال لہیا کرتا تھا۔ میدان کے دو اطراف میں چوبی جنگلا تھا جبکہ باقی دونوں جانب گھنی بھاڑیوں کی قطار تھی۔ کہیں کہیں چند ایک درخت بھی تھے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گلیارے سے گزر کر میدان میں آئے۔ کنارے پر ٹھہر کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور ایک بار پھر میرے وجود میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔

میدان اب ویسا نہیں رہا تھا جیسا میرے بچپن میں تھا۔ گھاس نام کو نہیں تھی۔ زمین بھی ناہموار ہو گئی تھی۔ کوڑا کرکٹ، پتھر، روڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ دو بوڑھی گائیں جھاڑیوں کے پاس بیٹھی جگالی میں مصروف تھیں۔ ایک گدھا میدان کے وسط میں کھڑا تھوٹھی اٹھائے پر شکایت نظروں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ میدان کے مشرقی کنارے پر ایستادہ بجلی کے کھمبے پر ایک فاختہ بیٹھی تھی اور لائق سے اطراف کے پورے منظر کو اس طرح دیکھ رہی تھی، گویا اس کے لئے پوری دنیا اور دنیا کے تمام مظاہر محض اک حلقہ دام خیال ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

میدان اب چھوٹا بھی ہو گیا تھا۔ کیونکہ میدان کے مغربی حصے میں کچھ مکانات بن گئے تھے۔ جب ہم دونوں چلتے ہوئے میدان کے وسط میں پہنچے تو معا اُس نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے، ایک بار تم نے..... میں نے اس میدان میں ایک جگنو پکڑا تھا؟“

”بھول بھی کیسے سکتا ہوں؟“ میں نے گردن جھکا کر سیدھے ہاتھ کی بند مٹھی کو دھیان سے دیکھا۔ ”وہ گہری شام اب بھی مجھے یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ بہت تیرگی تھی اس شام، اتنی کہ کوئی بھی شے صاف صاف بھائی نہیں دیتی تھی۔ تبھی اچانک میں نے..... تم نے اس جگنو کو دیکھا تھا۔ روشن، جگمگ کرتا ہوا۔ وہ جھاڑیوں کے اوپر اڑ رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے کے لئے یکایک دوڑا۔ وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی کی طرف اڑ گیا۔ میں برابر اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اور گو بہت تھک گیا تھا۔ بری طرح ہانپنے لگا تھا مگر ہمت نہیں ہارا۔ بس ایک جستجو، ایک نلن میرے دل میں تھی۔ یہ کہ اس جگنو کو پکڑنا ہے۔ اور آخر

کار میں نے اسے پکڑ لیا تھا۔“

”بہت محنت کی تھی تم نے اسے پکڑنے کے لئے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور قدم آگے بڑھایا۔ ”جگنو جو روشنی پھیلاتے ہیں، آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔“

”مجھے جگنو بہت اچھے لگتے تھے۔“ اس نے میرے قدم سے قدم ملایا۔

”جگنو کسے اچھے نہیں لگتے؟“ میں نے پیروں کی میسا کھی گھسیٹنے کا عمل جاری رکھا۔

”جگنو روشنی کی علامت ہیں۔ اور جب اندھیرا دبیز ہو اور بے کنار ہو تو راستہ دیکھنے کے لئے جگنو کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔“

”لیکن.....“ اس کے لہجے میں افسردگی عود کر آئی۔ ”اب جگنوؤں کا بڑا کال پڑ گیا ہے۔ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔“

میں چپ رہا۔ حالانکہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے میں جگنو بہت کم ہو گئے ہیں۔ بس کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مگر اب ان کی روشنی بھی اتنی درخشاں نہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ تبھی تو دنیا میں اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ لیکن میں چپ رہا۔ ڈر لگا کہ کہیں اس نے پوچھ لیا کہ جگنوؤں کو کیا ہوا ہے؟ کہاں چلے گئے ہیں وہ؟ میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا جواب خود مجھے خوفزدہ کرے گا۔



جب ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو سورج شاید تھک کر یا شاید بیزار ہو کر مغرب کی افق کی گود میں سر رکھ کر اور آنکھیں موند کر جا سویا تھا۔ مگر ابھی روشنی پوری طرح ماند نہیں پڑی تھی۔ میں نے ایک قبر کے پائنتی کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ قبرستان کی اونچی نیچی زمین پر قبریں ہی قبریں کھدی ہوئی ہیں اور ہر طرف ایک گہری سوگوار دیرانی تھی۔ ایک ماتم کنناں خاموشی اور سناٹا تھا۔ قبریں، نئی، پرانی، شہر سکوت۔ اس چہار دیواری میں فنا کو ثبات..... دائمی ثبات حاصل ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اور ایک بار پھر گرد و پیش میں دیکھا۔ کتنی انوکھی، خیر خیز اور حیرت انگیز بات ہے۔ یہ سارے لوگ جو ان قبروں میں محو استراحت ہیں، کبھی اس دھرتی پر موجود تھے، چلتے پھرتے تھے، ہنستے بولتے تھے۔ نفرتیں کرتے تھے اور محبتیں کرتے ہیں اور زندگی کی جھنجھٹوں سے جو جھٹتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے زندگی گزاری ہوگی، کچھ کو زندگی نے گزارا ہوگا۔ مگر یہ سب اب نہیں ہیں۔ چلے گئے اس دنیا سے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ سارا ماتم بھام، ساری محبتیں اور نفرتیں اور سارے

اپنے پرانے۔ مگر کہاں گئے ہوں گے یہ سب؟ اور کس حال میں ہوں گے؟ کون بتائے گا؟
معا میرے دل میں ایک انوکھی خواہش ابھری۔ کاش ان میں سے کوئی اپنی قبر سے اٹھ کر آ
جائے، میرے پاس بیٹھے اور مجھ سے باتیں کرے۔ میرے دکھ سکھ سنے اور اپنا حال دل
سنائے۔ اور ان سب کے بارے میں بتائے جو دوسری دنیا میں ہیں۔ کیسے ہیں وہ لوگ۔
اور..... میری اماں کیسی ہیں؟

اماں.....!

میں نے اماں کی قبر کو دیکھا۔ قبر پر کچھ خشک پتے، کچھ ٹہنیاں اور چند ایک کنکر بکھرے
ہوئے تھے۔ میں قبر کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ ہولے ہولے قبر کو صاف کیا۔ پھر اُس کی
طرف دیکھا۔

”اماں کی قبر پر کتبہ نہیں ہے؟“

”ہاں، کیونکہ انہوں نے منع کر دیا تھا۔“ اُس کی آواز سے افسردگی جھانک رہی تھی۔

”مجھے اماں کی موت کا بے حد رنج ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔

”تم جب دور دیس کو سدھار گئے تو اماں واپس آ گئی تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”آخری
وقت میں انہوں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔ جانے سے پہلے صرف ایک بار اور تمہیں دیکھنا
چاہتی تھیں۔ آخری بار.....“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے زخمی آواز میں کہا۔ ”سب مائیں آخری وقت میں اپنے

بچوں کو دیکھنا چاہتی ہیں۔“

پھر میں نے پشیمان نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی اور
برہمی۔ اور وہ مجھے برگشتہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ نظریں ملیں تو اس نے معاً منہ پھیر لیا۔
جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور جھٹکے سے دور پھینکا۔ اُس کے اس عمل سے بھی اس کی برہمی کا
اظہار ہو رہا تھا۔ میں یکا یک بے حد خفیف ہوا۔ کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے وہ
ملا تھا، کچھ اکھڑا اکھڑا اور ناخوش نظر آ رہا تھا۔ اُس نے کسی مسرت، کسی وارفتگی اور گرم جوشی
کا اظہار نہیں کیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہرگز نہیں تھا اور
شاید اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ بیٹے دنوں کی انگلی تھام کر میں اچانک واپس آ
جاؤں گا اور کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اس کی دنیا کا سکون برباد کر دوں گا۔

مگر کیوں؟..... وہ برہم کیوں ہے؟ کوئی تو سبب ہونا چاہئے۔ میں نے اُس کے
ذہن میں اترنے، اس کے احساس کو کریدنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اُس نے اپنے
ذہن کے سارے روزن مضبوطی سے بند کر لئے تھے۔ اس طرح کہ میں کوشش کے باوجود

اس کے اندر جھانک نہیں سکا۔ تب میں نے سہمی ہوئی دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور دم بہ دم ماند پڑتے اُجالے میں اپنی آواز کی مرعشہ گونج سنی۔

”ایک بات پوچھوں.....؟“

اُس نے سوالیہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے لگتا ہے۔“ میں نے سوچ سمجھ کر ایک ایک لفظ کا انتخاب کیا۔ ”تمہیں شاید میرا آنا اچھا نہیں لگا ہے۔ تم کچھ برگشتہ سے نظر آتے ہو۔ حالانکہ میں نصف صدی کے بعد پلٹ کر آیا ہوں۔“

”کیا تمہارے خیال میں مجھے خوش ہونا چاہئے تھا؟“ اس نے تیکھی آواز میں سوال کیا۔
 ”ہاں..... میرا ایسا ہی خیال تھا۔“ مجھے اپنی آواز میں ایک غیر فطری تاثر کا احساس ہوا۔ ”کیونکہ تم بہر حال میرا بیٹا ہوا“ ”کل“ ہو۔ اور میں تمہارا آنے والا ”کل“ نہیں، موجودہ ”آج“ ہوں۔“

وہ معاذور سے چونکا۔ خشکی نظروں سے مجھے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر یکایک طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تم سے ملنے کی خواہش تو مجھے تھی۔ کون اپنے آپ سے ملنا نہیں چاہتا؟ خاص طور پر اس صورت میں کہ درمیان میں پچاس سال کا فاصلہ ہو۔ تم بے شک میرا نصف صدی قبل کا آنے والا ”کل“ ہو۔ اور اب یہ ”کل“، ”آج“ کی صورت میں میرے سامنے ہے۔ لیکن میرے لئے اس میں مسرت کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”کیوں.....؟“ میں نے لرز کر پوچھا۔

اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خفگی اور کشاکش کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ جواب دے یا نہ دے۔ پھر سر کو ہولے سے جنبش دی جیسے کچھ طے کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ پھر تلخ اور تند لہجے میں بولا۔

”یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں تھی کہ میرا آنے والا ”کل“ ایسا ہو گا۔ ذرا دیکھو اپنے آپ کو۔ غور سے دیکھو۔ تم کیا ہو؟ کچھ بھی نہیں۔ تمہاری ذات میں کہیں کوئی ”اثبات“ نہیں، صرف ”نفی“ ہے۔ تم ایک ہارے ہوئے، ٹوٹے ہوئے، بے نام، بے وقعت اور بے قیمت آدمی نظر آتے ہو۔ تمہارا جسم جھریوں سے اٹا ہوا ہے۔ سر کے بال اڑ گئے ہیں۔ تمہاری کمر میں خم ہے اور تمہاری ٹانگوں میں لرزش۔ تم مکمل طور پر ایک شکست خوردہ آدمی ہو۔ اور تمہیں دیکھنا اور تم سے ملنا میرے لئے کسی صورت نہ وجہ مسرت ہے اور نہ باعث

فخر۔ تم کو..... تم کو نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”نہیں آنا چاہئے تھا؟“ میں نے شینا کر کہا۔

”ہاں۔“ اس نے افسردگی سے سر کو جنبش دی۔ ”یاد کرو، جب تم گئے تھے تو میں نے کیا کیا کچھ نہیں تمہارے حوالے کیا تھا۔ ایک ایسی دنیا تمہیں سوچی تھی جو زیادہ بہتر تھی۔ اس وقت زیادہ روشن سورج نکلتا تھا۔ فضا زیادہ صاف ستھری تھی۔ ہوا زیادہ فرحت افزا تھی۔ زیادہ خوشنما، خوش رنگ اور معطر پھول کھلتے تھے۔ اور آدمی کو سانس لینے میں اندیشے نہیں گھیرتے تھے۔ اور گو یہ ٹھیک ہے کہ وہ دنیا پوری طرح مکمل اور بے نقص نہیں تھی۔ مگر بہر حال جینے کے قابل زیادہ تھی۔ اور ایسی دنیا میں نے تمہارے حوالے کی تھی۔ تم مجھے چھوڑ کر اور خدا حافظ کہہ گئے تھے۔ یاد ہے نا؟ مگر میں نے ملال نہیں کیا تھا۔ اس اُمید پر کہ ایک دن تم آؤ گے تو تمہارے ہاتھوں میں میرے لئے خوب صورت سوغاتیں ہوں گی۔ پھول اور خوشبو اور رنگ اور میرے خوابوں کی تعبیر۔ مگر کیا، کیا تم نے؟ ذرا دیکھو چاروں طرف۔ اب اس دنیا میں بے یقینی اور اگلے پل کے اندیشے زیادہ ہیں۔ فضا مسموم ہے۔ خوف اتنا ہے کہ تم ہاتھ سے چھو کر محسوس کر سکتے ہو۔ ہوا میں دھواں ہے۔ زہریلا دھواں اور بارود کی بو۔ اور..... اور خون کی کراہت آمیز بو بھی۔“

”خون کی بو بھی.....؟“ میں نے سہم کر کہا۔

”ہاں.....“ اُس کی آواز میں ترشی تھی۔ ”یہاں، وہاں، مشرق میں، مغرب میں، ہر جگہ یہ بو پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہ بو اس معصوم، مظلوم اور بے گناہ خون سے اُٹھ رہی ہے جو تم نے..... تم لوگوں نے ہوسِ اقتدار میں، لالچ میں، برتری کے شوقِ اظہار میں، مذہبی نفرت اور تعصب اور جنون میں بہایا ہے۔ اور اب بھی بہا رہے ہو۔“

”تم لوگوں نے.....؟“ میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”ہاں.....“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”تم اکیلے ہی تو نہیں ہو۔ اور بھی بے شمار ہیں۔ جو تمہاری طرح اپنے گزرے ”کل“ کے ”میں“ سے رخصت ہوئے تھے۔ خوابوں اور اُمیدوں کی امانت لے کر۔ لیکن.....“ اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر مجھے تاسف آمیز نظروں سے گھورا۔ ”لیکن افسوس یہ ہے کہ اب تم کو..... تم لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔“

میں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ کہتا بھی کیا۔

اُس نے حقارت بھرے لہجے میں مزید کہا۔ ”تو میں نے ایک درختاں کل کے خواب تمہیں سوئے تھے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ تم ان خوابوں کی عر دی تعبیر تلاش کرو گے۔ مگر کیا، کیا تم نے۔ قتل کر دیا ان خوابوں کو۔ اور اب ان کے لاشے یہاں وہاں بے گور و کنفن

بکھرتے ہوئے ہیں اور تعفن پھیلا رہے ہیں۔ اس کے باوجود تم کو توقع تھی کہ میں تم سے مل کر خوش ہوں گا۔ ہنسی آتی ہے تمہاری خوش فہمی پر۔“ وہ تلخی اور استہزاء سے ہنسا۔

”بات یہ ہے کہ.....“ میں نے کہنا چاہا۔ حالانکہ میری آواز احساسِ جرم سے بوجھل تھی۔

”نہیں..... کچھ مت بولو۔ تمہارے پاس صفائی یا معذرت کے لئے ایک لفظ بھی نہیں ہے۔“ اُس نے تند لہجے میں بات کاٹی۔ ”میں نے نہ صرف خواب بلکہ اُمیدیں بھی تمہیں سونپی تھیں اور..... اور محبت۔“

”محبت.....؟“ میں سر سے پیر تک لرز گیا۔

”ہاں۔“ اس نے کبیدگی اور غصے سے جواب دیا۔ ”ہاں محبت۔ تم جانتے ہو میری عمر سولہ سال تھی..... ہے۔ اور وہ مجھ سے صرف دو سال چھوٹی تھی۔ کتنی اچھی تھی وہ۔ من موہنی سی، پیاری سی۔ جیسے صبح دم طلوع ہوتے سورج کی پہلی کرن ہوتی ہے۔ جیسے گلاب کی پتی پر جگمگانی، جھلملاتی شبنم کی بوند ہوتی ہے۔ جیسے ستار کے تار سے نکلنے والا دلگداز اور عشرت آفریں سر ہوتا ہے۔ اور میں اُسے کتنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا میں نے کبھی کسی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کسی اور کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ وہ میری ابتداء تھی اور انتہا تھی۔ اور تم جانتے ہو، جب وہ یہاں سے گئی تھی تو میں کتنا رویا تھا۔ ہر شے حتیٰ کہ اپنی ذات تک بے معنی ہو گئی تھی میرے لئے۔ اس وقت تو وہ ایک نوخیز کلی کی طرح تھی۔“ وہ معازک۔ پرتش نظرؤں سے مجھے گھورا، پھر اضافہ کیا۔ ”تم تو وہیں تھے جب وہ پوری طرح کھلی ہوگی۔ تب کیسی ہوگی۔ کیا مجھے بتاؤ گے؟“

میں نے قبرستان میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ رفتہ رفتہ آسمان سے اترتے سوگوار اندھیرے کو دیکھا اور بے کسی کی دلدل میں اپنے ناتواں دل کو دھنستے ہوئے محسوس کیا۔ کیونکہ اس سے ایک بار پھر مجھ پر منکشف ہوا کہ میں ایک بے حد کنگال آدمی ہوں۔ میرے پاس الفاظ تک نہیں ہیں کہ اسے بتا سکوں کہ جب وہ پوری کھلی تھی تو کیسی تھی۔ اُس کے بال، اُس کی آنکھیں، اُس کی رنگت، اُس کے لب اور لبوں پر شرمائی شرمائی سی ایک مسکراہٹ اور پھر اُس کا سراپا اور اس کا خرام۔ پور پور وہ ایسی تھی کہ ایک بار اُسے دیکھو، جی بھر کر دیکھو اور پھر مر جاؤ تو قطعی افسوس نہیں ہوگا۔ اُس کی ایک پل کی دید حاصل زندگی ٹھہرتی ہے۔ مگر میرے پاس الفاظ تو تھے ہی نہیں۔ لہذا کچھ نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ کھڑا رہا اور پشیمان اُسے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے خود ہی سکوت توڑا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ بہت حسین ہو گئی ہو

گی۔ اتنی کہ اس جیسی اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوگی۔“
میں نے اثبات میں سرکوبنش دی۔

”لیکن تم اسے میرے لئے حاصل نہیں کر سکتے؟“ اس نے معاً غصے سے کہا۔

میرے جسم کا کھنڈر ایک بار پھر بری طرح کانپا۔ دونوں ٹانگوں کے ستون اس طرح لرزے کہ مجھے قریبی قبر کے سنگی کتبے کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے چند الفاظ نے جس زلزلے سے مجھے دوچار کیا تھا، اس سے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر میں نے اس مجرم کی طرح اس کی طرف دیکھا جو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور جس کے پاس اقبال جرم اور اظہارِ پشیمانی کے سوا کچھ نہ ہو۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کوشش کی تھی۔ لاکھوں جتن کئے تھے اُسے پانے کے لئے۔ تمہارے لئے..... اپنے لئے..... میں اُسے بہت چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم اسے بہت چاہتے تھے۔ تمہارے لئے اُسے حاصل کرنا میرا مقصدِ زندگی تھا۔ کیونکہ میں تمہیں دکھی اور ملول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں شب و روز اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس کی راہ میں پھول ہی نہیں، اپنا دل بھی بچھاتا تھا۔ مگر میری تپیا رازِ گلاں گئی۔ ہمارے درمیان طبقاتی فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس لئے.....“
میں یکا یک چپ ہو گیا۔

”طبقاتی فاصلہ؟“ اُس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”ہاں..... تم جانتے ہو نا، انسانی معاشرہ بنا ہوا ہے۔ رسم و رواج، ذات پات، مذہب اور فرقے وغیرہ۔“

وہ چپ رہا اور کچھ دیر بے مقصد انداز میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ میرے جواب پر تبصرہ کرنے کی ضرورت اُس نے شاید نہیں سمجھی کہ جو کچھ میں نے کہا تھا، غلط نہیں کہا تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد اس نے پھر گردن گھمائی اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ پھر بولا۔
”کیا..... کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی؟“ اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”ہاں.....“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میرا گمان ہے کہ وہ بھی مجھے..... تمہیں چاہتی تھی۔“

”کیا بہت زیادہ؟“

”ہاں، شاید بہت محبت کرتی تھی۔“

”کیا اس نے کبھی اعتراف نہیں کیا تھا؟“

میں نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا مگر چپ رہا۔

وہ یکا یک جھکا، ایک پتھر اٹھا کر زور سے اندھیرے میں پھینکا۔ ”اور پھر بھی تم اسے میرے لئے حاصل نہیں کر سکتے۔“ اس کی آواز میں غصے کی تپش بھی تھی اور افسردگی بھی۔ ”پھر غالباً اس کی شادی ہو گئی ہوگی۔“

”ہاں۔“ میری آواز کسی اندھے کنوئیں سے آئی۔

”اب بھی تم اسے دیکھتے ہو؟..... ملتے ہو اس سے؟“ اس کا اشتیاق پھر عود کر آیا۔ ”کبھی کبھار سامنا ہو جاتا ہے۔“ میں نے ایسی آواز میں کہا جس میں ٹوٹے ہوئے تار کی بازگشت تھی۔ ”اب وہ ایک خوبصورت اور پُر شکوہ کوٹھی میں رہتی ہے۔ تین بچے ہیں۔ اب وہ بھی گھر بار والے ہو چکے ہیں۔ اسے دنیا کی ہر آسائش، ہر مسرت حاصل ہے۔ اور..... اور وہ اب بھی اتنی ہی حسین ہے۔ بلکہ اب تو اور بھی باوقار ہو گئی ہے۔“

وہ کچھ دیر دل گرفتہ نظیروں سے خلاء میں گھورتا رہا، پھر پڑمردگی سے کہنے لگا۔ ”میں نے ایک اُمید بھی تمہیں سونپی تھی۔ جانتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک خلیج ہے۔ اور میری آرزو تھی کہ..... کہ اس خلیج کو طے کرنے کے لئے تم ایک نپل بناؤ۔ مگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔“

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مجرمانہ احساس کے بوجھ سے گردن جھکالی۔ کیونکہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ایک اپانج اور بے قیمت لفظ تک نہیں تھا۔ میں اُس کی عدالت میں کھڑا تھا اور اُس نے الزام لگایا تھا کہ میں نے اُس کی وہ بیش بہا پونجی جو اُمید، خواب اور محبت پر مشتمل تھی، اور جو اُس نے بڑی توقعات کے ساتھ میرے سپرد کی تھی، ضائع کر دی تھی۔ اس کے الزام میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک ایک لفظ سچ تھا۔ اور سچ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کی توقعات پوری نہیں کی تھیں اور واقعی اس کا مجرم تھا۔ اور چونکہ مجرم تھا لہذا چپ رہنے کے سوا اور کیا کرتا۔

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر لب کھولے۔ ”تمہیں دیکھتا ہوں تو ترس آتا ہے تم پر اور ہنسی بھی۔ میں نے اُمیدیں، خواب، محبت اور آنے والا کل تمہیں سونپا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم نہ صرف محبت کی بازی جیتو گے اور میرا ”کل“ سنوارو گے بلکہ ہمارے گزرے ”کل“ والوں نے جو غلطیاں کی تھیں اور جن کا خمیازہ ”آج“ والوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے، تم انہیں بھی سدھا رو گے۔ مگر تم تو ہر محاذ پر ہار گئے۔ اور اب اتنے بے آسرا، ہزیمت زدہ اور بے قیمت ہو گئے کہ تمہیں دیکھ کر شرم آتی ہے۔ ذرا دیکھو مجھے اور ذرا دیکھو اپنے آپ کو۔“ اُس نے انگلی سے پہلے اپنی طرف، پھر میری جانب اشارہ کیا۔ ”کیا میرا ”کل“ ایسا ہی ہوتا تھا؟“ وہ استہزائی انداز میں مسکرایا۔ ”پھر بھی تم یہاں آئے ہو۔ اس خوش گمانی

کے ساتھ کہ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔ نہیں، مجھے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ اور تمہیں بھی یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ.....“ وہ یکا یک چپ ہو گیا۔
 ”کیونکہ.....؟“ میں سہی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو، میں نے سب کچھ تمہیں سوپ دیا تھا۔“ اُس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔
 ”اس کے بعد میرے پاس کیا رہا تھا۔ صرف خوش فہمی، خود فریبی اور ایک بھرم رہ گیا تھا۔ اور یہ زاد راہ بھی کچھ ایسا کم نہیں۔ سفر کی دھوپ میں سائباں بننے کی اہلیت اس میں ہے۔ چنانچہ میں خوش فہمی اور خود فریبی کے بھرم میں خوش تھا۔ لیکن تم نے یہاں آ کر اور اس حال میں میرے سامنے آ کر مجھ سے یہ پوچھی بھی چھین لی اور مجھے بالکل ہی کنگال کر دیا۔“ وہ ایک پل کے لئے رُکا پھر بولا۔ ”تم نے مجھے بہت زیادہ مایوس کیا ہے۔“

”میں..... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“ میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ مگر میری آواز اتنی مدہم تھی کہ اس نے نہیں سنی۔

وہ چند لمحے مجھے درشت اور حقارت آمیز نظروں سے گھورتا رہا، پھر یکا یک گھوما اور بغیر مزید کچھ کہے آگے بڑھنے لگا۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا گیا۔ اندھیرا اب چاروں اور خاصا پھیل چکا تھا۔ وہ قبروں کے درمیان آگے بڑھتا گیا اور پھر یکا یک اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

میں نے معاذ زور سے سانس لی۔ ”نہیں، میں نے سب کچھ نہیں گنویا ہے۔“ میں نے مدہم آواز میں خود کلامی کی۔ ”کم از کم وہ جگنو اب بھی میرے پاس ہے جو روشنی کی علامت ہے۔ اور جسے میں نے اندھیرے کے جنگل میں پکڑا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے ہاتھ اٹھایا اور بندھشی کو دھیان سے، اُمید بھری نظروں سے دیکھا۔



‘یا’

برکت علی جب مسجد کے دروازے پر پہنچے تو صبح کا اُجالا رفتہ رفتہ پھیل رہا تھا۔ مدہم ہوا چل رہی تھی اور فضا میں خفیف سی مگر خوشگوار خنکی تھی۔ برکت علی نے پہلے پائیدان پر قدم رکھا۔ غیر ارادی طور پر ان کی گردن اُپر اُٹھی۔ انہوں نے دوسرا قدم اٹھایا مگر پھر یکلخت شپٹا کر رک گئے۔

حالانکہ اس وقت تک مسجد میں کئی نمازی آچکے تھے مگر شاید کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ یا اگر کسی کی نظر اُٹھی بھی ہوگی تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا ہوگا۔ برکت علی کو بھی پہلی نظر میں خیال نہیں آیا تھا۔ بس محسوس ہوا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو معمول کے خلاف ہے۔ ایک کمی کا احساس ہوا تھا۔ پھر جوں ہی ان کی آنکھوں نے محرابی دروازے کے دونوں جانب کا توجہ سے جائزہ لیا تو پوری بات ان پر واضح ہو گئی اور ان کے قدم یوں جم کر رہ گئے جیسے زمین میں پیوست ہو گئے ہوں۔

یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں، واقعی دیکھ رہے ہیں۔ ابھی وہ اُجھن اور تذبذب میں گرفتار چپ کھڑے اوپر دیکھ ہی رہے تھے کہ عقب سے آواز آئی۔

”ارے بھئی برکت علی! کیا بات ہے؟ رک کیوں گئے؟“

برکت علی نے گھوم کر دیکھا۔ منشی معین الدین اور حمید اللہ لپکتے ہوئے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے باقر تھا۔ کچھ فاصلے پر دو افراد اور بھی تھے جن کو برکت علی اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ منشی معین اور حمید اللہ قریب پہنچے تو برکت علی نے کہا۔

”ذرا اوپر دیکھئے۔“

انہوں نے سر اوپر اٹھایا۔ باقر نے بھی تقلید کی۔ بلند محرابی دروازے کے اوپر اور دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ان کی نظر اوپر نیلے آسمان پر بھٹکی مگر انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ حمید اللہ نے پریشانی سے کہا۔ ”کیا بات ہے بھائی برکت؟ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”اور آپ کو.....؟“ برکت علی نے منشی معین سے پوچھا۔
 ”بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟“ منشی معین نے
 بے بسی سے کہا۔

”ذرا اللہ اور محمدؐ کے پاک ناموں پر غور کیجئے۔ کل شام تک ان ناموں کے ساتھ ’یا‘ کا
 لفظ بھی موجود تھا۔“ برکت علی نے رنج اور تلخی سے جواب دیا۔
 اس اثنا میں وہاں چند اور افراد بھی جمع ہو گئے تھے۔ برکت علی کی آواز ان سب کے
 کانوں سے ٹکرائی تو نظریں ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھیں۔ پھر کئی افراد کی زبان سے ایک
 شدید اچنبھے کے عالم میں بے ساختہ نکلا۔
 ”ارے.....“

”خدا کی پناہ، یہ کیا ہوا؟“

دس بارہ افراد جو اس وقت تک وہاں جمع ہو گئے تھے، سکتے کی حالت میں کھڑے تھے۔
 ان کی گردنیں اٹھی ہوئی تھیں اور آنکھیں پلک جھپکائے بغیر دروازے کے دونوں جانب
 گردش کر رہی تھیں جہاں نہایت خوبصورت اور دلنشین خط میں ’اللہ‘ اور ’محمدؐ‘ کے نام درج
 تھے۔ گزشتہ شام تک ان ناموں کے ساتھ ’یا‘ کا لفظ بھی موجود تھا۔ یعنی ’یا اللہ‘ اور ’یا محمدؐ‘۔ مگر
 اب ’یا‘ غائب ہو چکا تھا اور صرف ’اللہ‘ اور ’محمدؐ‘ باقی تھا۔ کسی نے ’یا‘ پر سفیدی پھیر دی تھی۔
 چونکہ مسجد میں سفیدی ہوئے کئی سال ہو گئے تھے اور سفید رنگ مدہم پڑ گیا تھا اس بناء پر ’یا‘
 پر پھیری گئی سفیدی زیادہ نمایاں اور روشن تھی اور صاف نظر آرہی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ
 وہ سفیدی گزشتہ چند گھنٹے کے دوران میں ہی کی گئی تھی۔ غالباً رات کے دوسرے یا تیسرے
 پہر میں۔ جب سڑکوں پر تاریکی اور سناٹا تھا اور کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ تبھی کسی نے اس
 دلازار اور شرارت آمیز حرکت کا ارتکاب کیا تھا۔ مگر کیوں؟
 یکایک عبدالنفار نے کہا۔ ”بھئی کل تک تو موجود تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔ مغرب کی
 نماز کے بعد۔“

”یقیناً موجود تھا۔“ متین حلوائی نے اونچی آواز میں کہا۔ ”سفیدی کا نشان صاف بتا رہا
 ہے کہ یہ حرکت رات میں کسی وقت کی گئی ہے۔“

”اللہ اپنا رحم کرے۔“ قربان میاں نے جو علاقے کے بزرگ تھے، غمگین آواز میں
 کہا۔ ”ہم لوگ روز بہ روز پستی میں گرتے جا رہے ہیں۔ ستر سال کی عمر ہوئی میری، گزشتہ
 تیس سال سے تو اس مسجد میں آ رہا ہوں لیکن آج تک کوئی ایسی بات دیکھنے میں تو کیا سننے
 میں بھی نہیں آئی۔ مگر اب دیکھئے.....“ انہوں نے رک کر ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ دن بھی

دیکھنا تھا۔ شاید اب اس دنیا کا وقت پورا ہو چکا۔“
 ”آپ ٹھیک کہتے ہیں قربان چچا!“ کسی اور نے لب کھولے۔ ”قرب قیامت کی نشانی ہے یہ۔“ لوگوں میں اب مسجد کا احترام بھی باقی نہیں رہا۔
 ”اور نہ ہی خوفِ خدا۔“ کسی اور کی افسوس بھری آواز سنائی دی۔
 ”مگر سوال یہ ہے کہ آخر کس نے یہ بے حرمتی کی ہے؟“ حمید اللہ نے تجسس کے ساتھ کہا۔ ”یہ مسجد ہے، خدا کا گھر۔ کچھ تو اس کے تقدس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔“
 ”جو بھی اس فعلِ قبیح کا مرتکب ہوا ہے، جہنم کی آگ میں جلے گا۔“ کسی اور نے اونچی اور غم و غصے سے بھری آواز میں کہا۔

”حضرات! یہ معاملہ بہت افسوس ناک اور سنگین ہے..... اس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔ نہ صرف یہ جاننا ہوگا کہ کون ہے اس شرمناک حرکت کے پیچھے بلکہ یہ بھی کہ اس کا مقصد کیا ہے؟“ یہ بات منشی معین الدین نے کہی۔ ”لیکن ابھی آپ حضرات مسجد میں تشریف لے چلیں۔ نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ پہلے عبادت سے فارغ ہو لیا جائے پھر اس مسئلے پر گفتگو ہوگی۔“

لیکن اس دن کی نماز سکون اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ادا نہیں ہو سکی۔ نمازیوں کو اس روحانی آسوگی اور دلی طمانیت اور انبساط کا احساس نہیں ہوا، جس کا تجربہ وہ عموماً ہر نماز اور خصوصاً نمازِ فجر کے بعد کرتے تھے۔ دلوں پر ایک بوجھ تھا اور ذہنوں میں غم و غصہ۔ رکوع اور سجدے میں بھی نمازیوں کا دھیان بار بار مسجد کے کشادہ محرابی دروازے کی طرف جا رہا تھا اور اللہ اور محمدؐ کے روح پرور نام تصور میں ابھر رہے تھے جن کے ساتھ ’یا‘ موجود نہیں تھا۔ ہر ذہن سوچ میں غلطاں تھا۔ کس نے یا کن لوگوں نے اس شر پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور کیوں؟ مقصد کیا ہے؟ یہ تو طے ہے کہ یہ محض شرارت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مقصد ہے۔ ارتکاب کرنے والے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ تاہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ کہ ’یا‘ بدعت ہے؟ اگر یہی مقصد ہے ان کا، تو اپنے نکتہ نظر کے اظہار کا یہ طریقہ نہایت غیر مناسب اور غیر محترم ہے۔ اختلافات اپنی جگہ، لیکن مساجد کا تقدس بہر حال مجروح نہیں ہونا چاہئے۔

نماز کے بعد کچھ افراد جنہیں اپنی ملازمت پر جانا تھا یا کوئی اور مجبوری درپیش تھی، بادل ناخواستہ چلے گئے۔ باقی افراد مسجد کے درمیانی صحن میں براجمان ہوئے۔ معاملہ اہم تھا اور اس پر غور و خوض اشد ضروری۔ یہ سوچنا تھا کہ اس اقدام کے پیچھے کس کا یا کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ ان کی نیت کیا ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی طے کرنا تھا کہ آئندہ کے لئے کیا لائحہ عمل

اختیار کیا جائے تاکہ اس شریعت پرستی کا اعادہ نہ ہو سکے۔

پیش امام مولانا اسلام الدین جو قرب و جوار میں اپنی دینداری، خدا ترسی، نیک نفسی اور صلح کل طبیعت کے باعث بہت قابل احترام سمجھے جاتے تھے، کچھ دیر غور کرتے رہے پھر انہوں نے افسردہ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا۔

”نہایت رنج کی بات ہے صاحبان!“

”یقیناً ہے۔“ علی احمد کریم نے مرچنٹ نے کہا۔ ”بھلا کوئی بھی شخص ایسی نازیبا حرکت کیسے کر سکتا ہے؟ کچھ تو اللہ کا خوف ہونا چاہئے۔“

مولانا اسلام الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”باور کرنا مشکل ہے کہ کوئی مسلمان ایسا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ ہماری ذہنی اور اخلاقی پستی کا ثبوت ہے۔ نہ ہمارے ایمان سلامت ہیں اور نہ ہی دلوں میں خدا کا کوئی ڈر باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ہم ہر شعبے میں پسماندگی کا شکار ہیں۔ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک..... جہاں بھی ہماری نظر جاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان زبوں حالی اور انتشار میں مبتلا ہیں۔ ہم چاہیں تو با آسانی ”غیروں“ کو اس زوال اور انحطاط کا ذمے دار ٹھہرا سکتے ہیں اور بے شک ”وہ“ لوگ کافی حد تک ذمے دار بھی ہیں۔ لیکن کلی طور پر نہیں۔ ہماری پسماندگی کا ایک بڑا سبب خود ہمارا کردار بھی ہے۔ دینی لحاظ سے ہم درجوں اور خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے درپے آزار رہتے ہیں اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو انجانے میں دین کو بھی نشانہ بنا لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے، یہ حرکت جو حد درجہ افسوس ناک اور باعث شرم ہے، جن لوگوں نے بھی کی ہے، وہ دراصل ہمیں تکلیف پہنچانا چاہتے تھے۔ مگر وہ یہ بھول گئے کہ ان کا براہ راست نشانہ ہم لوگ نہیں بلکہ مسجد ہے۔ مسجد، خانہ خدا۔“

”آپ ٹھیک فرماتے ہیں مولانا صاحب!“ شفیق کھترے نے کہا۔ ”مگر سوال یہ ہے کہ اس شریعت پرستی کے پیچھے آخر کس کا ہاتھ ہے؟“

”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ حرکت ان ہی لوگوں کی ہے۔“ باقر نے غصے سے کہا۔

”تمہارا مطلب پہلی مسجد والوں سے ہے؟“ متین حلوائی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ باقر نے زور سے مکا فرش پر مارا۔

”مگر بھئی ہم یہ بات یقین سے تو نہیں کہہ سکتے۔“ برکت علی نے اعتراض کیا۔

”ہمارے پاس کیا ثبوت ہے؟“

”ثبوت کی ضرورت بھی کیا ہے؟“ سمیع اللہ نے کہا۔ جو مسجد ہی کی ایک دکان میں

سبزی ترکاری بیچتا تھا اور پانچوں نمازیں باقاعدہ جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ ”ہم سب جانتے ہیں کہ ان کا عقیدہ کیا ہے۔ ‘یا’ کے مخالف ہیں وہ لوگ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ لوگ آئے دن چیخڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ یاد ہے آپ کو، دو ماہ قبل جو اجتماع ہوا تھا ان کے یہاں، اس میں کیسی کیسی دلازار باتیں کہی گئی تھیں ہمارے بارے میں۔“

”ہاں خیر، یہ تو ہے۔“ حمید اللہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

جس مسجد کا یہ ذکر تھا، وہ عرف عام میں کونے والی مسجد کہلاتی تھی۔ کیونکہ چوراہے پر واقع تھی۔ اس مسجد سے کوئی ڈھائی تین سو قدم کے فاصلے پر ایک اور مسجد تھی جس کی عرفیت پہلی مسجد تھی۔ اور وجہ تسمیہ اس نام کی یہ تھی کہ برسوں پہلے جب وہ مسجد تعمیر ہوئی تھی تو اس پر اندر باہر زرد رنگ و روغن ہوا تھا۔ چنانچہ خود بخود پہلی مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اب ہر چند کہ برسوں گزر چکے تھے اور مسجد کے در و دیوار کارنگ زرد سے آسمانی اور پھر سفید ہو گیا تھا اس کے باوجود وہ اب بھی پہلی مسجد کے نام ہی سے مشہور و مذکور تھی۔ گو دونوں مسجدیں بہر حال خانہ خدا تھیں اور دونوں ہی مسجدوں میں ایک ہی قرآن کی تلاوت ہوتی تھی، ایک ہی رسول کی ثنا کی جاتی تھی اور ایک ہی اللہ کے آگے سر جھکایا جاتا تھا اور دونوں مسجد میں صبح و شام ادا کی جانے والی نماز میں بھی زیر، زیر تک کا فرق نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں مسجدوں کے درمیان ایک غیر مرئی خلیج حائل تھی۔ نظریے اور عقیدے کی خلیج۔ ایک مسجد ‘یا’ کی قائل تھی، دوسری مخالف۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی کہ ‘یا’ کی موجودگی یا عدم موجودگی دین کی حرمت و حقانیت کے لئے ضروری یا غیر ضروری نہیں تھی۔ تاہم مشکل یہ تھی کہ دو مساجد کے درمیان چیقلش کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ کونے والی مسجد میں وعظ ہوتے یا اجتماعات کا انعقاد ہوتا تو پہلی مسجد والوں کے ایمان و عقائد کی خامیاں بیان کی جاتیں۔ پہلی مسجد میں اجتماع ہوتا تو کونے والی مسجد کے پیروکاروں کے نظریات پر شب خون مارا جاتا۔ دونوں ہی مساجد کے ماننے والے اس بات پر پورا ایمان و ایقان رکھتے تھے کہ وہ صحیح ہیں، دوسرے غلط ہیں۔ حالانکہ دونوں ہی مساجد کے پیروکار اپنے موقف کی تائید میں کوئی قطعی اور ناقابل تنسیخ دلیل پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے اپنے محاذوں پر ڈٹے رہتے تھے اور اکثر و بیشتر الفاظ کے تیر و تفنگ کی بارش کرتے رہتے تھے۔ ماضی میں چند ایک بار ایسی کوششیں بھی کی گئی تھیں کہ دونوں مساجد کے ماننے والے معاندانہ اور مخاصمانہ طرز عمل ترک کر کے امن و آشتی کا رویہ اپنائیں اور ایک دوسرے کی دلازاری سے پرہیز کریں۔ کہا گیا کہ ایک مسجد کے پیروکار ‘یا’ سے خوش ہیں تو دوسرے کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح دوسری مسجد کے نمازی ‘یا’ کی

موجودگی غیر ضروری خیال کرتے ہیں تو بے شک 'یا' کا استعمال نہ کریں۔ دونوں کو تحمل، رواداری اور تسلیم کی خوش کام لینا چاہئے۔ لیکن ایسی تمام کوششیں بے سود رہیں اور نتیجہ وہی نکلا جس کے لئے ڈھاک کے تین پات کا محاورہ مشہور ہے۔

مولانا اسلام الدین نے ہاتھ اٹھا کر حاضرین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”جوش میں آنا مناسب نہیں۔ ہمیں ہوش اور صبر سے اس معاملے پر غور کرنا ہوگا۔ 'یا' کو قلم زد کرنے سے اشارہ تو بلاشبہ انہی کی طرف جاتا ہے لیکن یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ کسی نے اس حرکت کا ارتکاب کرنے والے یا والوں کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر انہیں الزام دینا مناسب نہیں۔ میں اس مسجد کے پیش امام صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ بھی واقف ہیں۔ وہ ایک نہایت شریف النفس اور دیندار آدمی ہیں۔ انکسار اور رواداری بہت زیادہ ہے ان میں۔ اسی طرح مسجد میں آنے والے اکثر بزرگ اور کمیٹی کے ممبران بھی ذمے دار لوگ ہیں۔ وہ اس نوعیت کی دل شکن اور شرانگیز حرکات میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا، ان کی لاعلمی میں ہوا ہے۔“

”لیکن.....“ متین حلوائی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ٹھہریں، پہلے مجھے اپنی بات پوری کرنے دیں۔“ مولانا اسلام الدین نے متین حلوائی کو روک دیا۔ ”ابھی ابھی میاں سمیع اللہ نے کہا تھا کہ دو ماہ قبل ہونے والے ان کے اجتماع میں ہمارے متعلق خاصی نازیبا باتیں کہی گئی ہیں۔ بے شک یہ درست ہے۔ لیکن کیا تصویر کا صرف یہی ایک رخ ہے؟ نہیں، آپ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہر چند کہ دین کے معاملے میں، میں بہت محتاط رہتا ہوں۔ اور یہی بات ان کے پیش امام صاحب کے بارے میں بھی بلا خوف و تردد کہی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ہونے والے اجتماعات میں بھی ان کے بارے میں خاصا دلازار رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجاتی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مولانا صاحب! مگر ہم ایسی کوئی حرکت تو نہیں کرتے۔“ متین حلوائی نے غصے سے کہا اور ہاتھ سے صدر دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور یہ واقعی افسوس ناک بات ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟“ منشی معین نے جواب تک خاموش تھے، گفتگو میں حصہ لیا۔ ”یقیناً یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم خاموش رہیں اور تماشا بننے رہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ یہ حرکت تو گویا ہمارے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے۔“

”ہاں، ہم بھی چپ تو نہیں بیٹھ سکتے۔ ورنہ ان کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے۔“
 ”میں تو کہتا ہوں، اس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔“ باقر نے غصے سے کہا۔
 کئی سوالیہ نظریں باقر کی جانب اٹھیں۔

”یہ کہ ہم ان کے پاس جائیں۔“ باقر پُر جوش لہجے میں بولا۔ ”ان سے گفتگو کریں اور واضح کر دیں کہ اگر انہوں نے شرانگیزی بند نہیں کی تو پھر ہم بھی چپ نہیں رہیں گے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“

”لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ کام انہی لوگوں کا ہے۔“
 ”ثبوت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ حرکت ان ہی کے کسی آدمی کی ہے۔“ شفیق کھترے نے جھلا کر کہا۔

”پھر بھی، اگر انہوں نے انکار کیا تو؟“
 ”تو کیا؟ کم از کم انہیں تنبیہ تو ہو جائے گی۔“ باقر نے پُر جوش آواز میں کہا۔ ”اگر اس حرکت کا ذمے دار انہی کی طرف کا کوئی آدمی ہے تو وہ یقیناً دوبارہ ایسا قدم نہیں اٹھائے گا۔“
 ”مگر بھی.....“

پھر بحث شروع ہو گئی۔ چند افراد جوش میں بھرے ہوئے تھے اور سخت جوابی کارروائی کے حق میں تھے۔ جبکہ کچھ لوگ نرم اور مصلحانہ لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مسئلہ اہم ہے اور بے شک ہماری دلآزاری کا سبب بنا ہے۔ لیکن ہمیں معاملے کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دو تین افراد ایسے بھی تھے جو جوش اور غصے میں تھے اور ان کا انداز فکر جارحانہ تھا۔ لیکن بحث کا اختتام بہر حال مولانا اسلام الدین کے حتمی الفاظ پر ہوا۔ انہوں نے کہا۔

”ہم جوش کا نہیں، ہوش اور رواداری کا مظاہرہ کریں گے۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے بات بگڑے اور جھگڑے، فساد کی راہ ہموار ہو۔ ہم ان کے پاس نہیں جائیں گے اور کوئی کارروائی نہیں کریں گے بلکہ صبر و تحمل سے کام لیں گے۔ اور.....“
 ”لیکن مولانا صاحب! اگر اس حرکت کا پھر سے اعادہ کیا گیا تو؟“ متین حلوائی نے اعتراض کیا۔

”مناسب یہ ہو گا.....“ مولانا صاحب نے کہا۔ ”کہ آپ میں سے کچھ حضرات یہ ذمے داری اپنے سر لے لیں کہ رات میں نگرانی کریں۔ جن لوگوں نے یہ دل شکنی کی حرکت کی ہے، قیاس کہتا ہے کہ وہ پھر آئیں گے۔ ایک بار انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے

تو یہ معاملہ کسی فساد کے بغیر طے ہو جائے گا۔“

کم از کم باقر، متین حلوائی اور شفیق کھتر مولانا صاحب کی رائے سے متفق نہیں تھے لیکن مجبور تھے۔ مولانا صاحب کی قابل احترام شخصیت کے سامنے سر اٹھانے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔ چنانچہ بادل ناخواستہ انہیں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ دن کا باقی حصہ تھوڑی بہت تفتیش میں گزرا، لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی، شاید کسی کو کہیں سے کوئی بھٹک ملی ہو۔ یا کسی نے رات میں کسی شخص کو مشکوک حالت میں مسجد کے آس پاس منڈلاتے دیکھا ہو لیکن مکمل ناکامی ہوئی۔ کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ جس شخص یا جن اشخاص نے 'یا' پر سفیدی پھیرنے کا کام انجام دیا تھا، انہوں نے پوری رازداری بھی برتی تھی اور مکمل احتیاط بھی کی تھی۔ وہ رات کے کسی ایسے حصے میں آئے تھے جب سڑک پر تاریکی اور سنائے کا راج تھا۔ انہیں کسی نے آتے یا جاتے نہیں دیکھا اور وہ اپنا کام کر کے غائب ہو گئے۔

پھر پولیس میں اطلاع دی گئی مگر وہاں سے کسی حوصلہ افزا رد عمل کا اظہار نہیں ہوا۔ مقامی تھانے کے انچارج نے کہا کہ محض شک کی بنیاد پر وہ پہلی مسجد کے ذمے دار افراد سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ اسی وقت قدم اٹھائے گا جب کوئی چشم دید گواہ اور ٹھوس ثبوت موجود ہو۔

”یہ صرف 'یا' کا مسئلہ ہے۔ بہتر ہے آپ لوگ خود ہی اسے طے کر لیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”قانون کو کیوں زحمت دے رہے ہیں؟“

سعید احمد نے جو مسجد کمیٹی کے خزانچی تھے، متین حلوائی کی مدد سے ایک پینٹر کا بندوبست کیا اور سہ پہر ہوتے ہوئے اللہ اور محمدؐ کے ساتھ 'یا' دوبارہ نہایت خوشنما خط میں لکھ دیا گیا۔ پہرے داری اور نگرانی کے لئے متین حلوائی، باقر، شفیق کھترے اور غلام احمد کا انتخاب ہوا۔ غلام احمد کا مکان مسجد کے عین سامنے تھا۔ نیچے دکان تھی، اوپر رہائش۔ اس نے کہا کہ چونکہ وہ بہت کم سوتا ہے لہذا اپنے مکان کے چبھے پر موجود رہے گا اور ساری رات مسجد کے دروازے پر نظر رکھے گا۔ متین حلوائی نے راتیں، جب تک ضرورت پڑے، اپنی دکان ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جبکہ باقر اور شفیق کھترے نے طے کیا کہ باری باری آدھی آدھی سڑک پر موجود رہیں گے۔

چھ سات دن گزر گئے۔ پہرے داری میں نہایت مستعدی کا مظاہرہ کیا گیا۔ خاص طور پر غلام احمد اور متین حلوائی نے قطعاً غفلت نہیں برتی۔ شب کا اندھیرا اور سناتا پھیلنے کے بعد ہر آنے جانے والے پر گہری نظر رکھتے اور پوچھ گچھ کرتے۔ وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ رات گئے اس سڑک پر اسے آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ لیکن نتیجہ

وہی نکلا جس کے لئے ڈھاک کے تین پات کا مقولہ مشہور ہے۔ یعنی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جس شخص یا جن افراد نے 'یا' پر سفیدی پھیری تھی، غالباً بلکہ شاید یقیناً صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر پکڑے گئے تو بری ٹھہرے گی۔ لہذا انہوں نے مسجد کا رخ نہیں کیا۔

اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملی کہ شرارت کرنے والوں کا تعلق شہر کے کسی اور حصے سے نہیں بلکہ اسی علاقے سے تھا۔ اور یہ کہ وہ کسی نہ کسی طور پہلی مسجد سے ہی متعلق تھے۔ نیز صبح و شام اس علاقے میں موجود تھے اور کونے والی مسجد میں ہونے والی احتیاطی تدابیر سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پھر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

چند دن مزید سکون اور امن سے گزر گئے۔ دھیرے دھیرے یہ یقین کر لیا گیا کہ شرارتی افراد کا شوق پورا ہو گیا۔ اب وہ اسے دہرائیں گے نہیں۔ چنانچہ نگرانی میں رفتہ رفتہ کمی ہو گئی۔ متین حلوائی پھر رات اپنے گھر گزارنے لگا۔ شفیق کھترے اور باقر نے بھی پہرے داری ختم کر دی اور غلام احمد بھی رات میں تین چار گھنٹے کی نیند لینے لگا۔

لیکن چند ایک افراد کو عادت سی پڑ گئی تھی کہ فجر کے وقت مسجد کی طرف لپکتے تو نگاہ خود بخود دروازے کے بالائی حصے کی جانب اٹھ جاتی اور 'یا' کا لفظ موجود نظر آتا تو خود بخود دل کو سکون سا محسوس ہوتا۔ دروازے پر صبح بلکہ دن میں کئی بار نظر ڈالنے والوں میں متین حلوائی بھی شامل تھا۔ مگر ایک صبح جب وہ چوراہے پر پہنچ کر مسجد کی طرف گھوما تو یہ دیکھ کر شپٹا گیا کہ دروازے کے دائیں بائیں اللہ اور محمدؐ کے پاک اور مبارک نام تو موجود تھے مگر 'یا' پھر غائب ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر میننگ شروع ہوئی۔

”یہ سب ہماری خاموشی اور کمزوری کا نتیجہ ہے۔“ باقر نے کہا۔ اس کی آواز میں رنج، جھنجھلاہٹ اور غصے کا ملا جلا تاثر تھا۔

”اگر ہم نے اسی وقت کوئی قدم اٹھایا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔“ غلام احمد نے تائید کی۔

”ہاں بھئی..... شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری خاموشی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔“

حمید اللہ نے کہا۔

”آپ لوگ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ.....“ آخر کار مولانا سلام الدین نے زبان کھولی۔ ”ہمیں ان کے پاس جانا چاہئے تھا اور ان سے بات کرنی چاہئے تھی۔ یہی مقصد ہے نا آپ لوگوں کا؟“

”ہاں۔“ متین حلوائی نے آواز کو بلند ہونے سے روکا۔ کیونکہ وہ مولانا سلام الدین کا

بہت احترام کرتا تھا۔ ”اگر ہم ان کے پاس جاتے اور وارننگ دے دیتے تو.....“
 ”مگر آپ لوگ کس بنیاد پر ان کے پاس جاتے؟“ مولانا اسلام الدین کی آواز میں
 قدرے ترشی در آئی۔ ”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ آپ نے کس کو رنگے ہاتھوں پکڑا
 ہے؟ کوئی گواہ تلاش کیا ہے آپ نے؟ اگر نہیں تو کیا کہتے ہیں آپ ان سے؟ بغیر کسی ثبوت یا
 گواہ کے کوئی قدم اٹھانا دانش مندی کے خلاف ہے۔ اس سے تنازعہ پیدا ہوگا اور بڑھے گا
 اور بات جھگڑے فساد تک پہنچ جائے گی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں کے حق
 میں نہیں ہوں۔“

”تو پھر کیا، کیا جائے؟“ منشی معین نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔
 مولانا اسلام الدین نے نرمی اور رسائیت سے کہا۔ ”ہم صبر و تحمل سے کام لیں گے۔
 جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو، ہم کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے..... میں جانتا ہوں اس
 حرکت سے آپ کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی ہے۔ خود مجھے بھی دکھ ہوا ہے۔ لیکن
 مناسب یہی ہے کہ ہم صبر و برداشت سے کام لیں..... آج مسلمانوں کو پوری دنیا میں
 اور خاص طور پر ہمارے ملک میں رواداری، برداشت اور درگزر کی جتنی ضرورت ہے، شاید
 پہلے کبھی نہیں تھی۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں مولانا صاحب! مگر.....“ باقر نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
 مولانا اسلام الدین نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ ”اگر مان لیا جائے کہ
 اس شرارت کا ارتکاب ان کی طرف سے کیا جا رہا ہے تو بھی جواب دینے کا بہتر طریقہ یہ
 ہے کہ ہم خاموش رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری خاموشی ان کے لئے پشیمانی کا سبب بنے
 گی اور وہ خود ہی اس حرکت کو دہرانے سے اجتناب کریں گے۔“
 ”تو پھر کیا، کیا جائے؟“ سمیع اللہ نے پوچھا۔

”کوئی قدم اٹھانے کی سہولت ضرورت نہیں۔“ مولانا اسلام الدین نے جواب دیا۔
 ”ویسے آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ میں کسی مناسب موقع پر ان کے امام صاحب سے ضرور
 گفتگو کروں گا۔“

متین حلوائی، باقر اور شفیق کھتراجب مسجد سے نکلے تو سخت ناخوش تھے۔ وہ لوگ مولانا
 اسلام الدین کے فیصلے سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بات اب اس منہج
 پر پہنچ چکی ہے کہ خاموش بیٹھنا مناسب نہیں۔ کونے والی مسجد کے عبادت گزاروں کی جو
 توجہ اور دلازاری ہوئی ہے، اس کی تلافی کے لئے مناسب قدم اٹھانا از بس ضروری ہے۔
 ان کا خیال تھا کہ کم از کم سعید احمد کی قیادت میں ایک مختصر وفد کو پہلی مسجد جانا چاہئے اور ان

لوگوں پر واضح کر دینا چاہئے کہ اگر وہ اس شرانگیزی سے باز نہ آئے تو نتائج کی ذمہ داری ہی ان ہی پر عائد ہوگی۔ لیکن مولانا اسلام الدین نے ایک بار پھر ایسے کسی اقدام سے سختی سے منع کر دیا تھا اور وہ لوگ ماسواچپ رہنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

متینوں کچھ بیزار، کچھ جھلائے ہوئے فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔ ان کا رخ متین حلوائی کی دکان کی طرف تھا۔

ایک شفیق کھترے نے کہا۔ ”یار! یہ اپنے مولانا صاحب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نرم مزاج ہیں۔“

”ہاں خیر، یہ تو ہے۔“ متین حلوائی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہر چند کہ وہ غلط نہیں کہتے۔ مگر ہم کب تک چپ رہیں گے۔“

”مجھے تو بھائی! بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“ باقر نے کہا۔

”لیکن ہم لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں؟“

”کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتے ہیں۔“

”کیا؟“

”پتا نہیں۔“ باقر نے بے بسی سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”بس ایسا لگ رہا ہے کہ خاموش بیٹھنا کچھ درست نہیں ہے۔“

شفیق کھترے نے باقر کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔

ایک بار پھر رنگ کا بندوبست ہوا، ایک بار پھر پیئٹر بلایا گیا اور ’یا‘ کا اضافہ کر دیا گیا۔ مگر اس بار نگرانی کے سلسلے میں کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ صرف اتنا ہی ہوا کہ غلام احمد نے اپنے مکان کے چھجے سے رات گئے تک مسجد پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ مولانا اسلام الدین نے کہا تھا، اگر اس بے ہودہ حرکت کو دہرایا گیا تو پھر وہ اس مسئلے کے حل کی کوئی بہتر صورت نکالیں گے۔ اس طرح کہ کوئی تلخی اور تنازعہ پیدا نہ ہو۔

چند دن گزرے۔ سکون سے، امن سے۔ کوئے والی مسجد کے دروازے پر ’یا‘ موجود رہا۔ مگر پھر کیا ہوا کہ ایک صبح، نیم روشن اُجالے میں جب پہلی مسجد کے نمازی مسجد کے دروازے پر پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دروازے کے دونوں جانب نہایت خوشنما حروف میں لکھے اللہ اور محمد کے مبارک ناموں کے ساتھ ’یا‘ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

سب دروازے بند نہیں ہوتے

وہ جون کی ایک نیم گرم اور خوشگوار شام تھی۔

اُجالا ماند پڑ چکا تھا اور دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے پارک اسٹریٹ میں قدم رکھا اور بغیر کسی پس و پیش کے سرخ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک منٹ بعد بانکے نے دروازہ کھولا۔ وہ نیلے رنگ کا سلپنگ سوٹ پہنے تھا اور اسی حالت میں دروازہ کھولنے چلا آیا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر ’ہیلو‘ کہا تو وہ ابھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ قدرے ٹھہر کر میں نے کہا۔

”یار! آج ذرا تنہائی محسوس کر رہا ہوں۔“

”پھر.....؟“ اس نے کہا۔

”شکو ہے.....؟“

وہ مجھے اندھے کنوئیں کی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کھوکھلی آواز میں بولا۔

”آئیے، اندر آ جائیے۔“

شکو کا رنگ سناٹا تھا۔ ناک نقشہ خاصا تیکھا۔ قد قدرے نکلتا ہوا۔ اُسے خوبصورت تو نہیں کہیں گے، ہاں قبول صورت ضرور تھی۔ آنکھیں کشادہ تھیں اور ان میں ہر وقت ایک بے نام سی اُداسی رچی رہتی تھی۔ یہ اُداسی اُس کی مسکراہٹ میں تھی ہر چند کہ اس کی مسکراہٹ خاصی دلکش تھی۔ اس کا جسم چھریا تھا۔ خطوط اور گولائیاں دیکھنے والے کے احساس میں بالکل پیدا کر دیتی تھیں اور کمر کا گہرا خم اس کے بدن میں شاخ گل جیسی چلک پیدا کرتا تھا۔ مگر اس کا اصل حسن اور جاذبیت اس کے بالوں میں پوشیدہ تھی۔ خوب گھنے، سیاہ اور دراز بال تھے جنہیں وہ ایک دبیز چوٹی کی شکل میں، باندھے رکھتی تھی۔ میں نے چند ایک بار اسے بانکے کے ساتھ مارکیٹ میں خریداری کرتے دیکھا تھا اور وہ مجھے اچھی لگی

تھی۔ شاید کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں کو دیکھ کر میں نے اکثر سوچا تھا کہ اچھا ہے، اس عورت نے خوب گداز چوٹی باندھ رکھی ہے۔ اگر کہیں یہ اپنے بالوں کو کھول دے تو کیا ہوگا؟ شاید سارے میں گھٹا چھپ جائے گی اور سارے میں جل تھل ہو جائے گا۔ اور پھر سارے سے خانے ڈوب جائیں گے اور سارے رند مستی میں چور ہو کر مدہوش ہو جائیں گے۔

ایک رات میں شراب خانے میں بیٹھا تھا۔ ابھی دو ہی گلاس پیئے تھے اور خمار دھیرے دھیرے گہرا ہوتا شروع ہی ہوا تھا کہ بار بند ہو گیا اور مزید شراب ملنے کی امید نہ رہی۔ اس میں غلطی میری ہی تھی کہ دیر سے پب میں پہنچا تھا۔ میں نے مایوسی سے پب کی مالکہ مسز ڈیوڈسن کی طرف دیکھا اور آخری گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ مسز ڈیوڈسن سے گزارش کرنا بے سود ہوتا کہ وہ اصولوں کی پابند تھی۔ گلاس خالی کر کے میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور سوچا کہ اب کیا کروں؟ گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں تنہائی ہر سے میری منتظر رہتی تھی۔ پھر کیا کروں؟ کسی ریسٹوران میں چلوں کہ اور شراب وہیں مل سکتی تھی۔ ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ میں نے طے کیا۔ پھر گھوم کر لاؤنج میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ سب جا چکے تھے۔ صرف بانگے بیٹھا تھا اور اُس کے گلاس میں تھوڑی سی بیزر ابھی باقی تھی۔

بانگے سے میری تھوڑی بہت شناسائی تھی۔ چند سال پہلے جب ہم نے کچھ دن ایک فیکٹری میں ساتھ ساتھ کام کیا تھا۔ میں مشینوں پر تھا جبکہ وہ لیبر جاب کرتا تھا۔ چند ماہ بعد اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور وطن چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ماہ بعد واپس آیا تھا تو میں نے ایک بار اور غالباً پہلی بار شٹکو کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ شٹکو کو لینے ہی کی نیت سے وطن گیا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہمارا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ کبھی روڈ پر آتے جاتے، کبھی مارکیٹ میں اور کبھی پب میں۔ بانگے ہمیشہ مجھے خوش دلی سے سلام کرتا اور کبھی کبھار تھوڑی بہت گفتگو۔ اس سے زیادہ ہمارے مراسم نہیں تھے۔

جب میں اس کی میز کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک بار پھر میری نظر اُس کی جانب اٹھی۔ وہ خوش خلقی سے مسکرایا۔ جواب میں، میں نے بھی سر کو جنبش دی۔ اس نے گلاس اٹھاتے اٹھاتے سادگی سے کہا۔

”گھر جائیں گے اب آپ.....؟“

”نہیں۔ پہلے کسی ریسٹورنٹ میں جاؤں گا، اس کے بعد گھر۔“

”تنہا رہتے ہیں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”دل تو بہت گھبراتا ہوگا۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ ایک کش لے کر اعتراضی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر

میرے پاس آ گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”یہی بات ہے نا؟ تنہائی کبھی کبھی بہت پُر عذاب بن جاتی ہے۔“

میں پھر بھی چپ رہا تو وہ مسکرایا۔ بڑی پراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ گردن کو جنبش دے کر سرگوشی میں بولا۔

”صرف شراب کا شوق ہے یا شباب سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟“

میں خاصانٹے میں تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ حیران نہ ہوسکوں۔ آخر بانگے یہ کیا کہہ رہا ہے؟ شباب سے بھلا کسے دلچسپی نہیں ہوتی؟ میں نہ تو کوئی فرشتہ ہوں اور نہ ہی پارسائی کا دعوے دار۔ انسان ہوں، جوان بھی تندرست بھی۔ اور سینے میں ایک عدد دل بھی ہے جو صرف دھڑکتا ہی نہیں، کبھی کبھی مطالبہ بھی کرتا ہے۔ ریشمی ہانہوں کے ہار، سیاہ زلفوں کی گھٹا اور مے خانوں سے آباد بدن کے لئے مچلتا بھی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کا یہ خانہ اب تک بالکل خالی رہا ہے۔ نہ کسی نے مجھے چاہا، نہ کبھی اتنی فرصت ملی کہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوسکوں۔ میری زندگی تو اب تک اُس اُجاڑ اور خشک صحرا کی طرح رہی ہے جس میں بارش کی بوند بھی کبھی نہیں برستی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بانگے نے یہ بات کیوں کہی؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ میں نے تجسس آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس کی مسکراہٹ کچھ اور پراسرار ہو گئی۔ ”کبھی کبھی دل بہلا لیا کریں۔ ورنہ زندگی بالکل بخر ہو جائے گی۔“

میرے ذہن میں ایک بار پھر اچھل پھل ہوئی۔ ”کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟“

”چلیں میرے ساتھ۔“

میں نے پس و پیش کیا۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ یہ کام تو میں نے پہلے کبھی نہیں کیا بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے کا پہلے کبھی کوئی موقع ہی نہیں آیا۔ بے شک بیڑ اور کبھی کبھی دہسکی یا واڈ کا پیتا رہتا ہوں اور اپنی تنہائیوں کو اوڑھ کر سو جاتا ہوں اور مطمئن رہتا ہوں۔ دل چاہا انکار کر دوں۔ مگر پھر ذہن میں ایک نئی رو ابھری۔ تجسس سے بھری ہوئی۔ دیکھنا تو چاہئے کہ جو عورتیں اپنے آپ کو بیچتی ہیں، مسرت اور نشاط انگیز لمحات فروخت کرتی ہیں، وہ کیسی ہوتی ہیں۔ ان کا مزاج، ان کی سوچ، ان کا اخلاق اور رویہ کیسا ہوتا ہے؟ میں فرشتہ تو نہیں ہوں، آخر کو ایک انسان ہی تو ہوں۔ تمام بشری کمزوریاں بہر حال مجھ میں بھی ہیں تو اگر اک ذرا خوشی میں بھی خرید لوں تو اس میں کیا حرج ہے۔ تجسس نے آتش شوق کو ہوا دی۔ اگر نشہ میں نہ ہوتا تو شاید انکار کر دیتا۔ مگر گہرے خمار کی ترنگ نے اُکسایا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو آمادہ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ تجسس بھری نظروں سے بانگے کو

دیکھا۔

”کیسی ہے؟..... تم جانتے ہو اسے؟“

”ہاں، بہت اچھی ہے۔“

”عمر.....؟“

”بالی ہے۔“

”چال.....؟“

”متوالی ہے۔“

”آنکھ.....؟“

”نشلی ہے۔“

”مسکراہٹ.....؟“

”لبیلی ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے..... چلو۔“

ہم دونوں باہر آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کئی سنسان گلیوں سے گزر کر پارکر اسٹریٹ پہنچے۔ بانکے سے میری واقفیت ضرور تھی تاہم اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے جیب سے چابی برآمد کی اور سرخ رنگ کا دروازہ کھولا تو میں تھوڑا سا حیران ہوا۔ آخر وہ مجھے اس گھر میں لے کر کیوں آیا ہے؟ مگر میں چپ رہا۔ ہم نے راہداری طے کی اور لونگ روم میں داخل ہوئے۔ تب میں مزید حیران ہوا بلکہ ایک تذبذب اور الجھن نے گھیر لیا۔ کیونکہ سامنے صوفے پر شکو بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی اُداسی سے مملو مسکراہٹ یوں نمودار ہوئی جیسے خود نہ مسکرائی ہو بلکہ کسی میکانیکی عمل کے تحت خود بخود اس کے ہونٹ کھنچ گئے ہوں۔ میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور شش و پنج کے عالم میں بانکے کی طرف دیکھا۔

”بیٹھیں جناب! تکلف نہ کریں۔“

میں بیٹھ تو گیا لیکن حیرت کا غلبہ بدستور مجھ پر حاوی تھا۔ تذبذب میں گھرا ہوا۔ شک بھری نظروں سے کبھی شکو اور کبھی بانکے کو گھور رہا تھا۔ صورت حال میرے لئے قطعی طور پر بعید از فہم تھی۔ یہ آخر ماجرا کیا ہے؟ یہ..... یہ تو شاید بانکے کی نبوی ہے۔ پھر بانکے یہاں مجھے کیوں لایا ہے؟ میں نے پریشانی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک بار پھر شکو کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ مگر یہ ضرور ہے

کچھ سراپہ اور نروس ہونے کے باوجود نارنجی رنگ کے لباس میں وہ حسب معمول اچھی لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں اُداسی تھی مگر ایک انوکھی سی کشش بھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس نے بالوں کی چوٹی باندھ رکھی تھی ورنہ کمرے میں اتنا اندھیرا ہوتا کہ میں اسے دیکھ بھی نہ سکتا۔ وہ مسکرا رہی تھی ہر چند کہ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی اور شگفتگی کا فقدان تھا بلکہ ایک افسردگی سی تھی، پھر بھی مجھے چاروں طرف شرارے سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید یہ گہرے خمار کا اثر تھا۔ میں چند ایک لمحے چپ رہا پھر گھوم کر استعجابیہ نظروں سے بانکے کی طرف دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں بھئی۔ یہ یہ تو شاید تمہاری؟“

”ارے جناب! اس چکر میں مت پڑیں۔“ بانکا عجلت سے بات کاٹ کر بولا۔ ”اس وقت تو یہ آپ کے ساتھ ہے۔“

پھر اس نے مسکرا کر شکو سے کہا۔ ”میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ تم انہیں اوپر لے جاؤ۔“

”مگر مگر“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”ارے بھئی آپ بہت تکلف کر رہے ہیں۔ جائیں اوپر۔ شکو آپ کو سب کچھ سمجھا دے گی۔“

پھر وہ گھوما اور دروازے پر ایک ٹائیپے کے لئے رک کر اس نے پہلے شکو کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا، ایک آنکھ دہائی اور باہر نکل گیا۔



میرا خیال غلط تھا مگر بالکل غلط بھی نہیں تھا۔ شکو بانکے کی بیوی تھی اور نہیں تھی۔ ان کا رشتہ محض کاغذی تھا۔ یعنی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا تھا کہ شاکرہ بیگم بشیر الدین عرف بانکے کی منکوحہ ہے۔ مگر وہ کاغذ فرضی تھا۔ بانکے نے کچھ رقم دے دلا کر کہیں سے وہ جعلی نکاح نامہ حاصل کر لیا تھا۔ شکو جب اپنے وطن میں تھی تو وہاں بھی ”نشاط فروشی“ ہی کرتی تھی مگر چوری چھپے۔ چند باتوں کا قیاس کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ جسم فروشی کے دھندے میں کیسے پڑی؟ اور یہ کہ یہ کام وہ یہ رضا و رغبت کرتی تھی یا کسی مجبوری کے ہاتھوں اُسے اس راستے پر چلنا پڑا تھا۔ نیز یہ کہ اُس کی باقاعدہ شادی ہوئی تھی یا نہیں۔ ہاں، اتنا میرے علم میں ہے کہ بانکے بھی اسی گلی میں رہتا تھا جس میں شکو کا گھر تھا اور یہ کہ بانکے سے اس کے خاصے گہرے مراسم تھے۔ بانکے ایک غیر ذمے دار اور سطحی مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ باقاعدہ روزی روٹی کمانا اور ایک ذمے دار زندگی گزارنا اس کی سرشت

کے خلاف تھا۔ دوسرے الفاظ میں لا ابالی اور بدقماش تھا۔ چھوٹے موٹے جرائم تو کرتا ہی تھا، ساتھ ہی شراب بھی ادھر ادھر پہنچایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی شوقین فرمائش کر بیٹھتا تو اُسے پکڑ کر شلو کے پاس لے آتا۔

بانکا شلو کے بارے میں کیا سوچتا تھا، یہ قیاس کرنا ذرا دشوار ہے۔ تاہم جہاں تک شلو کا تعلق ہے، وہ بانکے کو پسند کرتی تھی بلکہ شاید محبت بھی کرتی تھی اور ایک دو بار اس نے بانکے سے کہا بھی تھا کہ اگر وہ اس سے شادی کر لے تو وہ ایک شریف اور گھر گرہست عورت کی طرح ساری عمر بانکے کی خدمت کرے گی۔ لیکن بانکے نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

پھر ایک دن بانکے غائب ہو گیا۔

شلو کا خیال تھا کہ یا تو وہ کسی عورت کو نکال لے گیا ہے یا پھر کوئی جرم کر بیٹھا ہے۔ پولیس اور قانون سے بچنے کے لئے روپوش ہو گیا ہے۔ لیکن دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ کوئی پانچ چھ سال بانکے غائب رہا۔ یہی وہ دن تھے جب میری اُس سے ملاقات اور واقفیت ہوئی تھی۔ تقریباً چھ سال بعد جب وہ واپس وطن پہنچا تو اس کا حلیہ ہی بدل ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ پتلون اور چیک کا کوٹ تھا۔ کلائی میں گھڑی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چال میں اتراہٹ۔ شلو اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ دونوں تنہائی میں ملے تو شلو نے حیرت سے کہا۔

”ارے..... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”ذرا انگلینڈ چلا گیا تھا۔“ بانکے نے لا پرواہی سے کہا۔

”انگلینڈ.....؟“

”ہاں..... اب وہیں رہتا ہوں۔“ بانکے نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لئے زکا، پھر

ذرا فاخرانہ لا پرواہی سے کہا۔ ”تم چلو گی انگلینڈ؟“

”تم..... تم مجھے انگلینڈ لے جانا چاہتے ہو؟“ شلو ہکا بکا رہ گئی۔

”ہاں۔“

”مگر میں وہاں کیا کروں گی؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تم یہ طے کرو کہ انگلینڈ چلنا ہے یا نہیں؟“

یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ بانکے کا منشا کیا تھا۔ وہ شلو کو کیوں انگلینڈ لے جانا چاہتا تھا۔ کیا ایسا ہے کہ وہ اپنی بے وقعت زندگی اور اپنے لا ابالی پن سے اکتا گیا تھا اور اب شلو کے ساتھ ایک پرسکون اور گھر گرہست زندگی گزارنے کا خواہاں تھا یا کوئی اور

سبب تھا؟ شاید پہلی بات درست ہو۔ یا ممکن ہے، بانکے کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ پرورش پاتا رہا ہو شکو کے لئے۔ بانکے کے ذہن میں جھانکنا ممکن نہ تھا لیکن بہر حال وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کرے؟ انکار کر دے یا بانکے کی بات مان لے۔ اگر مان لے تو انگلینڈ جائے گی جہاں صاحب اور میم صاحب رہتے ہیں۔ سنا ہے، بہت اچھا اور خوبصورت ملک ہے۔ پیسے کی فراوانی ہے۔ نہ صرف ہر شام چولہا جلنے کی ضمانت موجود ہے بلکہ ان گنت دوسری آسائشیں بھی ہر شخص کو حاصل ہیں۔ اگر وہ انگلینڈ چلی جائے تو نہ صرف اسے ہر رات بکنا نہیں پڑے گا بلکہ یہ جو کئی نفوس اس کی جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ان کے لئے بھی کچھ بہتر کر سکے گی۔ وہ سوچتی رہی اور اُلجھی ہوئی نظروں سے بانکے کو دیکھتی رہی۔

”دو چار روز اور غور کر لو۔“ بانکے نے کہا۔ ”پھر مجھے بتا دینا۔“

”مگر میں جاؤں گی کیسے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”کم از کم مجھے بتاؤ تو۔“

بانکے چند لمبے سوچتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تمہارا پاسپورٹ اپنی بیوی کی حیثیت سے چند ہفتے میں بنوا لوں گا۔“

ایک شعلہ لپکا اور شکو کے دل کو جھلساتا چلا گیا۔ یہ بانکے نے کیا کہا؟ یہی تو وہ بات ہے جو وہ بانکے کی زبان سے سننے کی کب سے منتظر تھی۔ اور جب شکو نے بے شرم بن کر خود ہی زبان کھولی تھی تو بانکے نے توجہ ہی نہیں دی تھی اور شکو سنک سر ہو کر رہ گئی تھی۔ آخر یہ بانکے کیسا آدمی ہے؟ اپنی بیوی بنائے گا، وہ بھی محض دکھاوے کے لئے تاکہ انگلینڈ لے جا سکے۔ مگر کیوں؟..... کیا چاہتا ہے؟ کیا ہے اس کے من میں؟..... ضرور اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد ہے۔ کتنا ذلیل ہے یہ شخص۔ کمینہ، بے حیا۔ شرم نہیں آتی۔ شکو کا دل چاہا، صاف انکار کر دے۔ کہہ دے کہ مجھ سے کھلونے کی طرح کھیلو مت۔ یہ فرضی شادی نہیں چلے گی۔ میں اتنی گری ہوئی اور بے قیمت نہیں ہوں۔ سچ سچ شادی کرو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ مگر پھر سوچ کی رو بدلی۔ کیسے کہہ سکتی ہے وہ یہ سب کچھ؟ اس کی وقعت ہی کیا ہے؟ گردن تک بد اخلاقی کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ اس میں اور بانکے میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں ایک ہی گندگی کے کیڑے ہیں۔ چنانچہ وہ اُبلتے ہوئے جذبات کو دبا گئی اور جلتی ہوئی آنکھ کا آنسو پی گئی۔ اور اس گالی کا گلا دبا دیا جو ہونٹوں پر تقریباً آ ہی گئی تھی اور صرف اتنا کہا۔

”کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں؟“

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ویزے کی پابندیاں اتنی سخت نہیں تھیں، جتنی آج ہیں۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ اور تھوڑی بہت دروغ گوئی سے کام بن جاتا تھا۔ بانکے نے کاغذات تیار کروائے جو سب کے سب جعلی تھے۔ ویزے کی درخواست دی اور پھر کچھ دن ہی بعد شکو انگلینڈ پہنچ گئی۔

نئی دنیا تھی۔ نئے لوگ تھے۔ نیا ماحول تھا۔ شکو انگریزی سے بھی نااہل تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اُسے بڑی پریشانی ہوئی لیکن اس کے حالات نے اُسے موم کی طرح بنا دیا تھا جو ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ شکو نے بھی دھیرے دھیرے اپنے آپ کو نئے ماحول کے مطابق بنا لیا۔ یہ بات بھی اس کے لئے باعث تقویت تھی کہ شہر کے کچھ حصوں میں ہر طرف ایشین ہی دکھائی دیتے تھے۔ یہ جان کر وہ ایک خوشگوار اچنبھے میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اس ملک میں ایشین اتنی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کی اپنی دکانیں ہیں، چائے خانے اور فیکٹریاں ہیں۔ بینکوں اور سرکاری دفاتروں میں بھی ایشین ملازم ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کی گھبراہٹ ختم ہوئی۔ وہ باہر جانے لگی تھی۔ سودا سلف خریدنے یا خط پوسٹ کرنے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ زیادہ تر گھر تک ہی محدود رہتی تھی۔ بلا سبب باہر جانا اسے یوں بھی پسند نہ تھا۔

کئی ماہ گزرے گئے۔ صبح وشام لٹم پٹم گزرے۔ بانکے نے اس سے آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ شکو کے دل میں شک و شبہ تو تھا مگر اس نے سوچا شاید بانکے اس سے پھر اس دلدل میں اترنے کے لئے نہیں کہے گا بلکہ اپنے ساتھ ہی رکھے گا اور شاید زندگی یونہی گزرے گا۔ یہ سوچ کر ایک طرف تو شکو کو اطمینان کا احساس ہوتا، مگر دوسری طرف ایک خلیجان بھی گھیر لیتا۔ کب تک؟ یونہی بغیر شادی کے ساری زندگی ایک ساتھ رہنا تو ٹھیک نہیں۔ اُس کے ضمیر پر بوجھ پڑتا۔ ساتھ ہی ساتھ خوف بھی دامن گیر ہوتا۔ کیونکہ اس طرح ساتھ رہنے میں تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی مگر وہ چپ رہتی۔ مناسب یہی تھا کہ انتظار کرے اور دیکھے کہ آنے والے وقت کی زینیل سے اس کے لئے کیا نکلتا ہے۔

بانکے ایک غیر ذمے دار آدمی تھا۔ کسی ایک جگہ ٹپک کر کام کرنا اور محنت سے روزی روٹی کما کر گھریلو زندگی گزارنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی وہ ساری دلچسپیاں اور سرگرمیاں جو بچھے وطن میں تھیں، اب بھی جاری تھیں۔ یہاں اور چائے خانوں میں اس کا

بیشتر وقت گزرتا تھا۔ تاش بھی کھیلتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ریس کھیلنے کی لت بھی پال لی تھی۔ کبھی مارے باندھے کسی فیکٹری میں ملازمت کرتا بھی تو چند ماہ سے زیادہ نہیں، اس کے بعد پھر سوشل سیکورٹی میں جا کھڑا ہوتا۔ یوں گھر میں پیسے کوڑی کی ہمیشہ پریشانی رہتی تھی مگر پھر بھی شٹو کبھی شکوہ نہ کرتی۔ چپ رہتی اور انتظار کرتی۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ دراصل اس نے مکمل طور پر خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک بار اس نے ڈرتے ڈرتے بانکے سے کہا۔ ”ایسے کب تک چلے گا؟“ بانکے کچھ دیر قبل باہر سے آیا تھا، تھوڑا سا نشے میں تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ تھی اور صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ شٹو کی بات سن کر اس نے ایک زوردار کش لیا، گردن گھما کر نیم سرخ آنکھوں سے شٹو کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“

”بات یہ ہے.....“ شٹو جھجکتے ہوئے بولی۔ ”کہ ہم یوں کب تک ساتھ رہیں گے؟ یہ کچھ اچھی بات تو نہیں۔ تم..... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟“

”تو پھر.....؟“

شٹو کا دل زور سے دھڑکا۔ اعصاب کشیدہ ہوئے، ہونٹ تھر تھرائے۔ مگر جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی، کہنے میں کامیاب ہو گئی۔ ”کیوں نہ ہم شادی کر لیں.....؟“

بانکے یکا یک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر زور سے کش لیا اور مسکرا کر شٹو کی طرف دیکھا۔ ”شٹو!..... میری جان! میں خود بھی کچھ دن سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ مگر شادی والا خیال فی الحال مجھے کچھ چٹا نہیں۔ خواہ مخواہ کا جھنجٹ ہے۔ کیا فرق پڑے گا شادی سے؟ صورت حال تو جوں کی توں ہی رہے گی۔ نہیں، شٹو سویٹ ہارٹ! یہ بات تو سردست اپنے ذہن سے نکال ہی دو۔ آئندہ کبھی دیکھا جائے گا۔ میں تمہیں انگلینڈ لے آیا ہوں۔ منشا یہ تھا کہ تمہارا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ چاہو تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لو۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو۔“ بانکے سوچ کر کہنے لگا۔ ”کچھ لوگوں کی زندگی کی ڈگر قسمت یا وقت متعین کرتے ہیں اور وہ اس ڈگر سے کبھی ہٹ نہیں سکتے۔ ہم دونوں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔ یاد ہے ہم دونوں کی زندگی کیا تھی؟ اور ہم کس ماحول سے آئے ہیں؟“

شٹو نے اُلجھ کر کہا۔ ”مگر تم کچھ کام کاج تو ٹھیک سے کرتے نہیں۔ اوپر سے تمہارے اتنے خرچے ہیں۔ گھوڑوں کی ریس، کتوں کی ریس اور نہ جانے کیا کیا۔ ایسے تو کام نہیں

چلے گا۔“ وہ رُکی، پھر بولی۔ ”کیوں نہ میں کوئی پارٹ ٹائم جاب کر لوں؟“
 بانکے نے گہری معنی خیز نظروں سے شکو کو دیکھا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ پریشانی تو تمہیں
 واقعی ہوگی۔ چنانچہ اگر چاہو تو جزوقتی ملازمت کر لو۔ مگر اس سے کیا ہوگا؟ روپے کا مسئلہ تو
 پھر بھی حل نہ ہوگا۔ ہاں، ایک صورت ہے۔“
 ”کیا.....؟“

”دیکھو شکو! میری جان! میری بات سکون سے اور ٹھنڈے دل سے سنو۔ ہمیں تھوڑے
 نہیں، بہت روپوں کی ضرورت ہے۔ میری اپنی ضروریات ہیں۔ پیچھے تمہاری ماں اور بہن
 بھائی اور دو ایک دوسرے رشتے دار ہیں، انہیں بھی رقم چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہمیں
 ایک بہتر مکان کی ضرورت ہے۔ اگر کچھ عرصے میں ہمارے پاس کافی رقم آجائے تو ہم
 اس منحوس، واہیات اسٹریٹ اور اس بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیں گے اور کہیں بہتر علاقے میں
 چلے جائیں گے۔“ وہ رُکا، پھر مسکرا کر بڑی محبت سے بولا۔ ”اور تب میں وعدہ کرتا ہوں کہ
 تم سے شادی کر لوں گا۔“

”مگر اتنی رقم آئے گی کہاں سے؟“ شکو ابھی تک اُلجھی ہوئی تھی۔
 ”بر سے گا۔ خوب بر سے گا۔ اگر تم چاہو تو.....“ بانکے کے ہونٹوں پر ایک پراسراری
 مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”دیکھو شکو! اس ملک میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو بے چارے
 تنہا ہیں۔ اور.....“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں.....“ شکو سٹپنا کر چپ ہو گئی۔
 بانکے کے ہونٹوں پر وہی کمینی، بے حس اور مکار مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کی شخصیت
 کے اندروں کی عکاس تھی اور شکو نے یہ مسکراہٹ کئی برسوں بعد دیکھی تھی۔ ایک باریگی شکو
 کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نفرت اور غصے سے اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ دل چاہا
 کہ بانکے کے منہ پر تھوک دے اور گھر سے بھاگ جائے۔ مگر جائے گی کہاں؟ کون ہے
 اس ملک میں اس کا؟ وہ تو کسی کو جانتی تک نہیں۔ لاچاری..... لاچاری، بے کسی، بے
 قیمتی..... لمباتی طیش اور کشاکش کا بھنور کچھ دیر میں بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے نفرت آمیز اور
 آتشیں نظروں سے بانکے کو دیکھتی رہی، پھر چپ چاپ اٹھی اور اوپر چلی گئی۔

برسوں پہلے صورت حال آج سے قدرے مختلف تھی۔ اس دیار غیر میں، جہاں رنگ اور
 روشنی ہے، شراب ہے اور جان لیوا تنہائی بھی ہے، بے شمار ایشیائی اپنا گھر بار اور بیوی بچے
 چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ ابھی زیادہ تر لوگوں نے اپنی فیملی یہاں نہیں بلائی تھی اور تنہا ہی
 روزی روزگار کے مسائل سے نمٹ رہے تھے۔ تنہا رہنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جب

جذبات کی طنائیں تن کر چنٹی ہیں اور اکیلا پن آگ بن کر دل و دماغ کو جلاتا ہے.....
ترستی ہوئی خواہشیں کچھ تقاضے کرتی ہیں تو نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی ہیں۔ تاک جھانک کرتی
ہیں۔ بانگے تجربہ کار آدمی تھا۔ انسانی مزاج اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں کو خوب پہچانتا
تھا۔ ساتھ ہی وہ بہت زیرک اور چرب زبان بھی تھا۔ دوستی بڑھانے، ذہنوں کو ٹٹولنے اور
نازک لمحات میں اپنا آٹو سیدھا کرنے کے ہنر سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ ابتدا میں اس
نے ایسے ہی کچھ لوگ وقتاً فوقتاً تلاش کئے اور گھر لے کر آیا۔ پھر اُس نے ہٹکو کو اکسایا کہ
وہ خود ہی ”شکار“ کھیلے۔ طوعاً و کرہاً ہٹکو کو سر جھکانا پڑا۔ وہ باہر نکلتی اور ایشین آبادی والی
سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتی رہتی۔ کبھی کامیابی ہوتی، کبھی خالی ہاتھ واپس آتی۔ بانگے یا تو
گھر میں پڑا رہتا یا پھر پب میں بیئر پیتا رہتا۔

گو ایک خاموش سمجھوتا ہو گیا تھا۔ زیادہ تر بوجھ ہٹکو نے خود ہی اٹھا رکھا تھا۔ مگر ایسا بھی
نہیں ہے کہ بانگے بالکل ہی لائق ہو گیا ہو۔ کبھی کبھار کوئی ایسا شخص مل جاتا جس کے
بارے میں اسے اطمینان ہوتا کہ مطلب کا آدمی ہے اور اس کی جیب بھی دزنی ہے تو
نہایت سلیقے سے اس کی جیب کا دزن کم کرنے کی کوشش کرتا۔
”کچھ شباب سے بھی دلچسپی ہے؟“

ایسے ہی لوگوں میں ’وہ‘ بھی شامل تھا۔ لمبے قد، کھلتے ہوئے رنگ اور سنہری فریم کے
چشمے والا راج۔ وہ ایک اندھیری رات میں ایک روشن جگنو کی طرح آیا تھا اور اپنی یاد کا
ایک روشن عکس چھوڑ گیا تھا۔ ہٹکو کو وہ پہلے ہی دن اچھا لگا تھا۔ سب سے الگ، سب سے
انوکھا۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بے حد خوبصورت باتیں کرتا تھا جیسے مصور کی طرح کسی
تصویر میں رنگ بھر رہا ہو۔ موسیقار کی طرح ستار کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو اور سچ مچ وہ ستار
کے تار ہی چھیڑ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ستار ہٹکو کے دل کا تھا۔ دھیرے دھیرے،
بالکل غیر محسوس طریقے سے دل کے تاروں سے نکلنے والی لے ہٹکو کی روح کو سرشار کرنے
لگی۔ تب ہٹکو ڈری۔ اُس نے اپنے کان بند کر لئے اور جذبات و احساسات کو تھپک تھپک
کر سلا دیا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے دامن حیات میں اتنے شگاف ہیں کہ کوئی بھی
پھول وہاں نکلتا نہیں۔ سب ہی گر جاتے ہیں، گم ہو جاتے ہیں۔

گاہے گاہے ہٹکو سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ راہ چلتے یا پھر مارکیٹ میں۔ اگرچہ وہ اس
کے گھر میں کم ہی گیا مگر راہ چلتے ملاقات ہوتی تو تھوڑی بہت گفتگو کا تبادلہ بھی ہوتا۔ ہٹکو
مجھ سے مانوس ہو گئی تھی۔ شاید کچھ بھروسا بھی کرتی تھی۔ چنانچہ اکثر اپنے دل کا حال
سناتی۔ ہر چند کہ یہ ذکر اس نے کبھی نہیں کیا کہ ہ بانگے کی منکوحہ نہیں ہے۔ مگر اپنے نجی

حالات کا ذکر اس نے ضرور کیا۔ اس کا ماضی، اس کے حالات، پسند ناپسند۔ مگر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ آسودگی سے محروم تھی۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ سفر حیات طے کرنے کے لئے کون سی ڈگر اپنانا چاہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک گم شدہ عورت تھی..... لاشعوری طور پر خود کو جاننے اور پانے کی جستجو میں مبتلا۔ ایسے ہی دنوں میں ایک بار میں نے راج کو شکو کے ساتھ غالباً پہلی بار دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے دل میں راج کے لئے پسندیدگی کا احساس ابھرا تھا۔ وہ واقعی بڑا طرح دار نوجوان تھا۔ لمبا قد۔ چھریا بدن، موٹی موٹی سی کشادہ آنکھیں جن پر سنہری فریم کا چشمہ بھلا لگتا تھا۔ سیاہ گھنگھریالے بال تھے جو گردن تک پہنچتے تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے مارکس اینڈ اپنر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ میرے تجسس کا گھٹیا پن تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا۔ راج نے شکو کے لئے ایک پل اور خریدایا۔ پھر دونوں باہر نکلے اور لائبریری کی طرف چلے گئے۔



راج دراصل نصف ایشیائی تھا۔ کیونکہ اس کی ماں انگلش تھی اور باپ ایشین۔ وہ اپنے نصف وطن میں رہ رہا تھا لیکن باقی نصف وطن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نام کا معاملہ بڑا دلچسپ تھا۔ ماں اُسے راجر لوکیس کہتی تھی اور باپ سراج احمد۔ اس بات پر دونوں میں اکثر جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑتا تھا۔ دونوں میاں بیوی الفاظ کے توپ و تفتنگ سے لیس ہو کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے اور کشتوں کے پشتے لگ جایا کرتے تھے۔ مگر دونوں ہی شکست ماننے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ سراج یا راجر نے دونوں ہی کو خوش رکھنے کے لئے درمیانی راستہ یہ نکالا کہ صرف راج بن کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی مسجد جاتا تھا اور کبھی اتوار کو چرچ میں بھی حاضری دے آیا کرتا تھا۔ ایک بار اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا تھا۔

”دراصل میں نہیں چاہتا کہ مسجد اور چرچ میں کسی قسم کا تنازعہ یا جنگ ہو۔“

صاف ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ اپنے ماں باپ کی طرف تھا۔

مگر پھر اس جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح کہ اس کے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور شوہر کے غم میں کچھ عرصے بعد بیوی نے بھی رختِ سنفر باندھ لیا۔

وہ برطانیہ کی کھر آلود فضاؤں میں پلا بڑھا تھا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک فرم میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک بار بھی اپنے ایشیائی نصف وطن نہیں گیا تھا۔ ایشیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ذہنی، جذباتی، نظریاتی، کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

وہ برطانوی تھا اور اس کا ذہنی تعلق صرف مغرب سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن نے ایشیا کے نظریات اور سماجی و تہذیبی قدروں کا ہلکا سا عکس بھی قبول نہیں کیا تھا۔

کچھ دن تک وہ شکو کے پاس گیا، پھر اچانک اس نے اس سے ملنا بند کر دیا۔ چند دن شکو کو انتظار رہا کہ وہ پھر آئے گا۔ کیونکہ اس کے پاس آنے والے اکثر افراد بار بار یا کبھی کبھار ضرور آتے تھے۔ لیکن راج نہیں آیا۔ حتیٰ کہ شکو مایوس ہو گئی۔

کئی ہفتے بعد ایک ویران سی شام کو وہ اچانک شکو کو مل گیا۔ سڑک کے کنارے، چاروں طرف سناٹا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر چپ چاپ دیکھتے رہے۔ کچھ تذبذب کے ساتھ، کچھ سوالیہ نظروں سے جیسے سوچ رہے ہوں کہ کیا کہیں۔ کچھ دیر یونہی گزری، پھر آخر کار راج نے لب کھولے اور مسکرا کر کہا۔

”کیسی ہو شکو؟“

”اچھی ہوں۔“ شکو مسکرائی۔ پھر اس نے اضافہ کیا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ آئے کیوں نہیں؟“

”دراصل.....“ راج شرارت سے مسکرایا۔ ”میں دراصل ڈر گیا تھا۔“

”ڈر گئے تھے؟“ شکو نے حیرت سے کہا۔ ”کس سے؟“

”تم سے..... تمہارے بالوں سے۔“ راج مسکرایا۔

”چلو بٹو۔“ شکو جھینپ گئی۔

”نہیں، سچ میں.....“ راج نے کہا۔ ”میں..... میں ان نکمے بالوں کے سیاہ جنگلوں

میں گم نہیں ہونا چاہتا تھا۔“

”اب تم بیکار باتیں کر رہے ہو۔“ شکو شرما کر بولی۔

راج معاً سنجیدہ ہو گیا۔ ”شکو! یہ سچ ہے۔ تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ روز بروز زیادہ اچھی لگنے لگی تھیں۔ میں ڈر گیا، کہیں ایسا نہ ہو، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ محبت میں ہارنا میں پسند نہیں کرتا۔ آدمی اگر محبت کرے تو اسے جیتنا چاہئے یا مرجانا چاہئے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

شکو مبہوت سی اُسے دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر اچانک شام اتر آئی تھی اور آنکھوں کے لامحدود صحراؤں میں دھول اڑنے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ گم صم سی راج کو دیکھتی رہی، پھر سوکتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟“

”شاید ہاں، شاید نہیں۔“

”بد معاش۔“ شکو ہنسی۔ راج بھی ہنسنے لگا۔ پھر شکو نے ایک بار اور ہونٹوں کی تپش کو زبان پھیر کر کم کیا اور آہستہ سے بولی۔ ”آج آؤ گے؟“

”تم کہتی ہو تو آ جاؤں گا۔“

اس رات جب راج شکو کے پاس پہنچا تو بانگے گھر میں نہیں تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ راج آئے گا، وہ کتوں کی ریس کھیلنے چلا گیا تھا۔ راج پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ شکو نے اس کے لئے ایک کپ کافی بنائی، پھر پل اور اُتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ جھپ اُتار رہی تھی کہ اچانک راج نے کہا۔

”شکو! ایک بات پوچھوں؟..... برا تو نہیں مانو گی؟“

”پوچھو۔“

”شہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے؟“

”کیا.....؟“

”یہی..... یہ کام؟“

شکو کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے سُٹنا کر ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور گم صم ہو کر راج کو دیکھنے لگی۔ راج نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو شکو! میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ تم چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔“

کئی صدیوں کی ذہنی کشش کے بعد شکو نے کہا۔ ”نہیں۔“

”تو پھر تم یہ سب کچھ ترک کیوں نہیں کر دیتیں؟“

شکو استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ”یہ اتنا آسان نہیں ہے راج!“

”کیوں نہیں ہے؟“

”ارے چھوڑ دو بھی راج!“ شکو بیزار ہو گئی۔ ”میں ایک گری ہوئی عورت ہوں۔ اگر یہ سب کچھ ترک کر دوں تو بھی مجھے عزت نہیں ملے گی۔ کوئی بھی گندگی میں گرا ہوا سکہ نہیں اُٹھاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ چونکہ تم اب تک اس پٹے سے وابستہ رہی ہو اس لئے کسی عزت کی مستحق نہیں ہو۔ لیکن یہ بات مجھے عجیب سی لگتی ہے۔ یہ زندگی تمہاری اپنی ہے۔ تم اپنے ہر فعل کے لئے آزاد اور خود مختار ہو۔ جب تک تم شادی نہ کرو، اس وقت تک تم پر کسی کا حق نہیں ہے۔ لہذا کسی کو تمہارے کسی فعل پر اعتراض کا حق بھی نہیں ہے۔ ہاں، اگر شادی کر لو تو پھر تم اپنے شوہر کی وفادار ہونے کی پابند ہو گی۔“

شکو کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کیسی بات تھی؟ بالکل

انوکھی، بالکل نئی۔ اس سے پہلے تو ایسی بات اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ کیا ایسا بھی سوچتے ہیں لوگ؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ شاید ہاں۔ یہ ماحول، یہ نئی دنیا، نئے لوگ شاید اس کے لئے حوصلہ شکن نہیں تھے۔ اس ملک میں شٹو جیسی عورتوں کو چھوٹ کی بیماری نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس سے پہلے تو کسی نے اسے کچڑ سے نکالنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

راج نے معاً شٹو کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”شٹو کئی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اگر مانا جائے تو برائی ہیں۔ ورنہ نہیں۔“

”راج.....“ شٹو نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر صرف اس کا نام ہی زبان سے نکل سکا۔ راج نے مزید کہا۔ ”شٹو سارے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ ایک دروازہ یا کھڑکی یا روزن ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“

شٹو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کیا کہے، کہاں جائے؟

لوگ روم میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ چاروں طرف مختلف اشیاء بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ شٹو وہاں نہیں تھی۔ نہ ہی فائر پلیس پر اس کی تصویر نظر آرہی تھی۔ میں نے بانگے سے پوچھا۔

”شٹو کہاں ہے.....؟“

بانگے کا چہرہ ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے تھکے تھکے انداز میں ایک سگریٹ جلائی، لمبا کش لیا، پھر کھوٹلی آواز میں بولا۔

”بھاگ گئی۔“

چھ سات ماہ گزر گئے۔ بانگے سے گاہے گاہے سامنا ہو جاتا تھا۔ میں شٹو کے بارے میں استفسار کرتا، بانگے مایوسی سے سر ہلا دیتا۔ اُس نے اپنے طور پر شٹو کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی تھی مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ شٹو کا پھر کوئی سراغ نہیں ملا۔ بانگے پولیس کی مدد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ خدشہ تھا کہ وہ خود بھی کئی دشواریوں میں پڑ جائے گا۔ انہی دنوں اس نے یہ بات مجھے بتائی تھی کہ اس نے شٹو سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی۔ چھ سات ماہ بعد بانگے خود بھی غائب ہو گیا۔ جب کئی ماہ تک وہ نظر نہیں آیا تو میں نے چند ایک بار اس کے واقف کاروں سے اس کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا لیکن کسی کو یقینی طور پر اس کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ شہر چھوڑ کر ساؤتھ میں کہیں چلا گیا ہے۔ دو ایک افراد کا یہ بھی گمان تھا کہ شاید منشیات کے دھندے میں دھر لیا

گیا ہے اور اب کئی سال کے لئے جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔ سب کچھ بھی ہو، اس کے بعد انکے سے پھر کبھی سامنا نہیں ہوا۔

پھر میرے اپنے حالات بھی بدلے۔ کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ مجھے شہر چھوڑنا پڑا۔ نیا گھر بہت دور گلاسگو میں بنایا۔ سارا لا ابائی پن، بے نظمی اور غیر ذمے داری ترک کر دی، شادی کی اور گھر بسا لیا۔ زندگی ایک لگے بندھے ڈھرے پر گزرنے لگی۔ حتیٰ کہ پچیس سال بیت گئے۔

یہ اگست کی ایک روشن اور گرم سہ پہر ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے ویننگ روم میں بیٹھا ہوا ہوں۔ انتظار گاہ کے دونوں جانب کشادہ درپچوں سے دونوں پلیٹ فارموں پر آتے جاتے لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ بائیں جانب والے پلیٹ فارم پر میری گاڑی کھڑی ہے۔ لیکن ابھی رواجی میں چند منٹ کی دیر ہے۔ میں کپ اٹھا کر ایک چسکی لیتا ہوں اور اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے۔

”پھر کب آؤ گے؟“

”بھئی اس کا انحصار فرصت پر ہے۔ مگر اطمینان رکھو۔ جوں ہی موقع ملا، چکر لگاؤں گا۔“

”ہم۔“ میرا دوست سگریٹ سلگاتا ہے۔ ”ویسے میں بہر حال بہت خوش ہوں کہ تم اتنی دور سے شادی میں شرکت کے لئے آئے۔“

”یار! اتنے پرانے مراسم ہیں۔“ میں ہنس کر کہتا ہوں۔ ”تمہاری بیٹی آخر میری بیٹی بھی تو ہے۔ آتا تو تھا ہی۔“

دراصل ہم دونوں بہت عرصہ قبل اپنے پرانے شہر میں اور ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ کچھ مدت ایک ہی فیکٹری میں ساتھ ساتھ کام بھی کیا تھا اور ایک دوسرے کے گھرے دوست رہے تھے۔ پھر میرے دوست کو بوجہ لٹکا شار کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس کے بعد میں بھی گلاسگو چلا گیا۔ میرا دوست ڈلینڈ کے اس چھوٹے سے شہر میں آسا تھا۔ برسوں سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر قلم اور فون کے ذریعے ہمارا رابطہ بہر حال قائم رہا تھا۔ جب اس نے اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب سعید کا اہتمام کیا تو مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا۔ دو دن قبل میں شادی میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔ اس شہر میں یہ میری پہلی آمد تھی۔ دو دن بعد اب میں واپس جا رہا تھا اور میرا دوست مجھے رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آیا تھا۔

دفعۃً میرا دوست کہتا ہے۔ ”تمہارے بلڈ پریشر کا کیا حال ہے اب؟“

”کنٹرول میں ہے۔“ میں ہنس کر جواب دیتا ہوں۔ ”اب تو یہ زندگی بھر ساتھ رہے گا۔“
 ”بال بھی تمہارے سفید ہو رہے ہیں۔“ میرا دوست مسکراتا ہے۔

”ارے میاں! بال سفید ہو رہے ہیں، جسم ناتواں ہو رہا ہے، بیماریاں گھیرنے لگی ہیں۔“ میں ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔ ”یہ سب تو ہونا ہی ہے۔ زندگی کی شام سر پر ہے۔ کون جانے رات ہونے میں اور کتنا وقت باقی ہے۔“

”ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میرا دوست تاسف بھرے لہجے میں کہتا ہے۔
 ”بیٹے دن یاد آتے ہیں تو ہوک سی اٹھتی ہے۔ کیسے خوبصورت دن تھے وہ۔ اور کیسا دلولہ تھا ہمارے دلوں میں۔ کیسے کیسے خواب دیکھتے تھے اور کیا کیا منصوبے بناتے تھے، یاد ہے نا؟ زندگی میں یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا اور زندگی گزر گئی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔
 میں بھی چپ رہا۔

چند لمحے بعد میرا دوست چونک کر بولا۔ ”ارے..... یہ تو استانی جی ہیں۔“
 وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ میں دائیں جانب پلیٹ فارم پر نظر ڈالتا ہوں۔ ابھی ابھی ایک ٹرین آ کر رُکی ہے، کمپارٹمنٹس کے دروازے کھل گئے ہیں اور لوگ ڈبوں سے باہر آ رہے ہیں۔ لیکن میرے دوست نے جس ہستی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک خاتون ہیں جو درپچے کے عین سامنے والے ڈبے سے اُتری ہیں۔ وہ ایک پختہ عمر کی خاتون ہیں۔ فدرے فربہ جسم اور سانولا رنگ۔ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس ہیں۔ شانوں پر ایک ہلکی شال پڑی ہے۔ سر پر نہایت نفاست اور سلیقے سے حجاب بندھا ہوا ہے۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک ہے جو بہت بھلی لگ رہی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت بہت پاکیزہ اور باوقار نظر آتی ہے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اور ایک جوان مرد بھی ہے۔ لڑکی نے ایک چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھا رکھا ہے جبکہ نوجوان کے ہاتھ میں سوٹ کیس ہے۔ وہ تینوں بانٹیں کرتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔

”استانی جی؟“ میں اپنے دوست کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوں۔

”ہاں۔“ میرا دوست جواب دیتا ہے۔ ”یہ اس شہر کی بہت ہی ہرولہزیز ہستی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی اور داماد ہے۔ ایک لڑکا بھی ہے جو مقامی کونسل میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہے۔ استانی جی بہت نیک اور دردمند ہیں۔ فلاجی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔ ایک مدرسہ بنا رکھا ہے جہاں بچوں اور نوجوان لڑکیوں کو بلا معاوضہ قرآن اور اُردو پڑھاتی ہیں۔ بیوہ اور مظلوم عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک انجمن بھی قائم کر رکھی ہے

جو دکھی عورتوں کی مدد کے لئے بہت کام کرتی ہے۔ اگر پاک و ہند میں کوئی ناگہانی آفت نازل ہو تو نہ صرف خود حسبِ مقدور عطیہ دیتی ہیں بلکہ چندہ جمع کرنے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور ہزاروں پاؤنڈ اکٹھا کر کے مصیبت زدگان کے لئے بھجواتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فلاحی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ایشین کمیونٹی میں انہیں بہت عزت و احترام حاصل ہے۔“

میں استانی جی کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ اب صدر دروازے کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ میں نرم آواز میں کہتا ہوں۔

”بھئی بہت خوشی ہوئی ان کے بارے میں جان کر..... نام کیا ہے؟“

”شائستہ بیگم۔“ میرا دوست جواب دیتا ہے۔ ”موقع نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ان سے

ملواتا۔“

”ہاں، واقعی وقت نہیں ہے۔“ میں اُٹھتے ہوئے کہتا ہوں۔ ”میری گاڑی اب چھوٹنے

کی والی ہے۔“

کچھ دیر بعد میری گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ میں اپنے دوست کو خدا حافظ کہتا ہوں اور کھڑکی سے ایک بار پھر صدر دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ مگر اب وہاں استانی جی نہیں ہیں۔ میں یکایک ایک طویل سانس لیتا ہوں۔ میرے دوست نے وقت کی کمی کی بات کی تھی لیکن اُسے یہ نہیں معلوم ہے کہ میرے پاس اگر وقت ہوتا بھی تو میں استانی جی سے نہ ملتا۔ میں پچیس سال پہلے جیتے ہوئے لمحے کو واپس نہیں لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے جان لیا تھا مگر اپنے دوست کو نہیں بتایا تھا کہ استانی جی کا نام شائستہ بیگم نہیں بلکہ شاکرہ بیگم عرف شکوہ ہے۔



اس کا زادراہ

شہاب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بجنے والے تھے۔ دم بدم ڈوبتی شام کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ نیم کے پیڑ پر بسیرا کرنے والے پرندوں کا شور بڑھ گیا تھا مگر یہ شور اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔

پرندے اسے ہمیشہ سے پسند تھے اور ان کی موسیقی ریز چکار۔ بچپن میں بلبل، مینا اور کبوتر بڑے شوق سے پالا کرتا تھا۔ اب لڑکپن نہیں تھا، مگر پرندوں سے اس کی دلچسپی ابھی بھی برقرار تھی۔ اس دلچسپی اور لگاؤ کا سبب کیا تھا؟ اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ پرندے آزادی اور خود مختاری کی علامت ہیں۔ پرندے کسی کے تابع فرمان نہیں ہوتے۔ نہ مجبور و محکوم ہوتے ہیں۔ وہ کھلے آسمانوں پر اڑتے ہیں۔ آزاد، خود مختار اور بے فکر۔ وہ اپنی زندگی خود جیتے ہیں اور بالکل اسی طرح، جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ آزادی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ساری زندگی اُسے ان راستوں پر چلنا پڑا تھا جو حالات نے اس کے لئے تراشے تھے۔ اور ان فیصلوں کو ماننا پڑا تھا، جو وقت نے کئے تھے۔ زندگی کے اسٹیج پر اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ شاید یہ اسی محرومی اور مجبوری کا ردِ عمل تھا کہ اسے کھلی فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پرندوں کی آزادی میں اسے اپنی محرومی کی عطا کی کا عکس نظر آتا۔ شاید یہ خود فریبی ہی ہو۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ کبھی کبھی خود فریبی زندگی کی بہت سی محرومیوں کا نعم البدل محسوس ہوتی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر نیم کے پیڑ کو دیکھا۔ گہری، سبز پتوں سے لدی پھندی اس کی ٹہنیوں میں چڑیاں ادھر ادھر پھدک رہی تھیں اور شور مچا رہی تھیں۔ وہ چند ٹاپے مسکراتی نظروں سے چڑیوں کو دیکھتا رہا، پھر نگاہ خود بخود گھڑی پر چلی گئی۔ چھ بج کر دس منٹ۔ وہ قدرے بے چین ہوا۔ آخر یہ وقت گزر کیوں نہیں رہا؟ گھڑی کی سوئیاں اتنی ست کیوں ہیں؟ پھر وہ دھیرے سے ہنسا۔ حد ہو گئی۔ آخر اتنی بے چینی کیوں؟ وہ تو خود ہی وقت سے پہلے آ گیا

ہے۔ اکبری باقی نے بتایا تھا کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اب اگر وہ پونے چھ بجے ہی وہاں پہنچ گیا ہے تو یہ غلطی اس کی ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کا کیا قصور۔

مگر وہ بھی کیا کرتا۔ چھتیس سال گزرے، گویا ایک عمر بیت گئی۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک سلطانہ سے پھر ایک بار، چند منٹ کے لئے ہی سہی، ملاقات کی انہونی ممکن ہو سکے گی۔ یہ آس تو مدت ہوئی، ختم ہو چکی تھی۔ اس نے صبر کر لیا تھا۔ زندگی جیسی بھی گزری، گزر گئی۔ جو باقی ہے، وہ بھی گزر ہی جائے گی۔ گئے دنوں کی یادیں اس کی پونجی ہیں۔ اس کی متاعِ حیات۔ انہی کے سہارے اس نے زندگی کے محروم و افسردہ زندگی کے بے کیف شب و روز گزارے ہیں۔ اسے کوئی غم نہیں، کوئی بچھتاوا نہیں۔ تقدیر کی جھولی میں اس کے لئے جو کچھ تھا، وہ اسے ملا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ پونجی کچھ ایسی کم بھی تو نہیں۔ اس کا رگہ شیشہ گری میں بے شمار لوگ بس کالج کی طرح جیتے ہیں، ٹھیس لگی اور پُور پُور ہو گئے۔ انہیں اتنا بھی نہیں ملتا جتنا اسے ملا ہے۔ اس کے پاس تو سلطانہ کی یادیں ہیں۔ اور یہ بھرم کہ وقت نے سلطانہ کے دل میں اس کی چاہت کم نہیں کی ہے۔ خود اس کے اپنے تصور میں بھی سلطانہ کا سراپا محفوظ تھا۔ اس کی جلتنگ جیسی میٹھی آواز، اُس کی شام کے کاجل سے سنوری آنکھیں اور اُس کا تراشیدہ منور چہرہ۔ چھتیس برسوں میں نہ تو اس کے دل میں ایسی یادیں دُھندلائی ہیں اور نہ ہی سلطانہ کے نقش و نگار پر گرد جمی ہے۔ وہی آواز، وہی آنکھیں، وہی بال اور چہرہ آج بھی اس کے ذہن میں موجود ہے۔ یہ پونجی زندگی گزارنے کے لئے کچھ ایسی کم تو نہیں، بلکہ شاید ہفت اقلیم کی دولت سے بھی زیادہ ہے۔

سلطانہ کا خیال آیا تو دل میں ایک بھنور سا اٹھا۔ کیا ہوگا؟ اتنی طویل مدت کے بعد جب سلطانہ سے سامنا ہوگا تو کیا محسوس ہوگا؟ کیا وہ اپنے دل کو سنبھال سکے گا؟ اُس نے اضطرابی انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مشکل ہے، بڑا سخت امتحان ہے۔ ہر چند کہ وہ اب ایک سنجیدہ، عمر رسیدہ آدمی ہے، پھر بھی سلطانہ سے سامنا کرنا آسان نہ ہوگا۔ خدایا، کیسا عجیب لمحہ ہوگا وہ۔ سلطانہ اُس کے سامنے ہوگی اور وہ..... ایک بار پھر اس نے زور سے سانس لی اور بے چینی سے پہلو بدلا..... وہ اُسے دیکھے گا۔ خواب یا تصور میں نہیں بلکہ جیتا جاگتا، رد و ردو۔ تب کیا کرے گا وہ؟ کیا کہے گا؟ اور سلطانہ کیا کہے گی؟..... ہر چند کہ اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ گزرے چھتیس برسوں کے روز و شب کی باتیں، ان گنت باتیں۔ دکھ درد اور محرومیاں اور یادوں کے سہارے زیست کرنے کا جتن۔ اور سلطانہ کا دامن بھی تو خالی نہیں ہوگا۔ اس کے پاس بھی یقیناً بے شمار باتیں ہوں گی۔

اس کی اپنی باتیں۔ بال بچے اور شوہر۔ پردیس میں پینتیس چھتیس سال اس نے کیسے گزارے۔ مگر کیا وہ ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ سکیں گے؟ شاید زبانیں ساتھ نہ دیں۔ شاید دل حوصلہ ہار جائیں اور وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں!

اپنے اضطراب پر قابو پانے کی لاشعوری کوشش کے طور پر اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا برآمد کی۔ مگر ڈبیا کھولی تو کوفت مزید بڑھ گئی۔ صرف ایک سگریٹ تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ ایک طرف اچھال دیا۔ پھر ایک طویل کش لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ دھوپ کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اُجالا دھیرے دھیرے معدوم ہو رہا تھا۔ اطراف کے بعض مکانوں سے گہرا کثیف دھواں اُٹھ کر کابلی سے فضا میں پھیل رہا تھا۔ چھت کے اوپر پھیلی نیم کی گھنی شاخوں میں دھند لکانبنا زیادہ گہرا تھا اور ساتھ ہی چڑیوں کا شور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے چڑیوں کی چہکار سنتا رہا، پھر یکایک مسکرایا۔ پرندے..... سلطانہ کو بھی تو پرندے بہت پسند تھے۔ مینا، بلبل اور لعل.....!

یکایک اُس کے کانوں میں سلطانہ کی آواز گونجی۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“ اور زندگی بھر اُس نے صرف یہی کیا تھا کہ اپنا خیال رکھا تھا۔ کیونکہ یہ سلطانہ کے آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے تھے۔
پھر وہ چلی گئی تھی۔



بچپن سے دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ ساتھ کھیلے تھے، شرارتیں کی تھیں۔ کچھ عرصہ مدر سے میں بھی ساتھ رہا تھا۔ بچپن گزرا، جوانی میں قدم رکھا۔ دونوں کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن جس طرح بلند پہاڑیوں کے درمیان گہری گہری گھاٹیوں میں خود رو گھاس خود بخود اُگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے بالکل اسی طرح ان کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کی چاہت خود بخود پیدا ہوئی تھی اور چپکے چپکے بڑھتی رہی تھی۔ لیکن دونوں بے خبر تھے۔ احساس اس وقت ہوا جب سلطانہ کی اماں نے ذکر کیا کہ اس کی نسبت کئی سال پہلے ہی طے ہو چکی ہے اور یہ کہ اس کا منگیتر خارجہ کے محکمہ میں ملازم ہو کر سویڈن گیا ہوا ہے۔

سلطانہ نے یہ اطلاع شہاب کو دی۔ اور اس وقت پہلی بار وہ اس محبت سے آگاہ ہوئے جو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے تھی۔ زبان سے کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ آتی بھی کیسے؟ انہیں تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کے تحت الشعور میں خود بخود یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ جس طرح بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں اسی طرح باقی زندگی بھی ساتھ رہیں گے۔ گمان تک کبھی نہیں گزرا کہ ان کے راستے کبھی الگ

ہو جائیں گے۔ مگر اب مگنی کا انکشاف ہوا تو جدائی کا احساس بھی ہوا۔ شاید اس جان سوز احساس ہی نے انہیں بتایا کہ وہ ایک دوسرے سے چپکے چپکے محبت کرتے رہے ہیں۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ دل کی بازی وہ اس طرح ہارے تھے کہ انہیں خبر تک نہ ہو سکی تھی۔

وہ ملاقات اکبری کے گھر میں ہوئی تھی۔ اکبری باجی اور سلطانہ کے گھریلو مراسم تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں کی بہت شفقت دوست بھی تھیں۔ وہ اکثر وہاں ملا کرتے تھے۔ اس وقت وہ دونوں چھت پر تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ بہت دور مغرب میں سورج آدھا ڈوب چکا تھا باقی نصف سورج ایک سرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا اس کی گہری سرخی افق پر دور تک پھیل گئی تھی جیسے ہزاروں لاکھوں محبت کے مارے دلوں کا خون ہو گیا ہو۔ دونوں دیر تک چپ رہے۔ شہاب وحشت بھری نظروں سے ڈوبتے سورج کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زور سے سانس لی۔

”یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔“ آخر کار اس نے کہا۔ اُس کی آواز میں دل ٹوٹنے کی بازگشت تھی۔

”ہاں۔“

”اب کیا کریں؟“

”میں اماں ابا کو دکھی نہیں کر سکتی۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ شہاب نے مدہم آواز میں کہا۔ ”کیونکہ یہ جو ماں باپ ہوتے ہیں نا، یہ بڑے پیارے انسان ہوتے ہیں۔ بے لوث، بے غرض۔ دنیا میں شاید ہر شے کا نعم البدل ہے مگر ماں باپ کا نہیں۔ یہ لوگ صرف محبت کرتے ہیں۔ اپنا سب کچھ اپنے بچوں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ دن کا سکھ، رات کا چین، اپنی خواہشیں اور ضرورتیں تیاگ دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے دامن میں چھپا کر اس طرح پالتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دکھ، کوئی آفت ان کے قریب نہیں پھنک پاتی۔ بچے کی جان پر بن آئے تو اپنی زندگی کے عوض اس کی زندگی اور سلامتی کی دعا مانگتے ہیں اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ ماں باپ کی قوم بڑی انوکھی ہوتی ہے کہ ان کی محبت اور ایثار میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے۔“ وہ یکایک رُکا، آنکھوں میں جھلملاتا آنسو پونچھا، پھر افسردگی سے مسکرایا۔ ”انہیں دکھ دینے کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔“

سلطانہ نے محبت سے اُسے دیکھا۔

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ دیر تک چپ رہے اور غمگین سناٹا ان کے چاروں طرف

پھیلتا گیا اور بڑھتا گیا۔ سورج کچھ اور جھک گیا۔ اُفتق کی سرخی کچھ اور خون آلود ہو گئی اور آسمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک کچھ اور زیادہ دیران ہو گیا۔ سلطانہ نے سر اٹھا کر آسمان میں اڑتے اکا دکا بے آسرا، بے گھر، بے منزل پرندوں کو دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”تمہاری نوکری کا کیا ہوا؟“

”ارے ہاں۔“ شہاب زور سے چونکا۔ ”میں ذکر کرنے ہی والا تھا۔ نوکری مل گئی ہے۔ اگلے ہفتے مجھے جانا ہو گا۔“ اتنا کہہ کر وہ بے معنی انداز میں ہنس پڑا۔

”ہنسی کیوں؟“ سلطانہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس کی ہنسی میں چھپا کرب کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ ”ملازمت کا پروانہ ملا تھا تو یونہی خود بخود ایک خیال آیا تھا کہ وہاں جاؤں گا، ایک اچھا سا گھر بناؤں گا اور پھر.....“ اُس نے رک کر شکستہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔ ”اور پھر ہم دونوں اس میں رہیں گے۔ کتنی احمقانہ بات ہے۔ ہے نا؟“

سلطانہ کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ نے دم توڑا۔

چند لمحے بعد سلطانہ نے کہا۔ ”وہاں رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔ لیکن ہو جائے گا۔“

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی، مغموں نظروں سے اسے دیکھا۔ ”شہاب! سورج ڈوب

رہا ہے۔“

”ہاں۔“

”ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔“

”ہاں۔“ شہاب کے سینے میں کوئی شے چیخ کر ٹوٹ گئی۔ ”ہاں، بہت گہرا اندھیرا ہو

جائے گا۔ پھر پتا نہیں کب اُجالا ہو۔ ہو بھی کہ نہ ہو۔“

سلطانہ کے ہونٹ لرزے۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر چپ ہو گئی۔ وہ بھی چپ رہا۔ حالانکہ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا اور جی بھی چاہتا تھا کہ ڈھیر ساری باتیں کر لیں۔ دل کی حسرت نکال لیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ کچھ دیر بعد وہ نکھڑ جائیں گے، اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہو، کون جانتا ہے۔ پھر ملاقات ہو نہ ہو۔ ہو سکتا ہے، پھر کبھی سامنا نہ ہو اور عمر زُر جائے۔ تو پھر کیوں نہ ان چند لمحوں کو جو انہیں ملے ہیں، امر کر لیں۔ مگر باوجود خواہش کے کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی اپنی ردائے دکھ میں لپٹے چپ چاپ کھڑے رہے اور ڈوبتے سورج کو یوں دیکھتے رہے جیسے

سورج نہیں، وہ خود ڈوب رہے ہوں۔

یکایک سلطانہ نے کہا۔ ”اچھا شہاب! میں چلتی ہوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“
”اچھا۔“ اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

سلطانہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ معاً اُس نے کہا۔
”سلطانہ!“

وہ رُک کر گھومی۔ ”کہو.....“

”بس چند پل یونہی کھڑی رہو۔“ اس نے کرب میں ڈوبی آواز میں کہا۔
”اچھا.....“

وہ چند قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑی تھی۔ کاسنی رنگ کے شلوار جمپر میں ملبوس۔
ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے اس کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا تھا۔ اس ہالے کے
درمیان وہ آکاش سے اُتری کسی اپسرا کی طرح نظر آتی تھی۔ بلور کی طرح منور اس کی بڑی
بڑی غلافی آنکھیں، ترشے ہوئے نین نقش، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بال۔
شہاب اُسے دیکھتا رہا۔ اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے، تمام موجودات و مظاہر سے
بے خبر ہو کر یوں دیکھتا رہا جیسے اس منظر کو اپنے دل میں اُتار لینا چاہتا ہو، اپنی روح میں
جذب کر لینا چاہتا ہو۔ لمحے ایک ایک کر کے گزرے لیکن وہ چند لمحے بے حد انمول تھے۔
اُس کی زندگی کا حاصل۔ اب یہی لمحے اس کا زادراہ ہیں اور اس کی بیساکھی کہ ان ہی کے
سہارے اسے اپنی زندگی گزارنی ہے۔

وہ چند لمحے بے آواز گزر گئے تو اس نے معاً کہا۔ ”اب جاؤ۔“

سلطانہ افسردگی سے مسکرائی، آگے بڑھی۔ مگر زینے کے پاس پہنچ کر پھر رک گئی۔ گھوم کر
اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔
”اپنا خیال رکھنا۔“



اگلے ہفتے اُس نے اس شہر کو خیر باد کہہ دیا، جہاں زندگی کے ان گنت شب و روز
گزرے تھے۔ پہلے گاؤں جا کر والدین سے ملا، پھر تین سو میل واقع دور اس چھوٹے سے
شہر کا رخ کیا جہاں ملازمت ملی تھی۔ نیا شہر، نئے لوگ اور نیا ماحول۔ ابتدا میں اسے بڑی
وحشت ہوئی۔ تنہائی اور بے گھر ہونے کا احساس گھیرے رہتا تھا مگر بتدریج اس نے اس
نئے ماحول کو قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ ایک معمول بھی بن گیا۔ دفتر، گھر۔ چند ایک دوست
بن گئے اور وقت بہت سست روی سے ہی سہی گزرنے لگا۔

اکبری باجی سے رابطہ تھا۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ سلطانہ کی شادی ہو گئی ہے۔ پھر یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سویڈن چلی گئی ہے۔

چند ماہ بعد اُس کی اپنی شادی بھی ہو گئی۔ اس کی بیوی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ رنگ و روپ بھی اچھا تھا اور گھر گریہستی بھی جانتی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان مفاہمت، ہم آہنگی اور قربت پیدا نہ ہو سکی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ اس کی بیوی شاکرہ کا اپنا مزاج تھا جس میں خود پسندی کا پہلو نمایاں تھا۔ بنیادی طور پر اس میں خود اپنے آپ سے محبت کرنے کی خواہش زیادہ تھی اور کچھ اس کارن کہ وہ خود اپنے آپ کو شاکرہ کی جانب ملامت کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ سلطانہ چلی گئی تھی۔ وقت گزر گیا تھا۔ مگر وہ شام اُس کے تصور میں زندہ تھی۔ آخری ملاقات کی شام۔ اُداس، پُکسوت شام۔ ڈوبتا ہوا سورج اور نارنجی کرنوں کے ہالے میں گھری ہوئی سلطانہ اور اُس کے لبوں سے نکلے ہوئے آخری الفاظ 'اپنا خیال رکھنا' گوان گنت شب و روز گزر چکے تھے مگر وہ منظر جوں کا توں اس کے تصور میں زندہ تھا۔ اس پر وقت کی گرد نہیں جھی تھی اور بچ تو یہ ہے کہ وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ منظر ماضی کے سیاہ خانوں میں گم ہو جائے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی آس، کوئی خوشی، حتیٰ کہ کوئی شکوہ بھی نہیں۔ لے دے کے بس وہ ایک منظر ہی تو تھا اس کے پاس۔ اس کی کل پونجی، اس کی متاع حیات، اس کا زادِ راہ کہ اس کے سہارے اسے اپنی زندگی گزارنی تھی۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس شام کو اپنے احساس، اپنے تصور میں زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور آدمی تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو، خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں، قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اپنی اخلاقی ذمہ داری کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ باوصف اس کے کہ اس کے دل میں شاکرہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، اس نے اسے شکایت کا موقع کبھی نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے خفیف سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ اس کے دل کے نگار خانے میں کسی اور کی تصویر آدیزاں ہیں۔ اپنی ذمہ داریاں نبھانے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مگر کچھ زیادہ کا سیاہ نہیں ہوئی۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے دونوں نے اپنے لئے الگ الگ غیر مرمی دنیا تخلیق کر لی اور اس میں مگن ہو گئے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے مگر اس طرح گویا دونوں کے درمیان محض رسمی شناسائی ہو۔ نہ وہ شاکرہ کے معاملات میں دخل دیتا تھا اور نہ شاکرہ اس کی مصروفیات میں مغل ہوتی۔ اکثر وہ اپنے میکے چلی جاتی اور کئی کئی ماہ گزار کر واپس آتی لیکن اسے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

وقت کی انگلیوں میں شب و روز کی تسبیح گردش کرتی رہی۔ دن، مہینے، سال۔ دھیرے

دھیرے بہت کچھ بدل گیا۔ چہرے، مزاج، قدریں، زندگی جو اس کے بچپن میں ایک نرم رو ندی کی طرح بہتی تھی، اب ایک تیز، سرکش اور بے پردائی آبشار کے مانند بھاگنے لگی۔ وہ زندگی اور وقت کے ساتھ نہیں مل سکا بلکہ پیچھے رہ گیا۔ اتنا پیچھے کہ اس لمحے سے آگے بڑھ ہی نہیں سکا جب اس نے آخری بار سلطانہ کو شام کے نارنجی دھندلکے میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی بھی اُسی لمحے میں زندہ تھا۔ سلطانہ سامنے کھڑی تھی اور وہ اپنے آپ سے غافل ہو کر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور شام رفتہ رفتہ ڈوب رہی تھی۔

مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ نہ پچھتاوا اور نہ کوئی شکوہ۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے۔ شکایت کیوں اور کس سے؟ ایک زندگی ہی تو گزارنی ہے، گزر جائے گی۔ چنانچہ وہ زیست کرتا رہا۔ سلطانہ کے بارے میں کبھی کبھی کوئی اطلاع مل جاتی تھی، کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ کئی سال سویڈن میں گزارنے کے بعد اس کے شوہر کا تبادلہ پہلے ناروے اور پھر افریقہ کے کسی ملک میں ہو گیا تھا۔ وہاں سے پھر وہ انگلینڈ آئی اور چند سال وہاں خدمات انجام دینے کے بعد اس کے شوہر نے کچھ وجوہ کی بناء پر ملازمت چھوڑ دی اور انگلینڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اطلاع ملنے کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔

پینتیس چھتیس سال گزر گئے۔ ان گزرے ماہ و سال نے اپنا خراج وصول کیا۔ وہ جو کبھی بڑا وجیہ، صحت مند اور زندگی سے بھرپور تھا، دھیرے دھیرے خود اپنا سایہ بن گیا۔ کوئی مضحل ہوئے، بالوں میں چاندی اُتر آئی۔ عمر نے ساٹھ کے دروازے پر دستک دی تو انخطاط اور بھی بڑھا۔ حتیٰ کہ اسے چلنے پھرنے کے لئے کبھی کبھی چھڑی کے سہارے کی ضرورت بھی پڑنے لگی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ زندگی جیسی بھی گزری، بری نہیں گزری۔ گو اسے سب کچھ نہیں ملا۔ پھر بھی جو کچھ ملا کچھ ایسا کم بھی نہیں تھا۔ مگر اطمینان کے باوجود پچھلے کچھ برسوں سے ایک خواہش، ایک آرزو اس کے دل میں سر اُٹھانے لگی تھی۔ سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ کس شہر میں رہتی تھی؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟ جب بھی سلطانہ کا خیال آتا، دل میں ایک حسرت سر اُٹھانے لگتی۔ برسوں پہلے کا وہ منظر آنکھوں میں منعکس ہو جاتا اور اس کی آواز کانوں میں گونجتی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“

وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ اس کے دل میں سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش نے جنم لیا تھا اور بالکل اسی طرح جنم لیا تھا جیسے اونچے پہاڑوں کے درمیان

چھپی گہری گھاٹیوں میں خود روگھاس خود بخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ بالکل غیر محسوس طور پر اُس کی یہ آرزو بھی چپکے چپکے بڑھی تھی اور شدید ہوتی گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی۔ آخر کیوں؟ لیکن سمجھ نہ پاتا۔ شاید سبب یہ ہو کہ زندگی کی شام سر پر تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اور اس احساس نے کہ اب غروب میں شاید کچھ وقت نہیں ہے، اس کے من میں اس تمنا کو ابھارا تھا کہ وہ ایک بار اور سلطانہ کو دیکھ لے۔ ایک بار اور اُس کی میٹھی آواز سن لے، پھر اسے اطمینان ہو جائے گا۔ دل کی حسرت نکل جائے گی اور اسے محرومی کا احساس نہیں رہے گا۔ مگر یہ سوچ کر کبھی کبھی اسے پچھتاوا اور ملال ہوتا کہ اس حسرت کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سلطانہ بہت دور انگلستان میں بیٹھی ہے۔ اپنے گھر بار میں مگن ہے۔ عرصے سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اس صورت میں اس سے ملاقات کا کیا امکان ہے؟ نہیں، اب یہ ممکن نہیں۔ شاید یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی اور سورج غروب ہو جائے گا۔ تاہم جب وہ اپنے دل کو ٹوٹاتا تو محسوس کرتا کہ اگر سلطانہ سے پھر کبھی سامنا نہ ہو تو اسے قسمت سے کچھ ایسی زیادہ شکایت نہ ہوگی۔ اس کے لئے اتنا اطمینان کافی ہے کہ سلطانہ جہاں بھی ہے، خوش اور مطمئن ہے۔

لیکن جب اکبری باجی نے یکایک کہا کہ سلطانہ سے ملو گے تو اس کے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی۔

اسے اپنے پرانے شہر میں اتفاقیہ طور پر ایک کام پڑ گیا تھا چنانچہ اسے تین سو میل کا سفر کرنا پڑا۔ اس بار اُس کی آمد برسوں بعد ہوئی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ شہر کافی حد تک بدل گیا تھا۔ ان گنت نئی نئی عمارتیں کھڑی ہو گئی تھیں۔ پبلک پارک جو پہلے بہت خوبصورت اور وسیع تھا، نصف سے زیادہ غائب ہو گیا تھا۔ گندگی بہت زیادہ تھی۔ سڑکوں پر ہجوم بہت زیادہ تھا اور شور اٹاتا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح چند ایک دن گزارے اور مسلسل ان بیتے دنوں کو یاد کیا جب یہ شہر بہت خوبصورت، صاف ستھرا اور پرسکون ہوا کرتا تھا۔ لیکن گئے دنوں نے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ نہ صرف انسانوں سے بلکہ آبادیوں سے بھی۔ اب انسانوں کے پاس محبت اور مروت نہیں رہی تھی اور آبادیاں سکون اور تحفظ کی ضمانت سے محروم ہو گئی تھیں۔

شام کی گاڑی سے اس کی واپسی تھی۔ صبح وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کباب، سمو سے اور اس کا پسندیدہ مینس کا حلوا۔ ابھی وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ معاً اکبری باجی نے کہا۔

”شہاب! سلطانہ سے ملو گے؟“

لیکن اسے یوں لگا جیسے زمین پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔ ہاتھ اس بری طرح کانپا کہ چائے چھلک گئی۔ اس نے عجلت سے پیالی میز پر رکھی اور شپٹا کر اکبری باجی کو دیکھا۔

”سلطانہ سے.....؟“

”ہاں.....“

”مگر وہ.....“

آج کل وہ یہیں ہے۔ عزیزوں سے ملنے آئی ہے۔ اب شاید دو چار دن میں واپس جانے والی ہے۔“

”مگر اسے کیا علم کہ میں یہاں ہوں۔“

”میں نے بتایا تھا۔ پرسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“

شہاب چند لمحے چپ بیٹھا رہا اور بے یقینی سے اکبری باجی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ دل کی شوریدہ ہر دھڑکنوں اور اعصابی انتشار پر قابو پانے کے لئے اسے چند منٹ کی مہلت درکار تھی۔ چائے سپ کر کے اس نے سگریٹ جلائی، ایک کش لیا، پھر زور سے سانس لے کر بولا۔

”اچھی تو ہے وہ.....؟“

”ہاں۔“

چند ثانیے چپ رہ کر اس نے کہا۔ ”اب تو کافی عمر ہو گئی ہوگی اس کی۔“

اکبری باجی زور سے نہیں۔ ”لو..... کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم بھی۔ برسوں گزر گئے۔ تم بوڑھے ہو گئے، میرے چہرے پر بھی لکیریں پڑیں۔“ ”کیا وہ ابھی تک جوان ہی رہے گی؟“

وہ جھینپ کر مسکرایا۔ ”ہاں خیر، یہ تو ہے۔ پینتیس چھتیس برس تو ہو گئے اسے باہر گئے ہوئے۔“ لمحہ بھر رک کر پھر بولا۔ ”مگر باجی! میں تو آج شام کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟ جانے سے پہلے چند منٹ کے لئے مل لو۔“

”لیکن کیا یہ مناسب ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ممکن ہے وہ پسند نہ کرے۔“

”ارے نہیں۔“ اکبری باجی مسکرا کر کہنے لگیں۔ ”میں نے تمہارا ذکر کیا تو دیر تک تمہارے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی۔ جب میں نے ذکر کیا

کہ تم ایک دو دن میں واپس جانے والے ہو تو اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔
 ”اچھا.....“ اس کے دل دھڑکن دفعۃً بڑھ گئی۔ ”ملنے کی خواہش ظاہر کی؟“

”ہاں..... کہنے لگی، میں چند دن میں واپس لندن چلی جاؤں گی۔ پھر کون جانے کبھی ایسا اتفاق ہو نہ ہو۔ لہذا چند منٹ کے لئے مل لوں۔ خیریت پوچھ لوں۔ پھر کہنے لگی کہ ایک نظر شہاب کو دیکھنے کے لئے بہت جی چاہتا ہے۔“ اکبری باجی رُکس، پھر بولیں۔
 ”میں نے آج شام کو اسے چائے پر بلایا ہے۔ تم بھی آ جانا اور چند منٹ کے لئے ملاقات کر لینا۔“

وہ حیرت اور بے یقینی کے حصار میں گھرا بیٹھا تھا۔ سلطانہ سے ایک بار پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔ ایک بار پھر وہ اس کی من موہنی صورت دیکھ سکتا ہے اور اس کی آواز کی جلت رنگ سن سکتا ہے۔ خدایا، یہ کیسا عجیب اتفاق ہے؟ اس نے زور سے سانس لی اور اضطرابی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو معاً وہ منظر سامنے آ گیا جو اس کی زندگی کی کل جمع پونجی تھا۔ جس کے سہارے اس نے عمر کا سفر طے کیا تھا۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ سلطانہ سامنے کھڑی ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ پورا منظر، اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ۔ سلطانہ کا سراپا، اس کا خوب صورت چہرہ، اس کی منور آنکھیں اور..... اس نے اضطرابی حالت میں ایک اور سگریٹ جلائی۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ اکبری باجی نے پوچھا۔

”خیر، یہ تو ٹھیک ہے کہ چند منٹ کے لئے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ آخر کار اس نے کہا۔ ”میں آ جاؤں گا۔“

مگر جب وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اطلاع دی کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اوپر چھت پر جا رہا ہے۔ جب سلطانہ آئے گی تو نیچے آ جائے گا۔ چھت پر پہنچا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ برسوں پہلے اسی چھت پر وہ سلطانہ سے آخری بار ملا تھا۔ گو چھت وہی تھی مگر اب چند تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کی بلند عمارتیں بن گئی تھیں۔ گلی میں استادہ نیم کا درخت بڑھ کر اب چھت سے بھی اوپر نکل گیا تھا اور اس کی گھنی شاخوں نے نصف چھت کو ڈھک لیا تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اکبری باجی نے چھت پر ایک کمر بنوا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر حیرت اور تاسف سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ تبدیلیاں اسے اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک خلش اور بچھتاوے نے دل میں چٹکی لی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی کوئی عزیز شے اس سے چھین لی گئی ہو۔ کم از کم ایک شے تو ضرور چھین گئی تھی۔ ڈوبتا ہوا سورج کہ نیم کی گھنی شاخوں نے اب مغربی افق کو چھپا لیا تھا۔



اُس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ معاً اُٹھ کھڑا ہوا اور اضطراری انداز میں چھت پر ٹہلنے لگا۔ اس خیال نے کہ کچھ ہی دیر میں سلطانہ آنے والی ہے، اس کے دل میں ہيجان اور تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ابھی سلطانہ آئے گی تو کیسا لگے گا؟ کیسا محسوس ہوگا؟ سلطانہ کیا کہے گی؟ وہ کیا کہے گا؟ اُس نے چشم تصور سے اس لمحے کو دیکھنے کی کوشش کی جب وہ ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ سلطانہ اور وہ۔ ایک دوسرے کے روبرو۔ تقریباً چھتیس سال بعد۔ خدایا، کیا ہوگا؟ وہ لمحہ قیامت سے کم تو نہ ہوگا۔

اُس نے بیزاری سے چند قدم اٹھائے۔ پھر یکایک دھیرے سے ہنسا۔ حد ہو گئی۔ ارے بھی اس میں اس قدر گہرا ہٹ کی کیا بات ہے؟ وہ کوئی نوجوان لڑکا لڑکی تھوڑا ہی ہیں۔ دونوں سنجیدہ اور باشعور انسان ہیں اور چند منٹ کے لئے ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو پھر پریشانی کیسی؟ نہیں، اُسے اتنا مضطرب نہیں ہونا چاہئے۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر کو ہولے سے جھٹکا۔ نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو پُر سکون رکھے گا اور اطمینان سے گفتگو کرے گا۔ سلطانہ کی خیریت پوچھے گا اور اس کے بچوں کا حال، لندن کی باتیں۔ لندن میں اس کا گھر کیسا ہے؟ وہاں اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ یوں جیسے اسے اطمینان کا احساس ہوا ہو۔

ٹہلٹے ٹہلٹے معاً وہ رک گیا۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بڑا آئینہ نصب تھا۔ وہ بے خیالی میں آگے بڑھا، کمرے میں گیا۔ ہاتھ بڑھا کر بتی جلائی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ تب یلکھت اس کا دل ڈوب سا گیا۔

آئینے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے سر پر گنتی کے بال تھے۔ کچھ سلیٹی، کچھ سفید۔ ایک بوڑھا بے رونق چہرہ تھا جس پر ان گنت گہری پرچھائیاں تھیں..... حسرتوں اور محرومیوں کا مرثیہ۔ یہ آدمی وہ نہیں تھا جس نے چھتیس سال قبل ایسی ہی ایک شام میں، اسی چھت پر سلطانہ سے آخری ملاقات کی تھی۔ وہ آدمی تو بڑا وجیہ تھا۔ دراز قد اور توانا، زندگی سے بھرپور۔ اس آدمی کے چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں اور گھنے سیاہ بال اور دکتی ہوئی رنگت۔ وہ آدمی کہاں گیا؟ ماضی کی قبر میں کہیں دفن ہو گیا۔ اور یہ آدمی جو آئینے میں کھڑا ہے، یہ تو اس کی پرچھائیں بھی نہیں۔ خدایا، یہ کیا ہوا؟..... وہ حیرت اور صدمے کے حصار میں گھرا ہوا آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا اور اس کا دل دھیرے دھیرے ڈوبتا

گیا۔ آنکھوں کے سامنے وہ منظر ابھر آیا جب آخری بار سلطانہ سے ملا تھا۔ اس کا شاداب اور منور چہرہ، اس کے سیاہ بال اور مرمر سے تراشا ہوا اس کا سراپا جیسے کوئی اساطیری دیوی ہو۔ جواں سال، پُر جمال، پُر شکوہ۔ کیا وہ اب بھی ویسی ہوگی؟..... اُس نے سہم کر اپنے چہرے کو دیکھا اور دہشت سے اُس کا دل کانپ گیا۔ نہیں، شاید وہ ویسی نہیں ہوگی۔ جب وہ خود اپنا سایہ بن گیا ہے تو وقت نے اس سے بھی اپنا خراج ضرور وصول کیا ہوگا۔ بہاریں رخصت ہو چکی ہوں گی۔ تنویریں ماند پڑ گئی ہوں گی۔ شاید اس کے چہرے پر بھی لکیریں ہوں۔ شاید اس نے بھی چشمہ لگا رکھا ہو۔ اُس نے تصور میں سلطانہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور اسے مزید ڈر لگا۔

وہ اک عالمِ وحشت میں کمرے سے باہر آیا اور شش و پنج کے عالم میں سوچنے لگا، کیا کرے؟ سلطانہ کو دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ سلطانہ جو پچھتیس سال سے اس کے تصور میں رہتی ہے، اس کی اپنی ہے۔ جبکہ یہ سلطانہ پرانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس پرانی سلطانہ کو دیکھے تو اس کی اپنی سلطانہ مر جائے۔ ہاں، یقیناً وہ مر جائے گی۔ کیا وہ اس کی موت کو برداشت کر سکے گا؟ کیا اس صدمے کو جھیل سکے گا؟ نہیں، بہت مشکل ہے یہ۔ کڑا امتحان ہے۔ وہ اس سلطانہ کو کفن میں نہیں لپیٹ سکتا۔ وہ اسے زندہ رکھے گا کہ اس ایک جواں سال، دلکش اور حیات افروز شبیہ کے سہارے ہی تو اس نے شب و روز کا دکھ بھرا سفر طے کیا ہے۔ وہ شبیہ اس کا مکمل سرمایہ ہے، اس کی بیساکھی ہے، اس کا زادراہ۔ اگر وہ شبیہ مر گئی تو زندگی کے باقی دن کیسے گزارے گا؟ تو پھر کیا کرے؟

کیا اپنا زادراہ لٹ جانے دے؟ اُس نے بیزاری سے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے تھے۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ غلٹ سے سیڑھیاں طے کیں، نیچے آیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اکبری باجی صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

”ارے شہاب! کہاں جا رہے ہو؟..... سلطانہ تو بس اب آ ہی رہی ہوگی۔“

”باجی! میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ لے کر ابھی آتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ تیز تیز قدموں سے گلی طے کی، سڑک پر پہنچ کر دائیں جانب مُڑا اور غلٹ کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت سات بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ کوئی سو سو سو قدم چل کر وہ خود بخود رکا اور غیر ارادی طور پر مُڑ کر دیکھا۔ گلی کے سامنے ایک کار آ کر رکی تھی اور اس میں سے ایک عورت جو گہرے رنگ کی شال اوڑھے تھی، اُتر رہی تھی۔ ایک جوان

عورت اور ایک بچہ پہلے ہی کار سے اتر چکے تھے۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذرا غور سے دیکھا۔ فاصلہ بھی تھا اور شام کا گہرا دھند لکا بھی، اس بنا پر پہچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم اسے یقین کی حد تک شبہ ہوا کہ شال والی عورت سلطانہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہ چند لمحے گم صم اور حسرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ گلی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا۔



پورا سچ

پوپو نے نجو کی گڑیا چھین کر دور پھینک دی۔ نجو نے زور سے چیخ ماری اور پوپو کے بال پکڑ کر پھینچے۔ پوپو چلایا تو جی نے بھی ایک دھول اس کی پیٹھ پر جما دی۔ پوپو نے چیخ کر دہائی دی۔

”اماں.....“

بڑی آپا نے باورچی خانے سے ہانک لگائی۔ ”پوپو! نجو! لڑومت۔ آرام سے کھلو۔“ نیچے گلی میں کسی پھیری والے کی آواز گونجی۔ ”تازہ سبزیاں لے لو۔ آلو، بیٹنگن، بھنڈی،

پالک۔“

پھر کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ ”ارے بھیا! ذرا ٹھہرنا۔“

میں نے زور سے سانس لی اور بیزار ہو کر قلم میز پر ڈال دیا۔ کرسی سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر آیا۔ گھرے سے ایک گلاس پانی نکال کر پیا اور چاروں طرف خالی خالی نظر ڈالی۔ پوپو، نجو اور جی صحن میں کھیلنے بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جھگڑنے میں مصروف تھے۔ آنگن میں صبح کی دھوپ پھیلی تھی۔ بڑی آپا باورچی خانے میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ میں نے باورچی خانے پر نظر ڈالی۔ تازہ شلجم کا ڈھیر نظر آیا۔ میں نے برا سامنہ بنایا۔ پھر وہی شلجم۔ کہتے ہیں، شلجم بہت مفید سبزی ہے۔ خون صاف کرتی ہے۔ مگر میں شلجم دیکھتا ہوں تو میری طبیعت ہی صاف ہو جاتی ہے۔ سبزیوں میں کدو کے بعد شلجم دوسری سبزی ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں۔ پھر بھی آئے دن شلجموں سے نہر آرزما ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ اماں اور بڑی آپا کو یہ کم بخت شلجم بہت پسند ہیں۔ چنانچہ جب دیکھو، تب شلجم پکتے رہتے ہیں۔ میں چند لمحوں تک معاندانہ نظروں سے شلجموں کو گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ بڑی آپا سے شکوہ کروں۔ مگر پھر ارادہ بدل دیا کہ حاصل کچھ نہ ہوتا۔ بڑی آپا سے جواب میں بس ایک گھورتی ہوئی نظر ہی ملتی۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے آنگن کی دیوار پر نظر ڈالی جہاں ایک کوا آ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی کرخت،

بے سُر آواز میں زور زور سے کائیں کائیں کرنے لگا تھا۔

”اے چپ.....“ میں نے دل ہی دل میں اسے ڈانٹا۔

پھر میں نے ایک بار پھر اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی۔ ’کہانی..... کہاں ہے کہانی؟‘

دراصل گزشتہ چند ایک دن سے میں کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلی کہانی کوئی دو ماہ قبل لکھی تھی۔ اس کے بعد خشک سالی شروع ہو گئی۔ ذہن ایک چٹیل، سوکھا، بخر میدان بن گیا تھا۔ ویران، خالی اور اُجاڑ۔ ہوا کا کوئی جھونکا تھا نہ بارش کی ایک بوند۔ گھاس کا ایک تنکا تک کہیں نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے بہت کوشش کی تھی، اس سوکھے، بخر میدان کی آبیاری کرنے کی۔ ذہن کو آمادہ اور یکسو کرنے کے لاکھ جتن کئے تھے۔ کوئی بھٹکا ہوا خیال، کوئی اڑتا ہوا خاکہ۔ مگر سب بے سود۔ رتی برابر کامیابی نہیں ہوئی جو رفتہ رفتہ میرے لئے شدید ذہنی غلبان کا سبب بنتی چلی گئی۔ ذہن پر بوجھ، اعصاب میں تناؤ۔ عجیب بے کیفی اور بے زاری کی کیفیت طاری تھی مجھ پر۔ ہر شے بری لگ رہی تھی اور ہر شے پر غصہ آتا تھا۔ لال لال خلموں پر، نجو کی گڑیا پر اور دیوار پر بیٹھے ہوئے کم بخت، منحوس، بد صورت کتے پر جو اس طرح کائیں کائیں کر رہا تھا..... گویا مجھ پر ہنس رہا ہو۔

”اے چپ..... مردود“ میں نے من ہی من میں اسے کوسا۔

دراصل کہانی لکھنے کا معاملہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا نشے کا ہوتا ہے۔ جب تک نشہ رہتا ہے، طبیعت خوش رہتی ہے۔ رگوں میں ترنگ کی لہری دوڑتی رہتی ہے۔ پوری دنیا ہری بھری اور نشے میں جھومتی نظر آتی ہے لیکن جوں ہی نشہ ٹوٹتا ہے، اعصاب کشیدہ ہونے لگتے ہیں۔ ذہن پر تھکن کا حملہ ہوتا ہے اور طبیعت میں اتنی جھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر شے پر طیش آتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی اور کئی دن سے تھی۔ میں جانتا تھا، اس کا ایک ہی علاج ہے۔ کہیں سے کسی نکتے، کسی خیال کا ایک خوب صورت آوارہ پرندہ آ کر میرے شانے پر بیٹھ جائے۔ میں پیار سے اسے دیکھوں، اس کے بال و پر سنواروں اور قلم لے کر بیٹھ جاؤں۔ نشہ پورا ہو جائے گا تو طبیعت بھی بحال ہو جائے گی۔ مگر وہ پرندہ کہاں تھا؟ میں نے اُکتاہٹ بھری نظروں سے نجو کی گڑیا کو گھورا، پھر کتے کو ایک گالی دی اور بیزار قدموں سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں قدم رکھا تو معائنہ کر رک گیا۔

وہ میز کے دوسری جانب والی کرسی پر بیٹھی تھی اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ حد درجہ حسین اور شاہانہ پوشاک میں ملبوس۔ اس کے بدن پر زیورات بھی تھے۔ مگر

ایسے انوکھے، خوب صورت زیورات جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جگمگ کرتے ہوئے۔ ان سے ہفت رنگ کر نیں پھوٹ رہی تھیں جو فضا میں جگنوؤں کی طرح رقصاں تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ نفیس، انمول اور ان چھوٹی۔ پھر اس کا چہرہ، اتنا حسین کہ میں نے اتنا حسین چہرہ سنے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آنکھیں، ناک، پیشانی، ہونٹ اور ٹھوڑی۔ باوقار، پُر تمکنت اور مغرور۔ ایک ایک خط اپنی جگہ اتنا مکمل تھا کہ اس سے زیادہ تکمیل کا تصور ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی تھی۔ ایسی کہ دیکھنے والا مبہوت، مرعوب ہو کر رہ جائے۔ دل کو طمانیت، آنکھوں کو سکون اور دیکھنے والے کو اپنی ذات کا اعتبار بخشنے والا نور۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کی باسی نہیں۔ شاید کسی اور جہاں سے آئی ہے۔ مگر وہ کون تھی؟ اور کہاں سے آئی تھی؟ اور کیوں آئی تھی؟ ابھی میں سٹپٹایا ہوا اس خلبان میں مبتلا تھا کہ وہ معاً ذرا کھل کر مسکرائی اور اس کی آنکھوں کے ستارے مزید روشن ہوئے۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”تم اندر کیسے آئیں؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

اس نے عقبی دیوار کی کھلی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کھڑکی سے۔“

میں مزید کچھ کہے بغیر اور زیادہ ہراساں ہو کر دروازے کی جانب لپکا تو وہ ہنس کر نفرتی آواز میں بولی۔ ”دروازہ مت بند کرو اور گھبراؤ مت۔ تمہارے سوا مجھے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“

”گویا صرف میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں؟“

”ہاں، دیکھ سکتے ہو اور باتیں بھی کر سکتے ہو۔“

میں چند لمحے تعجب اور تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا اور اُس کے اس دنیا سے ماورا کسی اور جہاں کے سراپا کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنی آواز سن کر شاید کہیں پاتال سے آئی تھی۔

”مگر تم کون ہو؟“

”میں کہانی ہوں۔“

”کہانی.....؟“

”ہاں۔“

میں نے اپنی کاپی اور قلم پر نظر ڈالی، پھر اُلجھ کر کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”اس میں الجھن کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تم کہانی لکھتے ہو۔ اور میں کہانی ہوں۔“

میں نے زور سے سانس لی اور حواس کے آوارہ پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ بات

کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ میں قلم کار ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔ اور وہ ایک کہانی ہے اور میرے پاس آئی ہے۔ مگر کیوں؟..... کہانی کی آمد کے اس تجربے سے پہلے تو کبھی میں دو چار نہیں ہوا۔ کہانیاں یوں تو نہیں آتیں بلکہ ان کا نزول کچھ اور طرح سے ہوتا ہے۔ کبھی اخبار میں چھپی ہوئی کوئی خبر پڑھ کر، کبھی ایک روٹی کے لئے پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر، کبھی اس ماں کی خالی گود دیکھ کر جس کا لخت جگر فساد میں مار دیا گیا ہو۔ اور کبھی کسی معصوم بچے کے ہونٹوں پر کھیلی ہوئی فرشتوں جیسی مسکراہٹ دیکھ کر۔ تب دل پر اثر ہوتا ہے اور کہانی ایک الہام کی طرح وجدان کے افق پر طلوع ہوتی ہے۔ یوں کھڑکی سے آ کر کرسی پر تو نہیں بیٹھ جاتی۔ بے شک گزشتہ کئی دن سے میں کہانی لکھنے کے لئے بے چین ہوں۔ منتشر ہوں اور ایک شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ مگر کہانی اس طرح میرے پاس آئے گی، یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ کہانی ہے مگر کس قسم کی کہانی ہے؟ اس کا موضوع کیا ہے؟ ہیئت کیا ہے۔ اس کا کس علاقے، کس زمانے سے تعلق ہے؟ کیا وہ کسی خاص نظریے سے تعلق رکھتی ہے؟ میرے پاس آنے سے اس کا منشا کیا ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ میں اسے لکھوں؟

”تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟“ آخر کار میں نے لب کھولے۔

”تمہاری مدد کرنے۔“ اس نے متبسم ہونٹوں سے کہا۔

”میری مدد؟..... وہ کیسے؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ نرم اور صاف آواز میں کہنے لگی۔ ”تم کئی دن سے کہانی لکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بار بار کہانی شروع کرتے ہو۔ دو چار سطریں، اور بس۔ بات نہیں بنتی۔ اور تم صفحہ توڑ مروڑ کر ٹوکری میں پھینک دیتے ہو۔“ اس نے رک کر ٹوکری کی طرف اپنی لمبی مخروطی انگلی سے اشارہ کیا۔ ”تم کئی راتوں سے ٹھیک سے سوئے بھی نہیں۔ چڑچڑے ہو گئے ہو اور بات بات پر جھنجھلا جاتے ہو۔ آخر ایسا کیوں؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے افسردگی سے کہا اور آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”در اصل یہ تخلیقی کام بہت جاں سوز اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ من میں کچھ لکھنے کی شدید خواہش موجود ہو اور باوجود دس پچھلے کے بات نہ بن رہی ہو تو دل و دماغ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اعصاب چیخنے لگتے ہیں۔ تم تو خود کہانی ہو، اچھی طرح واقف ہو گی کہ ایسی صورت سے دو چار ہونے کے بعد کہانی کار کو اس وقت تک سکون نہیں ملتا، جب تک وہ کہانی نہ لکھ لے۔ میری بھی ایسی ہی حالت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟“

”مجھے تعجب تو اسی بات پر ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں کہانی کیوں نہیں ملتی؟ کہانیاں تو

چپے چپے پر بکھری پڑی ہیں۔“

”چپے چپے پر؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”ہاں..... باہر نکل کر دیکھو۔ زندگی کے جتنے روپ ہیں، کہانیاں بھی اتنی ہی ہیں اور ہر گلی، ہر کوچے، ہر کنڑ پر بکھری پڑی ہیں۔ بظاہر نظر نہیں آتیں، اس موتی کی طرح جو سیپ میں بند ہوتا ہے۔ لیکن اگر تمہارے پاس نگاہ دور بین ہے اور تم ظاہری حقیقتوں کے پیچھے جھانکنے کا ہنر بھی جانتے ہو تو ان کہانیوں کو دیکھ سکتے ہو، ان سے باتیں کر سکتے ہو۔ اور انہیں لکھ بھی سکتے ہو۔“

میں کچھ حیرت اور شرمندگی سے اسے دیکھتا رہا۔ طے نہ کر سکا کہ کیا کہوں۔

چند لمحے توقف کے بعد اس نے خود ہی لب کھولے۔ ”اور پھر یہ بھی ہے کہ کہانیاں یوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے سے نہیں ملتیں۔ کبھی کبھی باہر نکلتا پڑتا ہے۔ گلی کو چوں میں بھٹکتا پڑتا ہے، تب کہیں گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔ آؤ، اٹھو۔“

”کہاں؟“

”باہر۔ میں تمہیں دکھاؤں گی کہ کتنی کہانیاں گلی کو چوں میں بکھری پڑی ہیں۔“



کچھ دیر بعد میں نے خود کو شہر کے مرکزی بازار میں پایا۔

نگاہ ادھر ادھر بھٹکی اور مارکیٹ کی کہنہ اور بد ہیئت عمارت پر مرکوز ہو گئی۔ مارکیٹ کے داخلی دروازے سے کچھ لوگ باہر نکل رہے تھے، کچھ اندر جا رہے تھے۔ یہ مارکیٹ بنیادی طور پر گوشت کے لئے مختص تھی۔ مگر اب اس میں پھل اور سبزی کی دکانیں بھی ہیں۔ صبح سے بعد دوپہر تک مارکیٹ کے اندر ایک آفت برپا رہتی ہے۔ گاہکوں کا جھگڑا رہتا ہے۔ ہاؤ ہو اور شور شرابے کی بناء پر کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ صفائی کا انتظام بے حد ناقص ہے۔ فرش پر کوڑا کرکٹ اور پانی بکھرا رہتا ہے۔ کتے اور بلی بھی اکثر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں اور مارکیٹ کی فضا میں، ہوا کی آمد و رفت مسدود ہونے کی بناء پر مچھلی اور گوشت کی بو جھل اور انتہائی ناگوار بو آوارہ خرام رہتی ہے جو اچھے بھلے تروتازہ ذہن کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ مارکیٹ کے دروازے سے باہر نکلتی ایک خوش لباس عورت کو دیکھ کر مجھے اپنا دوست یاد آیا، جس نے ایک بار ہنس کر کہا تھا۔

’یار! میں تو اس مارکیٹ میں جب بھی جاتا ہوں، عطر کی شیشی ساتھ لے جاتا ہوں۔‘

مارکیٹ کے باہر وسیع اور طویل فٹ پاتھ ہے جہاں بھانت بھانت کے لوگوں کی آمد و رفت ہر وقت جاری رہتی ہے۔ جگہ جگہ ریڑھی والے انواع و اقسام کی اشیاء فروخت

کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے پلاسٹک کی شیٹ بچھا کر زمین پر بھی چھوٹی چھوٹی دکانیں سجائی ہوتی ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جن میں صرف کاریں اور رکشے ہی نہیں بلکہ بسیں اور ٹرک بھی شامل ہیں۔ کچھ اوقات میں کاروں اور بسوں وغیرہ کا رش اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ سڑک تقریباً بند ہو جاتی ہے۔ بسیں آہستہ آہستہ ریگتی ہیں اور پانچ منٹ کا راستہ پچاس منٹ میں طے ہوتا ہے۔ ساری فضا دھوئیں اور پیٹرول کی بو سے کثیف اور آلودہ رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو دھوئیں کی کثافت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ اوپر سے شور، کاروں اور ٹرکوں کے ہارن اپنی مکروہ اور اعصاب شکن آواز میں چیخنے رہتے ہیں۔ ریڑھی والوں کی آوازیں اور چائے خانوں سے بلند ہونے والے فلمی گانوں کی صدائیں۔ ایک ایسا حشر برپا رہتا ہے کہ کان پڑی آواز سننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ شہر کا یہ حصہ دراصل ایک لحاظ سے ایک ایسا پیانہ ہے جس میں معاشرے کی ہر بھلک نظر آتی ہے۔ سماج کا پتھوراما۔ یہاں چور بھی آتے ہیں اور ساہوکار بھی۔ یہاں سے نادار کا گزر بھی ہوتا ہے اور زردار کا بھی۔ وہ بھی آتے ہیں جو جیمیں کاٹتے ہیں اور وہ بھی جن کی جیمیں کٹتی ہیں۔ یہاں ایسے بھی ہیں جو خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر دھوکا دیتے ہیں اور وہ بھی یہاں آتے ہیں جو ان مقدس اور پاک ناموں کو سن کر دھوکا کھاتے ہیں اور مطمئن نظر آتے ہیں..... ہمارا پورا اجتماعی، قومی مزاج اس پورے بازار کے ہنگام اور افراتفری سے منعکس ہوتا ہے۔

میں پہلے بھی ان گنت بار اس مارکیٹ میں آیا تھا مگر اس طرح کے بازار سے گزرا تھا، خریدار نہیں تھا۔ ایک سرسری نظر ادھر ادھر ڈالتا ہوا، ناک پر انگلی رکھے، بھیڑ سے بچتا ہوا تیز قدموں سے گزر جاتا تھا۔ مگر اس وقت میری آمد کا مقصد مختلف تھا۔ اُس نے کہا تھا، کہانیاں تو قدم قدم بکھری پڑی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ میری نگاہ میں، جو اطراف میں بھٹک رہی تھی، جستجو بھی، جستجو بھی تھی۔ بھٹکتی ہوئی نظر سب سے پہلے پولیس کے ایک جوان پر پڑی جو قریبی دکان کی بغل میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ کالی پتلون اور خاکی قمیص میں ملبوس۔ ستا ہوا سیاہ چہرہ، مدقوق جسم، آنکھوں سے زردی جھانکتی ہوئی۔ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آتا تھا۔ وہ خوفزدہ لمحے میں بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

”حوالدار جی! بس اس بار معاف کر دیجئے۔ پھر کبھی نہیں کروں گا۔“

”اے حرامی! پچھلی بار بھی تُو نے یہی کہا تھا۔“ سپاہی ڈپٹ کر بولا۔

”مگر حوالدار جی! یقین کیجئے، میں..... میں.....“

”چپ..... حرامی.....“ سپاہی نے پھر گھر کا۔ ”بکواس کرتا ہے۔ کیا یقین کروں؟“

ہر بار تو یہی کہتا ہے، اب نہیں کروں گا، لیکن پھر چرس بیچتا ہے۔ سالے! اگر ایک بار اندر کر دوں تو اپنی ماں کا نام تک بھول جائے گا۔“

وہ آدمی کچھ دیر نیکی نظروں سے سپاہی کو دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر جھلاہٹ نمودار ہوئی، ساتھ ہی آنکھوں میں حقارت کی جھلک بھی ابھری۔ اُس نے یکایک اپنے استخوانی جڑوں کو حرکت دی۔ سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر طنزیہ آواز میں بولا۔

”ارے حوالدار جی! زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تم کیا اندر کرو گے۔ اگر کرو گے بھی تو تم کو پتا ہے کہ ”اوپر“ والے مجھے فوراً ”باہر“ کر دیں گے۔ کیونکہ ان کا ”ہفتہ“ انہیں پہنچ جاتا ہے۔ اور بات صرف چرس کی ہی نہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔ تمہیں بھی معلوم ہے۔ معلوم ہے نا؟ تو پھر جیسا بات مت بولو۔ بتاؤ کیا چاہئے؟“

سپاہی یکایک نرم پڑ گیا۔ گالی دے بغیر بولا۔ ”اچھا خیر، نکال۔ کیا ہے تیرے پاس؟“

”ابھی کچھ نہیں ہے۔ سام کو گھر پہنچ جائے گا۔“

”اے کچھ تو دے۔ ضرورت ہے۔“

میں چپ چاپ دیکھتا گیا۔ میری آنکھوں نے اس آدمی کے سیاہ بد صورت ہاتھ کو جیب میں جاتے دیکھا، پھر چند نوٹوں کو اس کے ہاتھ سے سپاہی کے ہاتھ میں منتقل ہوتے دیکھا۔ دس کے محض دو یا تین نوٹ۔ پھر وہ آدمی بڑبڑاتا ہوا، غالباً زیر لب سپاہی کی ماں بہن ایک کرتا ہوا دکان کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔

یکایک کہانی کی تسخیر آمیز مہی کی آواز کانوں میں آئی۔ ”دیکھتا تم نے؟“

میں نے گردن گھا کر کہانی کی طرف دیکھا اور یک لخت چونک پڑا۔ شٹنا کر دائیں بائیں دیکھا۔ کہانی کہاں گئی؟..... ابھی تو یہیں تھی۔ ایک پل پہلے اس کی آواز سنی تھی۔ پھر میری حیران اور سوالیہ نظریں ادھر ادھر بھٹک کر اُسی عمر رسیدہ عورت پر جم گئیں جو سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال کھجڑی ہو چکے تھے۔ چہرے پر اتنی جھریاں تھیں جتنے اس دنیا میں دکھ ہوں گے۔ کندھے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے زندگی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے وہ بالکل ٹوٹ گئی ہو۔ اس کے میلے اور بوسیدہ کپڑوں پر مفتوحہ قوموں کے شکست خوردہ پرچموں کے مانند کتنے ہی پیوند لگے تھے۔ دوپٹے میں ان گنت چھید، جیسے اس کے نصیب میں رہے ہوں گے۔ آنکھوں سے محرومی اور یاسیت جھانک رہی تھی۔ میں نے زور سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”تم.....؟“

”ہاں میں ہی ہوں۔ تمہیں تعجب ہو رہا ہے نا؟“

میں نے دھیرے سے سانس لی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔
 ”ہاں..... مگر یہ سب کیسے؟“

”کہانی ہوں نا۔“ وہ تیکھے انداز میں مسکرائی۔ ”ہزاروں روپ بدل سکتی ہوں۔ ایسے ایسے روپ جو تمہارے خواب و خیال سے بھی پرے ہوں۔ اور سارے روپ ایک دوسرے سے مختلف۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد۔ میں کل بھی تھی، آج بھی ہوں اور کل بھی رہوں گی۔ تم تو جانتے ہو، آخر کو قلم کار ہو۔“

”خیر یہ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔ ”مگر اس وقت یہ روپ؟“
 ”اُدھر دیکھو.....“ اُس نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے دائیں جانب کچھ فاصلے پر استادہ لیمپ پوسٹ کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر چونکا۔ وہ وہاں بھی موجود تھی۔ لیمپ پوسٹ کے قریب کھڑی تھی۔ اس عمر رسیدہ عورت اور کہانی میں سرمو فرق نہیں تھا۔ چہرہ مہرہ، عمر، حلیہ، چہرے پر یاسیت اور آنکھوں سے جھانکتی بے وقستی، محرومی اور لاچاری۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اس نے مدت سے کوئی خوشی نہیں دیکھی ہے۔ جیسے اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ جیسے دکھ اس کی ذات پر آ کر ختم ہو گئے ہوں۔ اس کا رعشہ زدہ ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک اور عورت کھڑی تھی۔ ریشم و کم خواب میں ملبوس، سونے اور ہیروں سے آراستہ۔ ایک شاہانہ، فاخرانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے۔ ریشم، کخواب والی عورت کا ہاتھ بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت شاہانہ انگلیوں میں ایک سکہ دبا ہوا تھا۔ جبکہ بوزھی، بد حال عورت کی ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا، اگلے پل کیا ہوگا؟ سکہ انگلیوں سے چھوٹے گا اور پھیلی ہوئی ہتھیلی پر گرے گا۔ ایک منظر جو اس دنیا میں اربوں کھربوں بار دہرایا گیا ہے، ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے گا۔ میں نے سہم کر کہانی کی طرف دیکھا۔

”ہاں، یہ میں ہوں۔ میرا ایک روپ۔“ کہانی نے کہا۔ ”اس طلائی ہاتھ کو دیکھو جس کی انگلیوں میں سکہ دبا ہوا ہے۔ اس پھیلی ہوئی ہتھیلی کو دیکھو جس پر سکہ گرے گا۔ یہ دونوں ہاتھ تم سے کچھ کہہ رہے ہیں، اپنی اپنی کہانیاں سن رہے ہیں۔ اس فاصلے کی کہانیاں جو دونوں ہاتھوں کے درمیان ہزاروں سال سے ہے۔ اگرچہ یہ فاصلہ چند انچ سے زیادہ نہیں، مگر شاید اس وقت سے ہے جب سے معاشرہ وجود میں آیا ہے۔ گزرے وقتوں میں اس دنیا میں بے شمار نیک اور صاحب دل لوگوں نے اس فاصلے کو مٹانے کی بہت کوشش کی۔ سچ پوچھو تو کبھی کبھی کچھ کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن دونوں ہاتھوں کے بیچ یہ فاصلہ آج بھی باقی ہے۔“ کہانی نے رک کر مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”سکہ گرنے کے عمل کا ایک پہلو فاخرانہ

ہے، دوسرا ذلت اور تحقیر آمیز۔ تم نے کبھی اپنی ہتھیلی پر سکہ گرنے کی ذلت اٹھائی ہے؟“
میں نے دہشت زدہ ہو کر کہانی کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔

کہانی تلخی سے ہنسی اور قدرے توقف کے بعد بوڑھی، مفلوک الحال عورت کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”کبھی اس کا، میرا بھی ایک گھر تھا۔ چادر اور چہار دیواری کا سٹکھ مجھے بھی حاصل تھا۔ دو بچے تھے، بیٹا اور بیٹی۔ شوہر کو فساد میں مار دیا گیا، بیٹا ہیروئن کا عادی ہو کر مر گیا۔ کیونکہ بیکاری اور غربت نے اس سے جینے اور لڑنے کی اُمنگ چھین لی تھی۔ بیٹی کو طلاق ہو گئی۔ اب وہ دائمی مریض ہے اور جھوپڑی میں پڑی کھانستی رہتی ہے۔“ کہانی نے رک کر زور سے سانس لی اور المناک نظروں سے اپنے جسمانی روپ کی طرف دیکھا۔ ”اب میں بے آسرا ہوں۔ ایک جھوپڑی میں رہتی ہوں اور بھیک مانگتی ہوں۔ کیونکہ جب تک زندہ ہوں، تب تک جینا تو پڑے گا نا۔“

”اور تمہارا گھر.....؟“

”چھن گیا۔“ کہانی تلخی سے مسکرائی۔

”مگر کیسے؟..... کیسے ہوا یہ سب کچھ؟“

کہانی کے ہونٹوں پر ایک تنکھی، استہزا بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم سوچو۔ اپنے تخیل کو ہمیز کرو۔ میری آنکھوں میں، اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔ اندر اُتر دو کہانی کا کھوج لگاؤ۔ قلم کار ہونا تم۔“

میں شرمندہ ہوا۔ ”ہاں خیر، یہ تو ٹھیک ہے۔ یہ جستجو مجھے ہی کرنی چاہئے۔“

کہانی چپ ہو گئی۔ میں گہرے تجسس کے ساتھ اس کی زرد، مرجھائی، نیم زندہ آنکھوں کے عمق میں اُترا۔ ایک کھنڈر تھا۔ اُجاڑ، ویران، آسیب کا مارا۔ جگہ جگہ بنجر پڑے تھے۔ خواہشوں اور اُمیدوں کے بے کفن لاشے۔ بدہیت دیواروں پر چڑیلیں الٹی لٹکی تھیں اور بین کر رہی تھیں۔ یہ کھنڈر اتنا روح شکن تھا کہ میں خوفزدہ ہو کر واپس آ گیا۔ حرماں نصیبی اتنی بے پناہ ہو سکتی ہے، مجھے گمان بھی نہ تھا۔ پھر میں نے کہانی سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ کہانی طنز یہ انداز میں مسکرائی۔

”ذُر گئے.....؟“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ پہلے نگاہ ان دو بچوں پر پڑی جن کی عمریں بارہ اور تیرہ سال کے آس پاس رہی ہوں گی۔ جسم پر پھٹے پرانے ٹکڑے، ہاتھ غلیظ اور پاؤں چپلوں سے محروم۔ دونوں فٹ پاتھ پر اپنی بوٹ پالش کی چھوٹی سی دکان سجائے بیٹھے تھے اور آتے جاتے لوگوں کو پُر اُمید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”صاحب! بوٹ پالش۔ جوتا ایک دم شیشے کی مالک چمکا دوں گا۔“
 کاش یہ دونوں اپنی قسمت بھی شیشے کی ”مالک“ چمکا سکتے۔ میں نے افسردگی سے سوچا۔
 پھر نظر قریبی ریڑھی کے مالک کی جانب اٹھی۔ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ سر پر چوگوشیہ
 ٹوپی، ماتھے پر ڈھٹے کا گہرا نشان، نفاست سے ترشی ہوئی گھنی سیاہ داڑھی، بھورے گرتے
 پاجامے میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں گونا کناری کا ایک پیکٹ تھا اور وہ اپنے سامنے
 کھڑی ہوئی نوجوان عورت سے، جو غالباً پیکٹ خریدنا چاہتی تھی، پرجوش آواز میں کہہ رہا تھا۔
 ”ارے محترمہ! مسلمان ہوں میں۔ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے۔ چند پیسوں کے لئے
 بے ایمانی کر کے اپنی عاقبت نہیں خراب کروں گا۔“

”اچھا، تو پھر دے دیجئے۔“ نوجوان عورت نے آخر کار کہا۔
 میں سانس روکے دلچسپی اور گہری توجہ سے دونوں کو دیکھتا رہا۔ عورت پیکٹ لے کر اور
 قیمت چکا کر چند قدم چلی گئی تو اس کی پشت کو گھورتے ہوئے ریڑھی کا مالک تنہا آئینہ لہجے
 میں زیر لب بڑبڑایا۔ ”حرام زادی۔“
 میری زبان پر کڑواہٹ کھلی۔ پھر میں نے سوچا۔ ”ہم میں سے کتنے ہیں جو خدا کو منہ
 دکھانے کے قابل ہیں؟“

اب میری نگاہ کا مرکز ایک اور ریڑھی والا بنا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو
 گی۔ سرمندا ہوا تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ میری نگاہ ہر چند کہ یونہی بے دھیانی
 میں اس کی جانب اٹھی تھی، مگر پھر وہیں گویا جم کر رہ گئی۔ ریڑھی والے کے قریب ایک لڑکا
 کھڑا تھا۔ پندرہ سولہ سال عمر، کھلتی ہوئی رنگت، مگر چہرہ مرجھایا ہوا۔ ریڑھی والے کے
 ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکواہٹ تھی اور اس کی نظر لڑکے کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ مگر کیسی
 نظر تھی وہ؟ تری ہوئی، گرسنہ، پڑھوس اور زنا کرتی ہوئی۔ اُس کا ایک ہاتھ قمیص کے لمبے
 دامن کے نیچے تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ لڑکے کا گال سہارا رہا تھا۔ میں نے حس ماعت
 کو ایڑ لگائی اور اس کی آواز سنی، وہ لڑکے سے کہہ رہا تھا۔

”ابے کل شام کہاں تھا تو؟..... میں انتظار کرتا رہا۔“

”میں کام سے چلا گیا تھا۔ لڑکا مردہ ہی آواز میں بولا۔“

”اچھا، آج آئے گا؟“

لڑکے نے یوں گردن کو اثبات میں جنبش دی، گویا مجبوری کے سوا، کوئی چارہ نہ ہو۔
 ”اچھا لے، یہ سیب کھا۔“ ریڑھی والے نے ایک سیب اٹھا کر لڑکے کو دیا۔ ”سالے! تو
 بھی کیا یاد کرے گا۔ شام کو آئے گا تو پیسے بھی دوں گا۔ اور ہاں، ذرا ہاتھ بڑھا۔ ابے بڑھا

تو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ تھوڑا سا دل خوش کر دے۔“
میں نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔ کہانی کھلکھلا کر ہنسی۔ تلخ، طنزیہ اور تمسخر آمیز، بظاہر
ہنس گرا ندر اندر ایک کرب آمیز کراہ سے مملو۔ پھر وہ کہنے لگی۔

”ہاں، کچھ کہانیاں بد صورت بھی ہوتی ہیں۔ کریہہ اور غلیظ۔ اتنی کہ آدمی ان کی طرف
دیکھ بھی نہیں سکتا۔ مگر ایسی کہانیاں بھی بہر حال موجود ہیں اور حقیقت ہیں۔ تمہیں ان سے
نظریں نہیں چرانا چاہئے۔ کیونکہ ایسی کہانیاں ان گنت سوالات کو جنم دیتی ہیں۔ کیوں کیسا
ہوتا ہے؟ یہ گندگی کیسے آتی ہے؟ جو لوگ ان کہانیوں کے کردار بنتے ہیں، وہ کیسے لوگ
ہوتے ہیں؟ تمہیں ان پر قلم اٹھانا چاہئے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ معاشرے
میں یہ اور ایسی ہی دوسری بد صورتیاں کہاں سے اور کیسے آتی ہیں؟“
میں چپ رہا اور خالی خالی نظروں سے کہانی کو دیکھتا گیا۔
”اب چلیں۔“ کہانی نے کہا۔



کچھ دیر بعد ہم نے ایک وسیع میدان میں قدم رکھا۔ جہاں انسانی سروں کا سمندر
ٹٹھٹھیں مار رہا تھا۔ وسیع و عریض میدان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک آدمی
ہی آدمی۔ ہر طرح کے آدمی۔ جوان، بوڑھے، ادھیڑ عمر، جوش میں بھرے ہوئے۔ اُن کے
چہرے اندرونی جذبات کی شدت سے دھک رہے تھے۔ وقفے وقفے سے وہ سب ’زندہ باد‘
اور ’مردہ باد‘ کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہر بار نعرے کی آواز اتنی بلند، پُر غضب اور پُر جوش
ہوتی کہ لگتا آسمان بھی شیشے کی طرح جھج جھج کر ٹوٹ جائے گا۔ ان نعروں کا سبب یہ تھا کہ
میدان کے ایک جانب بنے پنڈال کے جھنڈیوں اور کاغذی پھولوں اور نعروں اور ملکی پرچم
سے آراستہ اسٹیج پر ایک بڑے ”رہنما“ تقریر فرما رہے تھے۔ ان کے جسم پر ریشمی کُرتے،
پاجامہ تھا۔ دونوں ہاتھوں کی سات انگلیوں میں قیمتی پتھروں سے مرصع بیش قیمت انگشتریاں،
چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی، سرخ و سپید رنگت۔ بے حد جسیم آدمی تھے۔ جس سے ان کی خوش
حالی کا صاف پتا چلتا تھا۔ وہ گوشتی گرجتی آواز میں تقریر کر رہے تھے۔ ان کے جوش کا عالم
یہ تھا کہ ہونٹوں کے کناروں پر جھاگ نمودار ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی اور
الفاظ ان کے ہونٹوں سے یوں برآمد ہو رہے تھے، گویا انگارے نکل رہے ہوں۔

”لوگو! تم جانتے ہو، ہم نے کیسے کیسے نامور اور جری فاتح پیدا کئے۔ تاریخ کے صفحات
ان کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے ان سوراؤں نے کفار کو پے در پے
شکستیں دی ہیں۔ لیکن آج صورتِ حال مختلف ہے۔ آج ہم ہر محاذ پر ذلیل، خوار ہو رہے

ہیں۔ دشمن ہمیں اور ہمارے دین کو مٹانے کے درپے ہیں۔ کیونکہ وہ ان تمام ہزیموں اور ذلتوں کو آج تک نہیں بھولا۔ اور اب وہ بدلہ لینے پر کمر بستہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک خواب غفلت میں پڑے رہو گے؟ جب تک اپنی آنکھیں اور کان بند رکھو گے؟ اور کب تک اللہ کی پکار نہیں سنو گے؟ وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی پکار سنو اور اٹھ کھڑے ہو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سر سے کفن باندھو اور جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھو جب تک اس دھرتی پر ایک بھی کافر موجود ہے۔“

عالم محترم کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور میں سراسیمہ سا کھڑا تھا۔ میرے تصور میں انتشار، بدعنوانی، بدحالی، غریبی، لاچاری، بھوک اور دہشت کے ان گنت مناظر گھوم رہے تھے۔ بھوک، ذلت اور محرومی جو دنیا کے کتنے ہی دوسرے ملکوں میں تھی اور میرے ملک میں بھی تھی۔ لاکھوں، کروڑوں انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی سے محروم تھے اور ترس ترس کر جینے کا سوانگ رچانے پر مجبور تھے۔ مقرر کہہ رہا تھا، جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جہاد؟..... کس کے خلاف؟..... پھر مجھے ایک گفتگو یاد آئی جو اسی عالم سے کی گئی تھی اور کچھ دن پہلے ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی تھی۔ گفتگو میں مقرر سے ملکی بدحالی، غربت اور مہنگائی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھا گیا تھا کہ ان مسائل کے لئے کیا، کیا جانا چاہئے؟ تو مقرر نے اپنی بھاری بھر کم توند سہلا کر اور گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے پوری اتھارٹی سے کہا تھا۔

”چور کے ہاتھ کاٹو، عورتوں کو پردے میں بٹھاؤ اور زانی کو سنگسار کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا؟“

”ہاں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر جناب! ملک کی معاشی صورت حال، زرعتی مسائل اور پھر قرضے وغیرہ؟“

”میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عالم صاحب نے سختی سے جواب دیا تھا۔

ایک اور سوال میں جس کا تعلق عالمی حالات سے تھا، عالم صاحب نے کہا تھا۔

”سب اسلامی ممالک خبیث ہیں اور ہمارا ملک تو سب سے بڑا خبیث ہے۔“

میں نے گردن اچکا کر ایک بار پھر مقرر کے دیکتے چہرے کو دیکھا، پھر گردن گھما کر کہانی پر نظر ڈالی۔ کہانی مسکرائی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”اللہ کی پکار۔ کاش اس کم بخت کو اس جملے کے صحیح مفہوم کا پورا ادراک ہوتا۔“ میں نے

ٹھنڈی سانس لی۔

”اور تاریخ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ہم ابھی تک تاریخ کے کرم خوردہ صفحات میں قید ہیں۔“

”اب چلیں.....“ قدرے توقف کے بعد کہانی نے پھر لب کھولے۔

”ہاں، یہاں تو میری سانس پھولنے لگی ہے۔“

میدان سے باہر آ کر میں نے سکون کا سانس لیا اور فٹ پاتھ پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک عبادت گاہ کے سامنے سے گزرے۔ کچھ دن قبل اس عبادت گاہ میں بم کا دھماکا ہوا تھا۔ عبادت گاہ کی عمارت کو خاصا نقصان پہنچا تھا ہر چند کہ اب شکستہ حصوں کی مرمت کر دی گئی تھی لیکن دھماکے کے نشانات کہیں کہیں بدستور باقی تھے۔ مجھے ٹھیک ٹھیک علم نہیں، لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ اس وقت عبادت گاہ میں عبادت گزاروں کی ایک بڑی تعداد مصروف عبادت تھی، جب اچانک بم پھٹا تھا۔ بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تھی۔ متعدد افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور مجروح ہونے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ عبادت گاہ میں بم دھماکے کا یہ کوئی پہلا یا واحد واقعہ نہیں تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں ایسے کئی سانحے وقوع پذیر ہو چکے تھے۔ پورے ملک میں اب عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہی تھیں اور آئے دن تخریب کاروں کی وحشیانہ کارروائیوں کا نشانہ بنتی رہتی تھیں۔ کب، کہاں، کیا ہو جائے، کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہ صرف میرے ملک میں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی۔ دھماکے، ایک کے بعد ایک۔ مجھے ایک پرانے گیت کا بول یاد آیا۔ ’بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے یہ دنیا‘..... کیا واقعی یہ سچ ہے کہ بسی بستیاں کے نیچے بارود کے ڈھیر جمع ہیں۔ اور کسی بھی وقت کوئی دیوانہ، فائر انفیل، جنونی اس بارود کو آگ دکھا دے گا اور یہ بستیاں خاک کا ڈھیر بن جائیں گی۔

آئندہ کچھ دیر میں کہانی نے کئی روپ بدلے۔ سب سے پہلے اس نے ایک نوجوان کا روپ دھارا جس کی آنکھیں زرد تھیں، گال پتکے ہوئے، جسم پر بوسیدہ کپڑے۔ وہ ایک میٹج پر بیٹھا ہوا تھا۔ بے حد ٹوٹا ہوا، آزرده اور یاسیت زدہ۔ وہ اپنا خون بیچتا تھا تاکہ اپنے بچوں کے لئے روٹی خرید سکے اور اپنی نشے کی لت بھی پوری کر سکے۔ اس وقت اس کے بے حد مایوس اور دکھی ہونے کا سبب یہ تھا کہ ہسپتال والوں نے اس بناء پر کہ اس کی حالت بے حد خستہ ہو چکی ہے، اس کا خون مزید خریدنے سے انکار کر دیا تھا اور اب وہ حیران اور متفکر تھا کہ روٹی کیسے خریدے گا اور نشہ کیونکر پورا کر سکے گا۔

جب کہانی کئی روپ بدل چکی اور میں کئی مناظر دیکھ چکا تو ہم ایک پولیس تھانے میں

داخل ہوئے۔ تھانے میں موجود چند نہایت ”ذمے دار“ اور ”فرض شناس“ اہل کار اپنے ”سرکاری“ فرائض کی انجام دہی میں ”معمول“ کے مطابق مصروف تھے۔ مثلاً یہ کہ دو سپاہی برآمدے میں ایک مدقوق سے آدی سے کسی ”جرم“ کے سلسلے میں ”پوچھ گچھ“ کر رہے تھے اور ان کی پوچھ گچھ کا انداز وہی تھا جو عموماً ہوتا ہے۔ یعنی ان کی زبان سے الفاظ کم اور گالیاں زیادہ نکل رہی تھیں۔ مدقوق سا آدی گھگیا کر اور بار بار ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

”حضور! چاہے جیسی قسم لے لیجئے، میں نے یہ جرم نہیں کیا ہے..... میں تو وہاں تھا ہی نہیں۔“

”ابے حرامی! جب ہم کہہ رہے ہیں کہ تُو نے یہ جرم کیا ہے، تو کیا ہے۔ کیوں بکواس کئے جا رہا ہے؟“ ایک سپاہی نے غرا کر کہا اور ماں کی گالی دی۔

ایک اور سپاہی برآمدے کے باہر استادہ پیڑ کے نیچے پڑی بیچ پر نیم دراز چائے پینے میں مصروف تھا اور وقفے وقفے سے دونوں سپاہیوں کو ”سالے کی کھال اُتار دینے“ کا مشورہ دے رہا تھا۔ ہم اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور آفسر انچارج کے کمرے میں جھانکا۔ آفسر انچارج ایک بھاری بھر کم آدی تھے اور اس وقت اپنی بھاری کمر کم موچھوں کے ساتھ ایک بنیان اور پتلون میں ملبوس آرام کرسی پر نیم دراز محو استراحت تھے۔ کیا کرتے بیچارے۔ قانونی ذمے داریاں بہت زیادہ تھیں۔ چوبیس گھنٹے کی مصروفیت۔ تھک جاتے تھے۔ لہذا جب جب موقع ملتا تھا، تھوڑی دیر آرام کر لیتے تھے۔ ہم نے انہیں نظر انداز کیا اور حوالات کی طرف بڑھے۔ اس وقت کہانی نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ اب وہ ادھیڑ عمر کی ایک گھر گرہست، قناعت پسند، صابر و شاکر اور اپنے گھر کو جنت سمجھنے والی عورت کے روپ میں تھی۔ سادہ اور نیک اطوار۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو متوسط طبقے کی لاکھوں عورتیں پہنتی ہیں۔ مگر اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھوں میں حزن اور چہرے پر اندوہ کی پرچھائیاں۔ میں یکایک حیران ہوا۔

”تم اتنی غم زدہ کیوں ہو؟“

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”پریشان نہ ہو۔ اپنے دکھ کا ماجرا ابھی تمہیں سناؤں گی۔“

حوالات میں پانچ افراد تھے۔ پانچ ملزم کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ کہانی نے تین کو نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ لپے لفنگ قسم کے معمولی مجرم تھے۔ مار پیٹ، چوری چکاری یا چرس فروشی کے جرم میں پکڑے گئے تھے اور پولیس کو موقع نہ ملا۔ ”نذرانہ“ پیش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کہانی کی توجہ کا مرکز سب سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کا شخص بنا۔ جو صورت سے مسکین اور مفلوک الحال نظر آتا تھا۔ اس کے گال بچکے ہوئے تھے۔ چہرہ بے رونق،

آنکھوں میں فکر، ترژد اور دُکھ کے ساتھ ساتھ خوف کی جھلک تھی جیسے وہ بے یقینی کے عذاب میں مبتلا ہو۔ وہ دیوار سے پشت ٹکائے، گردن نیہوڑائے، ہونٹ بھیجنے خاموش بیٹھا تھا اور بے مقصد نظروں سے روشن دان کی آہنی سلاخوں کو گھورے جا رہا تھا۔ کچھ اس طرح گویا اسے قطعی علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

کہانی نے اچانک کہا۔ ”اس آدمی کے اوپر قتل کا الزام ہے۔“
میں بھونچکا رہ گیا۔ ”تعب ہے۔ صورت سے تو نہیں لگتا کہ یہ کبھی کو بھی مار سکتا ہے۔ کیا واقعی اس نے قتل کیا ہے؟“
”نہیں۔“

”تو پھر گرفتار کیوں ہوا؟“

کہانی نے زور سے سانس لی۔ ”تابعہ داری اور نمک کے جرم میں۔“
”تابعہ داری اور نمک.....؟ میں سمجھا نہیں۔“

قتل کا ارتکاب اصل میں ایک بہت بڑے آدمی کے لُخت جگر نے کیا تھا۔ کیونکہ اسے مقتول پر غصہ آگیا تھا اور سبب غصے کا یہ تھا کہ بڑے آدمی کا لُخت جگر مقتول کی بیوی سے، جو اتفاق سے جوان اور جاذبِ نظر تھی، تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ چھیڑ چھاڑ کی نوعیت کیا تھی۔ بہر حال ہوا یہ کہ عین وقت پر مقتول آگیا۔ اس نے ظاہر ہے کہ بڑے آدمی کے لُخت جگر کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے بڑے آدمی کے لُخت جگر کو رد کرنا نہیں چاہئے تھا۔ بلکہ اپنی آنکھیں بند کر لینی چاہئے تھیں۔ کیونکہ روکنے ٹوکنے اور منع کرنے پر اکثر بڑے آدمیوں کو غصہ آ جاتا ہے۔ اور جب غصہ آتا ہے تو اس کا اظہار بھی کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا۔ بڑے آدمی کا لُخت جگر طیش میں آگیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مقتول، جو چھوٹا آدمی تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔“

”مگر اس سارے معاملے سے اس شخص کا کیا تعلق ہے؟“ میں نے ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔

”کچھ بھی نہیں، مگر پھر بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ آدمی اس بڑے آدمی کے یہاں عرصے سے ملازم ہے۔ اس کا نمک کھاتا رہا ہے اور ان لوگوں میں سے جو ”مالک“ کی خدمت اور تابعہ داری کو جزا ایمان سمجھتے ہیں اور ”مالک“ کا ہر عذاب، ہر مشکل اپنے سر لینے سے بالکل بلیغ نہیں کرتے۔ اور وہ ایسا ہی موقع تھا۔ پولیس نے بڑے آدمی کے لُخت جگر کو دستِ میر لے لیا تھا مگر ابھی ایف آئی آر درج نہیں کی تھی۔ آخر کو انہیں کچھ اپنا بھی تو

خیال کرنا تھا تا۔ گرفتاری کے بعد بڑے آدمی نے اس شخص سے حق نمک ادا کرنے یعنی لخت جگر کا جرم اپنے سر لینے کے لئے کہا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بیوی بچوں کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کی پوری تنخواہ اس کے گھر پہنچ جایا کرے گی۔ کچھ اور سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ نیز یہ کہ جب یہ چھوٹ کر آئے گا تو ایک بڑی رقم اسے بطور انعام بھی ملے گی۔“

”تو گویا صرف اس لالچ میں اس شخص نے ایک سنگین جرم اپنے سر لے لیا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

کہانی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ”صرف اس لالچ میں نہیں، بلکہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ بڑے آدمی نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے حق نمک ادا نہیں کیا تو خواہ مخواہ بہت بڑی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ بڑا آدمی دو گواہ تیار کرے گا جو پولیس کے سامنے حلفیہ بیان دیں گے کہ جرم کا ارتکاب اس نے کیا ہے اور پولیس ان کا بیان فوراً تسلیم کر لے گی۔ اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک طرف نمک تھا، دوسری طرف مجبوری۔ مجبوری کی حیت ہوئی۔ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اب یہ ہو گا کہ مقدمہ چلے گا۔ بڑے آدمی کا مقرر کیا ہوا وکیل اپنی پیشہ ورانہ کرتب بازیوں سے سارے معاملے کو ایسی شکل دے گا کہ اس شخص کو تین چار سال سے زیادہ سزا نہیں ملے گی۔ سزا کی مدت پوری ہوگی تو یہ اپنے گھر واپس آ جائے گا اور قصہ ختم ہو جائے گا۔“

”تمہاری باتوں سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ پولیس کو اصل واقعے کا پورا علم ہے۔“ میں نے تجسس کے ساتھ سوال کیا۔

کہانی معنی خیز انداز میں مسکرائی مگر چپ رہی۔

اب میری توجہ اس پانچویں آدمی کی جانب مبذول ہوئی جو حوالات کے ایک کونے میں ایک صاف ستھری چادر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ سفید براق کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر پگڑی، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ اور نفاست سے ترشی ہوئی گھنی سیاہ داڑھی۔ بڑا نیک، محترم اور دیندار آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سبز دانوں والی ایک تسبیح تھی۔ وہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی جنبش تھی اور اس کی انگلیاں میکا کی انداز میں تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں۔ میں چند ثانیے اسے ذرا تعجب سے دیکھتا رہا۔ یہ آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟ بھلا ایسا آدمی، جو شاید عالم بھی ہے، کوئی جرم کر سکتا ہے؟ میں نے استفہامیہ نظروں سے کہانی کی طرف دیکھا۔

”اس پر زنا کا الزام ہے۔ زنا بالجبر۔ اس نے ایک گیارہ سالہ بچی کی آبروریزی کی

ہے۔“ کہانی نے مرتعش آواز میں کہا۔

میں ایک دم ہل گیا۔ ”ارے..... کیا واقعی؟“
 ”ہاں۔“

”تعب ہے..... ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟..... دیکھنے میں تو یہ آدمی بڑا ہی شریف
 انفس اور نیک نظر آتا ہے۔ اور شاید..... شاید کوئی عالم ہے۔“

”تم ٹھیک سمجھتے۔“ کہانی نے کہا۔ ”ایک مسجد کا انتظام و انصرام اس کے ذمے ہے۔
 ایک مدرسہ بھی چلاتا ہے جہاں محلے کے بچوں کو دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ لڑکی بھی
 اسی مدرسے میں پڑھنے جاتی تھی۔ دو دن پہلے کی بات ہے کہ تنہائی میں اس شخص نے بچی کو
 اچانک پکڑ لیا اور.....“ کہانی معا چپ ہو گئی۔

”وہ بچی اب کہاں ہے؟“

”ہسپتال میں۔“

میں تھوڑی دیر چپ رہا اور غور سے اس شخص کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند
 تھیں۔ ہونٹ بدستور ہل رہے تھے اور انگلیاں بدستور تسبیح کے دانوں پر رقصاں تھیں۔
 چہرے سے گہرا استغراق اور محویت ہوید اٹھی۔ الفاظ مقدس کے ورد میں وہ کچھ اس طرح
 ڈوبا ہوا تھا کہ لگتا تھا، اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ شاید اس بات سے بھی
 لاعلم ہے کہ وہ حوالات میں ہے۔ اس کے منور چہرے کو دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وہ
 اندر سے اتنا تاریک ہے۔ کیا واقعی وہ اندر سے اتنا ہی سیاہ ہے؟..... اگر اندر اور باہر میں
 اتنا بعد ہوتا ہے تو پھر بے چارے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ کس پر یقین کریں؟ کسے
 رہنما کریں کہ اب نہ سلطانی ہی قابل اعتبار ہے اور نہ ہی درویشی قابل بھروسا۔

کیا واقعی دونوں اپنا وقار اور اعتبار کھو چکے ہیں؟

کچھ دیر بعد میں نے نظریں گھمائیں اور استفہامیہ نظروں سے کہانی کی طرف دیکھا۔
 ”اور وہ لڑکی.....؟“

کہانی نے زخمی اور ماتمی آواز میں کہا۔ ”ہاں..... تم ٹھیک سمجھتے۔ وہ میری ہی بیٹی ہے۔“

بے رونقی کا سلسلہ تھا کہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

یہ سماج کے حاشیے پر رہنے والے لوگوں کی بستیاں تھیں۔ ایسے لوگ جن کے بارے
 میں یہ جاننا اور طے کرنا مشکل ہے کہ جتنی زندگی وہ جیتے ہیں، اتنی ہی زندگی ان کے نصیب
 میں تھی یا یہ کہ وہ اور جی سکتے تھے۔ مگر زندگی کی عام اور چھوٹی چھوٹی سہولتوں کے فقدان

کے سبب جلد مر گئے۔ مناسب خوراک، صاف پانی، بروقت مناسب دوا کا حصول اور صاف ہوا۔ تھوڑی سی خوشی، تھوڑی سی آسودگی اور تھوڑا سا زندگی کا اعتبار۔ مگر ان بستیوں میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں ہوا چلتی ہے تو مسموم، دھوپ نکلتی ہے تو کثیف اور خوشی آتی ہے تو بیماری اور خوف کے غلاف میں لپٹی ہوئی۔ میں کچھ حیرت سے، کچھ تاسف سے اور سچ یہ ہے کہ کسی حد تک شرمندگی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ گندی، کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ناہموار گلی تھی۔ کہیں کہیں گڑھے تھے جن میں بدبودار پانی بھرا ہوا تھا اور ان کے اوپر پھسروں کے غول جھنھنا رہے تھے۔ نالوں میں گندا پانی سڑ رہا تھا۔ دونوں جانب بے رونق اور بے رنگ دروپ مکانات تھے۔ کہیں کچے، کہیں پکے۔ کچھ دروازوں پر پھٹے ہوئے ٹاٹ کے پردے یوں جھول رہے تھے، گویا ان مکانوں میں رہنے والوں کی زبوں حالی کا ماتم کر رہے ہوں۔ مگر گلی میں زندگی کے تھکی باری، ٹھکرائی ہوئی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار بہر حال موجود تھے۔ کچھ بچے پھنے پرانے کپڑوں میں ملبوس، ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ دو عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی اونچی آواز میں مہنگائی کا رونا رو رہی تھیں۔ ایک خمیدہ کمر بڑے میاں ایک لکڑی ٹیکتے، ہانپتے کا نپتے گلی عبور کر رہے تھے۔

ایکایک کہانی نے کہا۔ ”زندگی ان گلیوں میں اسی طرح ریگ ریگ کر اپنا سفر طے کرتی ہے۔“

میں نے کچھ کہنے کے بجائے صرف ٹھنڈی سانس لینے پر اکتفا کیا۔

گلی کے اختتام پر ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ ممکن ہے، کبھی پارک رہا ہو مگر اب محض وہ ایک تباہ حال میدان تھا۔ گھاس کہیں نام کو بھی نہیں تھی۔ البتہ کوڑا کرکٹ اور روڑے ہر طرف ٹکھڑے تھے۔ میدان میں چند بچے کھیل رہے تھے جن کی عمریں چھ سے لے کر بارہ سال کے درمیان تھیں۔ وہ سب کے سب ننگے پاؤں تھے اور ان کے جسموں پر بوسیدہ پوشاکیں تھیں۔ میدان کے ایک کونے میں بول کا ایک پیڑ تھا اور اس کے قریب بھدا سا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ میں کہانی کی معیت میں اس چبوترے کی طرف بڑھا لیکن چبوترے پر نکلنے سے پہلے میں نے ایک سگریٹ سلگائی، پھر کہانی کی طرف دیکھا اور تھوڑا سا حیران ہوا۔ کہانی نے ایک بار پھر معاً نیاروپ بدل لیا تھا۔ اب وہ گیارہ سال کے ایک لڑکے کے روپ میں تھی۔ اس کے جسم پر بھدی سی سرمئی قمیص اور نیکر تھی۔ گردن میں تعویذ پڑا تھا۔ بائیں کان کے نیچے ایک پرانے زخم کا نشان تھا۔ میں نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا اور

بشاشت سے مسکرایا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بدو۔“ اُس کا لہجہ اکھڑا اور غیر شائستہ تھا۔

”کہاں رہتے ہو؟“

”ادھر باجو والی گلی میں۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”اسکول جاتے ہو؟“

”پچھلے سال تک جاتا تھا۔ اب نہیں جاتا۔“

”کیوں.....؟“

”اماں بولتی ہے، فیس دینے کو پیسہ نہیں۔ اس بناء پر۔“

میں تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر یکا یک سوال کیا۔ ”مگر تمہیں یہ روپ دھارنے کی آخر کیا

ضرورت تھی؟“

”ادھر دیکھو۔“ کہانی نے اشارہ کیا۔

میں نے میدان کے وسط میں نظر ڈالی، جہاں بدو کا ایک لڑکے سے جو عمر میں اس سے کچھ بڑا تھا، جھگڑا ہو گیا تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے تک دونوں ایک ساتھ کھیل رہے تھے۔ مگر پھر دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور دونوں لڑ پڑے۔ بڑے لڑکے نے بدو کو رگید ڈالا۔ بدو نے اس کی پٹلی میں گھونسا مارا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ بڑے لڑکے نے بدو کو ماں کی گالی دی۔ جواب میں بدو نے بھی اس کی ماں کو نہیں بخشا۔ اب دونوں بری طرح لڑ رہے تھے اور نہایت بازاری انداز میں فحش گالیاں بک رہے تھے۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ بدو عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود زیادہ جی دار ثابت ہوا۔ اس نے بڑے لڑکے کی اچھی خاصی پٹائی کر دی۔ پھر بڑا لڑکا ہمت ہار بیٹھا اور اپنے آپ کو چھڑانے اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

بدو نے ایک روڑا اٹھایا اور زور سے بڑے لڑکے کو پھینک کر مارا، ساتھ ہی زور سے

چینا۔ ”رک سالے! تیری ماں کا..... میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔“

”ابے جا سالے! حرامی! دیکھ لوں گا تجھے۔ مادر.....“ بڑے لڑکے نے پلٹ کر

جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے دوڑتا چلا گیا۔

میں نے کہانی کی طرف دیکھا۔ ”چچ..... چچ..... کتنی بری بات ہے۔ تم اتنی گندی

گندی گالیاں بکتے ہو۔“

کہانی بھینپ کر ہنسی۔ ”مجھے معلوم ہے یہ بری بات ہے۔ پر ادھر تو سب ایسے ہی جلتا

ہے۔ گالی گلوچ، مار پیٹ اور.....“ وہ یکا یک چپ ہو گئی۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ میری نظر میں ترجم کے ساتھ تجسس بھی تھا اور استغفار

بھی۔ بدو نے، کہانی نے میری آنکھوں میں ناچتے تجتس کو بھانپ لیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر رنجیدہ آواز میں بولی۔

”ہاں..... مجھے معلوم ہے۔ اگر مجھے پڑھنے کا موقع ملے، زندگی میں کچھ بننے کا موقع ملے تو میں کچھ بھی بن سکتا ہوں۔ ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، کچھ بھی مگر ایسا نہیں ہوگا۔ میں بڑا ہو کر کسی فیکٹری میں سڑوں گا، رکشا چلاؤں گا اور یا پھر غذا بد معاش یا پھر چور اچکا بن جاؤں گا اور ساری زندگی ایک گالی بتا رہوں گا۔ خود اپنے لئے بھی اور دنیا کے لئے بھی۔ مگر یہ نقصان میرا نہیں ہوگا۔“

”پھر کس کا ہوگا؟“

”تم جانتے ہو۔“

میں تھوڑی دیر چپ رہا، پھر سوال کیا۔ ”مگر تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟“

”میرا باپ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔“ کہانی افسوس سے کہنے لگی۔ ”ایک دن دوپہر کے بعد وہ کام ختم کر کے گھر واپس آ رہا تھا۔ جب چوراہے پر مسجد کے قریب پہنچا تو یکایک ایک دین پر سوار کچھ لوگ آئے اور انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ دراصل اس روز مسجد میں ایک عالم صاحب آئے تھے۔ اور اس وقت، جب گولیاں چلیں، وہ مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ مقصد یقیناً انہیں جان سے مارنے کا تھا۔ وہ تو خیر مرے ہی، ساتھ میں کچھ اور لوگ بھی مارے گئے جن میں میرا باپ بھی شامل تھا۔ باپ مر گیا تو کوئی سہارا نہ رہا۔ روٹی کے لالے پڑ گئے۔ تب ماں نے اسکول سے نام کٹوا دیا۔ اب وہ گھروں میں کام کاج کر کے اپنا، میرا اور میری چھوٹی بہن کا پیٹ پالتی ہے اور ہر روز رات میں کسی اندھیرے کونے میں بیٹھ کر روتی ہے۔“

”اور تم.....؟“

”میں شام کو عیدو کے ہوٹل میں دو تین گھنٹے بھرا گیری کرتا ہوں۔ پانچ دس روپے مل

جاتے ہیں۔“

پھر کہانی چپ ہو گئی۔ میں بھی چپ رہا۔ اور میرے اندر یکایک ایک تاریکی سی پھیلتی چلی گئی۔ اس تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن کہیں بھی نہیں تھی۔ البتہ سوالات کے کیڑے ضرور کلبلا رہے تھے۔ سوالات، ان گنت سوالات۔ مجھے سارے مناظر ایک کے بعد ایک یاد آئے۔ وہ عمر رسیدہ عورت جو خیرات کے لئے ہتھیلی پھیلاتی ہے، وہ آدمی جس نے نوعمر لڑکے کو سیب کھلایا تھا۔ اور پھر وہ نوجوان جو احتیاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر خون بیچتا ہے۔ اور وہ بارش آدمی جو نہایت خشوع و خضوع سے تسبیح کا ورد کرتا ہے مگر گیارہ سالہ بچی کی

آبرو لوٹتا ہے۔ ذہن وہاں سے بھٹکا تو عبادت گاہ کی شکستہ عمارت کا طواف کرتا ہوا جلسہ گاہ جا پہنچا جہاں عالم دین تقریر کر رہے ہیں..... جہاد کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ..... جہاد..... جہاد..... مگر کیسا جہاد؟ اور کس کے خلاف؟

میری افسردہ اور در ماندہ نظر چاروں طرف بھٹک رہی تھی۔ میرے ارد گرد مکانات تھے۔ چھوٹے چھوٹے، بدنما، بے رونق اور تاریک۔ کچھ گھروں سے سرمئی دھواں اُٹھ کر آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ سارے میں ایک عجیب سی لرزہ خیز بے کیفی، پڑمردگی اور تھکن طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت کا ایک ایک لمحہ ان بستیوں میں آکر تھک چکا ہے۔ ہمت ہار چکا ہے اور اب محض ریگ ریگ کر گزرنے کا سوا لگ کر رہا ہے۔ میں کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اطراف میں دیکھتا رہا، پھر کہانی کی طرف متوجہ ہوا۔

کہانی نے ایک بار پھر روپ بدل لیا تھا۔ اب وہ پھر اپنے پہلے والے روپ میں تھی۔ وہی انوکھا، انجانا، ناقابل بیان حسن۔ وہی دہکتی آنکھیں اور ہونٹوں پر وہی طمانیت سے بھری مسکراہٹ۔ اور چہرے کا نور کہ دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جائے۔ مگر وہ نور جو دیکھنے والے کو شادمانی، سکون اور زندگی کا اعتبار عطا کرے۔ اس کی پوری شخصیت اتنی انوکھی، انجانی اور انمول تھی کہ لگتا تھا، وہ اس دنیا کی باسی نہیں، کسی اور جہاں سے آئی ہے۔ کون ہے وہ؟ کہاں سے آئی ہے؟ پل پل میری حیرت بڑھتی گئی۔ آخر ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں اس سے متعارف تو ہوں، پھر بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ میں اس سے مل چکا ہوں، پھر بھی نہیں ملا ہوں۔ وہ شناسا تو ہے، مگر انجان بھی ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ کون ہے وہ؟ یکایک میں نے کہا۔ ”میں بڑی الجھن میں ہوں۔“

”کیوں؟“

”تم کون ہو؟..... تمہاری ذات میرے لئے پوری طرح انجان بھی نہیں، پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ میں تم سے اچھی طرح آگاہ نہیں۔ آخر ایسا کیوں؟..... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم ایسے خواب کی طرح ہو جو دیکھا تو جاتا ہے مگر اس کی تعبیر کبھی نہیں ملتی۔ سچ بتاؤ، کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟“

کہانی کے ہونٹوں پر ایک نفیس، روشن اور آفاقی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”خیر، تم نے ٹھیک کہا تھا۔ کہانیاں تو قدم قدم پر موجود ہیں۔ گلی کوچوں میں، ہر کٹ پر، ہر گھر کے آنگن میں، صحن میں، ہر چہرہ ایک کہانی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ کہانی بند کمرے میں بیٹھ کر نہیں لکھی جاتی، باہر نکلتا پڑتا ہے۔ گلی

کوچوں میں بھٹکنا پڑتا ہے اور وجدان کی آنکھیں کھولنا پڑتی ہیں، تب ہی کہانی ہاتھ لگتی ہے۔ میں بھی اب ایسا ہی کروں گا۔ مگر ایک بات تو بتاؤ، تم بھی تو کہانی ہو۔ سب سے پہلے کیوں نہ میں تمہیں لکھوں؟“

کہانی بے حد تکیے انداز میں مسکرائی۔ ”نہیں..... تم مجھے نہیں لکھ سکتے۔“

”کیوں نہیں لکھ سکتے؟ تم ایک کہانی ہو۔ اور میں قلم کار ہوں۔ پھر کیا قباحت ہے؟“ کہانی پھر مسکرائی، پھر لب کھولے۔ اس کا لہجہ تیکھا بھی تھا اور طنزیہ بھی۔ ”کیونکہ مجھے لکھنے کے لئے جس جرأت کی، جس صاف گوئی کی اور جس بے ریا، غیر جانب دار ظرف و ضمیر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تم میں نہیں ہے۔“

اگرچہ کہانی کے سب ہی الفاظ خاصے تو ہیں آمیز تھے۔ وہ میری اہلیت، دیانت اور میرے قلم پر صریحاً چوٹ کر رہی تھی۔ اصولاً مجھے ناگوار گزرنے چاہئے تھا اور اپنے دفاع میں ضرور کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے تھا مگر میں چپ رہا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ ”آج تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ اور کتنے ہی قلم کاروں نے مجھے بیان کرنے کی، اپنی دانست میں ایمانداری سے کوشش بھی کی ہے مگر قلم کاروں کی اپنی ذاتی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ اپنی ترجیحات اور اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ پھر کچھ بندشیں، مصلحتیں اور خوف بھی قلم پر روک لگاتے ہیں۔ چنانچہ قلم کاروں نے آج تک میری صرف ایک جھلک، صرف ایک پہلو یا محض ایک جھلک پیش کی ہے۔ مکمل طور پر آج تک مجھے کسی نے نہیں لکھا اور مجھے علم نہیں کہ کبھی وہ دن آئے گا بھی جب مجھے مکمل طور پر لکھا جائے گا۔“

میں شپٹایا ہوا، حیران و ششدر اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیوں؟ آخر تمہیں کیوں نہیں لکھا گیا اب تک؟ ایسی کیا بات ہے تمہارے ساتھ؟ کیا ہو تم.....؟“

وہ چپ رہی اور شکستہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر افسردگی سے بولی۔ ”میں.....“

میں ”پورا سچ“ ہوں۔“

پھر وہ آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔



نام و نشان

”تم لوگ جاؤ۔“ اُس نے جلتی ہوئی نظروں سے بہن، بھانجی اور بھانجے کی طرف دیکھا اور آواز کی کڑواہٹ کو حتیٰ الامکان دبانے کی کوشش کی۔

”اور آپ.....؟“

”میں ابھی کچھ دیر یہیں ٹھہروں گا۔“

”مگر.....؟“

”میں نے کہا نا، تم لوگ جاؤ۔“ اس نے ترشی سے کہا۔ ”میں بعد میں آؤں گا لیکن میرا انتظار مت کرنا۔ ہو سکتا ہے میں رات کو اپنے دوست کی طرف چلا جاؤں۔“

وہ چپ چاپ کھڑا رہا اور قدرے برائی سے بہن، بھانجی اور بھانجے کو دیکھتا رہا جو آہستہ قدموں سے قبرستان کے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

صدر دروازے پر کسی زمانے میں ایک آہنی گیٹ ہوا کرتا تھا، مگر اب نہیں تھا۔ صرف ایک کھلا درہ گیا تھا۔ صدر دروازے پر پہنچ کر وہ تینوں چندلمحوں کے لئے رکے، پلٹ کر ایک بار اس کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر دائیں جانب بڑھے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اُس نے ایک تھکی ہوئی سانس لی۔

عقب میں ایک چھتھنار پیڑ تھا۔ پیڑ کے تنے کے ساتھ ایک او بڑ کھا بڑ چوڑا بنا ہوا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھا اور پیڑ سے پر ٹک گیا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا..... بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اتنا کہ لگتا تھا، کوئی وزنی چٹان دل پر دھری ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل کو پھل رہی ہے۔ بدن بھی بالکل ناتواں اور خستہ ہو رہا تھا۔ لگتا تھا، جسم اس جان ہی نہیں ہے۔ حالانکہ صرف آدھا گھنٹہ قبل جب وہ قبرستان میں داخل ہوا تھا تو افسردہ و ملول ضرور تھا مگر دل و دماغ اور جسم کی ایسی کیفیت نہیں تھی۔ لیکن اب وہ خود کو بالکل شکستہ، پژمردہ اور بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ احساسِ زیاں کا بوجھ اسے اندر ہی اندر کچل رہا تھا۔

آخر یہ ہوا کیسے؟ کیا یہ ممکن ہے؟..... اس نے تو خواب و خیال میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ ایسی کوئی بات اس کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ وہ تو خیر برسوں بعد آیا ہے، مگر اس کی بہن، بہنوئی اور ان کے بچے تو یہیں ہیں۔ پھر بھائی کا گھر بھی۔ دوسرے شہر میں ہونے کے باوجود، کچھ زیادہ دور نہیں۔ ان سب لوگوں سے یہ کوتاہی کیسے ہوئی؟..... لیکن کیا اسے کوتاہی یا غفلت کہا جاسکتا ہے؟..... نہیں، یہ کوتاہی ہے اور نہ بے پروائی۔ یہ شدید غیر مے داری ہے جس سے ان کی بے حسی کا تو پتہ چلتا ہی ہے، یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ سرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور دنیا داری میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ انہیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔ رشتوں کی حرمت اور روایات و اقدار کا پاس و لحاظ ان کے لئے بے معنی ہے۔ ان کے لئے گزرا ہوا کل محض حرف غلط ہے جو مٹ گیا۔ اور جو مٹ گیا اس کے بارے میں کیا سوچنا۔ مگر کیا واقعی ایسا ہی ہے؟

حالانکہ اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ ایک دفتر کھول کر بیٹھ جائیں گے۔ حالات کا جبر، مسائل کا انبار، مہنگائی کا رونا، کیا کریں؟ زندگی اتنی آسان نہیں رہی جتنی گزرے دنوں میں (شاید) ہوا کرتی تھی۔ اب تو کولھو کے تیل کی طرح جتے رہنا پڑتا ہے۔ ماتھے کا پسینہ اڑی تک پہنچتا ہے تب جا کر کہیں دو روٹیاں نصیب ہوتی ہیں۔ صرف روٹیاں۔ سکون پھر بھی نہیں ملتا۔ زندگی گزارنا اب جہاد سے کم نہیں۔ ان حالات میں اتنا موقع ہی کہاں ملتا ہے کہ آدمی قبرستان جاسکے۔ اس میں شک نہیں کہ ان باتوں میں بہت حد تک سچائی ہے۔ زندگی بہت زیادہ مصروف ہو گئی ہے۔ انتشار، افراتفری، بھاگ دوڑ اور بے یقینی سے آج کے شب و روز عبارت ہیں۔ ایک روٹی کے حصول کے لئے سو پاؤں بیلنے پڑتے ہیں، تب جا کر کہیں پیٹ بھرتا ہے۔ لیکن دل کو سکون و طمانیت پھر بھی نہیں ملتی کہ اگلے دن کی روٹیوں کی فکر سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ”سچ“ کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ آدمی اگر پاپے تو کبھی کبھی کچھ وقت نکال کر قبرستان جاسکتا ہے۔ اپنے پیاروں کی آرام گاہوں کی دیکھ بھال کے لئے۔ وہ جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اپنے شب و روز یہاں گزار کر، اپنے حصے کے دکھ اور خوشیاں سمیٹ کر یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان عزیزوں کی قبروں پر آخری اور چراغ جلانے کے لئے۔ لیکن بہن کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ لوگ صرف ایک بار یہاں آئے تھے۔ غالباً پہلی بار۔ بہن تو خیر نہیں آئی ہوں گی، مگر بھانجا اور دوسرے لوگ ہوں گے۔ اس کے بعد کسی نے پٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ بھول بھال گئے۔ شاید ان کے لئے رشتوں ناتوں کا مفہوم چلتی سانس سے وابستہ ہے۔ اب سانس چل رہی ہے، رشتہ بھی قائم و برقرار ہے۔ لیکن ایک بار سانس کی ذور ٹوٹی تو رشتہ بھی ختم ہوا۔ اور جانے

والے کا نام و نشان مٹ کر طاق نسیاں ہوا۔

کیا واقعی رشتے بے معنی اور فروغی ہوتے ہیں؟

اس نے گردن گھمائی اور قبرستان میں دور تک نظر ڈالی۔ سہ پہر کی مدھم پڑتی دھوپ چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا اور بے نام سی آداس کر دینے والی ویرانی۔ وہی ویرانی اور خاموشی جو قبرستانوں سے مخصوص ہوتی ہے۔ بے ثباتی کے احساس سے معمور۔ قبرستان، جہاں زندگی اور دنیا کے سارے ہنگامے، سارے تام جھام اور ساری شان و شوکت اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ صرف دو گز زمین کا ٹکڑا باقی رہتا ہے۔ اور اس کے اوپر مٹی کا ایک ڈھیر۔ جس پر ایک کتبہ نصب ہوتا ہے۔ جو جانے والے کے نام و نسب کا اظہار کرتا ہے۔

کتبہ..... اس نے ایک طویل افسردہ سانس لی۔

نظریں ایک بار پھر بھٹکیں۔ چاروں اور قبریں ہی قبریں۔ چھوٹی بڑی، کچھ پختہ، بیشتر کچی۔ کچھ قبروں پر ساٹھان بھی تعمیر کئے گئے تھے اور چہار دیواری بنا کر چھوٹے چھوٹے دروازے لگا دیئے گئے تھے۔ مگر پورے قبرستان کی حالت مجموعی طور پر خاصی ابتر دکھائی دیتی تھی۔ صفائی برائے نام تھی۔ قبروں کو بنانے میں کہیں کہیں تو ترتیب بھی مگر باقی جگہوں پر ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ زمین ناموار تھی۔ کوڑا کرکٹ ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ پورے قبرستان پر ایک عجیب سا افسردہ کر دینے والا اجاڑ پن پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے دو تین مغربی ممالک کے قبرستان دیکھے تھے اور وہاں اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور مسرت بھی۔ کیونکہ ان قبرستانوں میں صفائی، سلیقے اور ترتیب کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ روشیں صاف ستھری تھیں۔ ایک مناسب فاصلے اور ترتیب سے درخت بھی لگائے گئے تھے جو قبرستان کو اور بھی خوبصورت بناتے تھے۔ جگہ جگہ ڈسٹ بن رکھے گئے تھے اور قبرستان میں آنے والے افراد فالتو چیزیں ادھر ادھر پھینکنے کے بجائے ڈسٹ بن میں ڈالتے تھے۔ لیکن اس قبرستان میں ایسا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قبرستان کی دیکھ بھال کے لئے اگر کوئی ملازم مقرر تھا تو یقیناً وہ اپنا فرض ذمہ داری سے نہیں نبھا رہا تھا۔

لیکن ملک میں کتنے لوگ ہیں جو اپنا فرض ذمہ داری سے نبھاتے ہیں؟

کچھ دیر تک اس کی تھکی ہوئی، پژمردہ نظریں قبروں کا طواف کرتی رہیں، پھر اس کے قدم خود بخود اٹھے۔ یہ عمل غیر اختیاری اور غیر ارادی تھا۔ اُسے خود اوارا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ بھاری قدموں سے اپنے وجود کو یوں گھسیٹتا ہوا، گویا اس کے جسم پر کوئی بھاری بوجھ دھرا ہو۔ اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ

ناپ رہی تھیں۔ دل بھاری ہو رہا تھا اور ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا حد درجہ دشوار محسوس ہو رہا تھا مگر وہ چلتا رہا۔ قبروں کے درمیان سے گزرتا رہا۔ افسردہ نظروں سے ایک ایک قبر کو دیکھتا ہوا۔ کبھی کسی کتبے پر نظر پڑتی تو ایک لمحے کے لئے رک جاتا اور غیر ارادی طور پر کتبے کی عبارت پڑھنے لگتا۔

عبدالستار ولد عبدالغفار

پیدائش 1919ء، وفات 1999ء

ابا ہم ہمیشہ آپ کو یاد کریں گے۔

عمر تقریباً اسی سال۔

اُس نے زیر لب دہرایا اور غیر ارادی طور پر تصور کرنے کی کوشش کی۔ کیسے رہے ہوں گے، جناب عبدالستار، اور کیسی زندگی گزاری ہو گی انہوں نے۔ یقیناً وہ ایک ذمے دار اور فرض شناس باپ رہے ہوں گے۔ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے شب و روز محنت کی ہو گی، پسینہ بہایا ہو گا اور اپنی خوشیاں اور ضرورتیں اکثر تیاگ دی ہوں گی تاکہ اپنے بچوں کے لئے دنیا کی ساری آسائشیں اور سہولتیں مہیا کر سکیں۔ اب وہ نہیں ہیں لیکن ان کا نام و نشان باقی ہے۔ ایک قبر اور ایک کتبہ۔ اس نے کتبے کو ذرا غور سے دیکھا۔ سنگ سفید سے بنا ہوا بہت خوبصورت کتبہ تھا۔ حروف اور ہند سے نہایت خوشنما تھے۔ قبر بھی بہت اچھی حالت میں اور صاف ستھری تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال پابندی اور باقاعدگی سے کی جاتی ہے۔ پھولوں کی کچھ خشک پتیاں اور اگر بتی کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔ اس نے ہلک کر گلاب کی ایک پتی اٹھائی اور بے دھیانی سے اسے سونگھا۔ پتی ہرچند کہ مر رہی تھی مگر مدھم مدھم سی، بھینی بھینی خوشبو اس میں بدستور موجود تھی۔ اسے یکایک محسوس ہوا جیسے وہ خوشبو محض گلاب کی نہیں، بلکہ اس میں محبت اور اپنائیت کی وہ مہک بھی شامل ہے جو مرحوم عبدالستار کے لئے ان کے بچوں کے دل میں ہے۔ اُس نے ایک بار پھر پتی کو سونگھا، پھر غیر ارادی طور پر گردن جھکا کر داہنے ہاتھوں میں دبے پھولوں اور اگر بتی کے پیکٹ کو دیکھا۔ اور تب یکایک اس کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی جو اس کے سارے وجود کو نیم جاں کرتی چلی گئی۔

پروردگار!

ایک بار پھر اس کے قدم خود بخود اٹھے۔ دھیرے دھیرے، بغیر کسی ارادے کے اور نیت کے۔ بغیر کسی مقصد کے۔ ایک کے بعد دوسری روش، دوسری کے بعد تیسری۔ نگاہیں قبروں پر بھنکتی رہیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کتبے پڑھتا رہا۔ کتبے جو مرحومین کے

عزیزوں نے نصب کئے تھے تاکہ ان کا نام و نشان باقی رہے۔ مرنے والے گواہ اس دنیا میں موجود نہیں، مگر کبھی موجود تھے اور کار جہاں سے لڑتے تھے۔ پھر سانسوں کی گنتی پوری ہوئی اور وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ مگر کیا واقعی چلے گئے؟ یہ خوبصورت کتبے تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔ ہاں..... یہ کتبے بتا رہے ہیں کہ وہ بھلے ہی اب موجود نہ ہوں، مگر ان کا نام موجود ہے۔ ایک نشان باقی ہے۔ جو قبرستان میں آنے والوں کو یاد دلاتا ہے، بتاتا ہے ان کا نام۔ اور چند لفظوں میں ہی سہی، ان کی زندگی کی کہانیاں سناتا ہے۔ وہ کون تھے؟ کب یہاں آئے؟ کب گئے؟..... اور پھولوں کی پتیاں اور جلی ہوئی اگر بیتیاں بتاتی ہیں کہ ان قبروں پر کبھی کبھار لوگ آتے ہیں۔ قبروں کی صفائی کرتے ہیں، پھول چھڑکتے اور اگر بتی جلاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی گویا موجود ہیں۔

پھر وہ یکا یک چونکا۔

کبھی کبھار؟

مگر کبھی کبھار کیوں.....؟

اس نے چاروں طرف دور تک نگاہ دوڑائی۔ قبرستان بہت بڑا تھا۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ کہیں ڈھلان تھی، کہیں چڑھاؤ۔ پھر بھی قبریں چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں۔ مگر اتنے وسیع و عریض قبرستان میں سوائے سکوت و سنائے اور ویرانی کے اور کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ جمعے کا مبارک دن تھا، پھر بھی قبرستان غالی تھا۔ اسے صرف ایک عمر رسیدہ بزرگ نظر آئے جو بہت دور نیم شکستہ چہار دیواری کے قریب ایک قبر کے سرہانے کھڑے دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگنے میں مصروف تھے۔ بزرگ کے اور خود اس کے سوا اور کوئی ذی نفس کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مگر کیوں؟..... آخر ایسی کیا بات ہے؟ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا جب ہر ماہ کے پہلے جمعے کو اس کے اپنے گھر والے اور دوسرے عزیز و اقارب پابندی سے قبرستان جایا کرتے تھے۔ قبرستان جا کر اسے ہمیشہ ہی حیرت ہوتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ قبرستان آیا ہے۔ کیونکہ وہاں تو میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ کتے ہی لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ عورتیں، مرد، بچے۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس سب ہی لوگ اپنے پیاروں کی آخری آرام گاہوں کی صفائی کرتے، پانی چھڑکتے، گلاب کی پتیاں قبروں پر بچھاتے، اگر بیتیاں اور موم بتیاں جلاتے اور فاتحہ پڑھتے۔ بعض لوگ قبروں کے سرہانے بیٹھ جاتے اور قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دیتے۔ ہوا کے مدمھم جھونکے آتے اور اگر بتی اور پھولوں کی خوشبو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتے تو یوں لگتا کہ سارا قبرستان

نہ... سہم گیا ہے۔ شام کا جھنپٹا گہرا ہوتا تو چرانوں اور مہم جیوں کی گہری نارنجی لہریاں... وہاں تک یوں بکھری اور بھللاتی نظر آتیں گویا چرانوں کی برات جی ہو۔ دھیرے دھیرے شام گہری ہوتی، اندھیرا بڑھتا، لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ مگر قبرستان کی رونق قائم رہتی اور چرانوں کی برات دیر گئے رات تک جی رہتی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ جب تک وہ وطن میں رہا تھا، تب تک یہ روایت نہیں ٹوٹی تھی۔ مگر اب..... اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ پھر مہم بزرگ پر نظر ڈالی۔ وہ دعا سے فارغ ہو کر اب گردن جھکائے آہستہ قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تب وہ قبرستان میں اکیلا رہ گیا۔ اکیلا..... اُس نے لرز کر سوچا۔ کتنی عجیب بات ہے، قبرستان کی بوسیدہ چہار دیواری کے باہر اتنا وسیع و عریض شہر موجود ہے۔ جیتے جاگتے اکھوں انسانوں سے بھرا ہوا۔ لیکن قبرستان خالی ہے۔ اگر کچھ ہے تو خاموشی اور ویرانی ہے اور اتنا خالی پن، مانو دھرتی پر کہیں کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔ صرف ایک شکستہ چہار دیواری ہی تو ہے درمیان میں، پھر بھی اتنا فاصلہ کیوں؟ کیا واقعی دنیا بہت مصروف ہو گئی ہے؟



اُسے اپنے بہنوئی کے الفاظ یاد آئے۔ ”کیا کریں بھئی۔ چاہتے تو ہیں، پر اتنا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہاں جاسکیں۔ مصروفیت اتنی ہے کہ سر کھجانے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔“ بہن نے فوراً ہی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ ”ہاں اور کیا۔ ایک کام ختم نہیں ہوتا کہ دس اور کام منہ پھاڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچا تو کئی بار مگر.....“ وہ دفعۃً شرمندہ ہو کر چپ ہو گئی تھی۔

دہ برسوں سے پردیس میں تھا۔ پانچ ہزار میل دور ایک مغربی ملک میں زندگی کے جھنجھٹ سے جو جھ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے سوچا کبھی نہیں تھا اور سچ بھی یہی ہے کہ اس نے پرانے دیس جانے کی کبھی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ مگر شاید نصیب کی بات تھی۔ دانہ پانی جہاں لکھا ہو، حالات آدمی کو کھینچ کر وہیں لے جاتے ہیں۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ چند سال پردیس میں رہ کر واپس آجائے گا مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک کے بعد دوسری اڑچن آڑے آتی رہی اور اس کا قیام طویل تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ پھر تقریباً طے ہو گیا کہ اسے نئے ملک میں ہی زندگی گزارنی ہے۔

مگر گھر والوں سے رابطہ قائم تھا۔ چھٹیاں آتی رہتی تھیں۔ تاہم رفتہ رفتہ اس گرم جوش میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ ابتدائی دنوں میں نظر آتی تھی۔ خطوط کی آمد میں وقفہ بڑھ رہا تھا۔ پھر اماں کا انتقال ہوا۔ فاس۔ اور بھی بڑھ گیا۔ چھٹیوں میں مہینوں کا وقفہ پڑنے لگا۔ تحریر بھی رفتہ رفتہ سہمی سی ہوتی گئی۔ چند سطر میں اور بس۔ اور وہ چند سطر میں بھی ذاتی پریشانیوں اور شکایتوں سے بھری ہوتیں۔

’کیا کریں، فرصت نہیں ملتی، صبح سے شام تک کولہو کے نیل کی طرح جتے رہنا پڑتا ہے۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے، گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکے تو کرو۔‘ وہ خط پڑھتا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا۔

پھر ایک صبح اچانک خط آیا۔

’ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔‘

وہ قفس میں بند پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ چاہ تھی، پر راہ نہیں تھی۔ پنجرے کی..... حالات کے پنجرے کی کھڑکی تختی سے بند تھی اور اس میں مجبوری کا تالا پڑا تھا۔ وہ خواہش اور کوشش کے باوجود وطن نہیں آسکا۔ تاہم یہ نیت اور ارادہ ضرور کر لیا کہ جو بھی موقع ملے گا، وہ فوراً وطن پہنچے گا اور ابا کی قبر پر حاضری دے گا۔ لیکن یہ موقع کوئی تین ساڑھے تین سال بعد میسر آسکا۔

وہ وطن پہنچا۔ دو دن تو لوگوں سے ملنے ملانے اور بہن بہنوں کی پریشانیوں کی کہانی سننے میں گزر گئے۔ تیسرے دن اس نے قبرستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ”آپ قبرستان جائیں گے؟“ بہنوں کے لہجے سے حیرت مترشح تھی۔ ”ہاں..... کیوں؟“

”نہیں..... میرا مطلب تھا کہ دیکھئے.....“ بہنوں ذرا شپٹا گیا۔ ”کیا ہے کہ ایک تو گرمی بہت ہے اور پھر قبرستان بھی کافی دور ہے۔ آنے جانے میں.....“ ”مگر مجھے جانا ہے۔“ اس نے بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

بہنوں کو ”اوور ٹائم“ پر جانا تھا۔ اوور ٹائم سے ہونے والی آمدنی کو وہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ بہن اور اس کے دونوں بچے اس کے ساتھ ہو لئے۔ تیز دھوپ میں جلتی ہوئی سڑک پر جب ٹیکسی دوڑ رہی تھی تو اس کا دھیان اماں کی طرف گیا۔ اتفاق سے اماں کی آرام گاہ دوسرے قبرستان میں تھی۔ اُس نے مصمم طور پر طے کیا کہ اگلے دن اماں کی طرف جائے گا۔ پھر خیال کی رو ابا کی طرف گئی۔ تصور میں ابا کا چہرہ ابھرا۔ چوڑی پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، باریک مونچھیں اور ہونٹوں پر کہانی سناتی

ہوئی مسکراہٹ۔ ہاں، کہانی..... اس جدوجہد کی کہانی جو انہوں نے ایک شفیق، ذمے دار اور فز شناس باپ کی حیثیت سے کی تھی۔ ہاں، یہ سچ تھا۔ اس کے ابا نے نہایت جانفشانی سے ساری زندگی محنت کی تھی۔ خود تکلیفیں اٹھائی تھیں، ذاتی ضرورتیں اور خواہشیں رنج دی تھیں لیکن اپنے بچوں کو وہ سب کچھ مہیا کیا تھا، جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے انہیں دی تھی۔ وہ بلاشبہ محبت کرنے والے ایک مہربان باپ تھے۔ اسے پہلے تو خیر کبھی احساس نہیں ہوا مگر اب وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ابا کے اس پر اور اس کے بہن بھائیوں پر ان گنت احسانات ہیں۔ وہ آج جو کچھ بھی ہے، ان ہی کی شفقت اور دعاؤں کی بدولت ہے۔ تاہم یہ کتنے دکھ اور بد نصیبی کی بات تھی کہ آخری وقت میں نہ تو وہ ابا کے لئے کچھ کر سکا تھا اور نہ ہی ان کا چہرہ دیکھ سکا تھا۔ کاندھا بھی نہیں دے سکا تھا۔ اس سے زیادہ محرومی کا تصور بھی ممکن نہیں۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر گالوں پر ڈھلک آئے آنسو پونچھے۔

قبرستان کے داخلی دروازے سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ایک تقریباً خالی قطعہ زمین تھا۔ خاصا وسیع۔ چار دیواری کے قریب کیکر کا چھدر ایڑھا تھا۔ کچھ فاصلے پر دو درخت اور تھے۔ زمین کے اس حصے میں کہیں کہیں چند ایک قبروں کے نشان نظر آتے تھے۔ باقی حصہ بظاہر غیر آباد اور ناہموار دکھائی دیتا تھا۔ کنکر، پتھر اور روڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ بہن دونوں پیڑوں کے پاس پہنچ کر رک گئی اور پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اُس کے چہرے پر تفکر کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی صاف نظر آتی تھی۔ وہ استعجابیہ نظروں سے کبھی بہن اور کبھی بھانجے کو دیکھتا رہا۔ بھانجے کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اور وہ خاصا مجھ دار تھا لیکن اس کے چہرے پر بھی الجھن اور تذبذب کا عکس واضح طور پر موجود تھا۔ جیسے وہ کچھ ملے کرنے اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر کامیابی نہ ہو رہی ہو۔

”کیا بات ہے؟“ معاً اُس نے ذرا حیرت سے کہا۔

بہن نے اس کی طرف پریشانی سے دیکھا۔ ”بھائی صاحب!..... وہ..... بات یہ ہے

کہ..... میرا مطلب ہے، قبر بھی تو یہیں کہیں۔ مگر.....“

”مگر کیا.....؟“ اُس نے درشت لہجے میں اور انتہائی حیرت سے سوال کیا۔ ”مگر

کیا؟..... کیا کہہ رہی ہوں تم“..... کیا مطلب ہے؟ قبر یہاں نہیں ہے اب؟“

بہن کا چہرہ مزید چپکا پڑ گیا۔ اس نے بے بسی سے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا،

ہونٹوں پر زبان پھیرتی اور بھرمانہ انداز میں گردن جھکا لی۔

”اب قبر یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں گئی؟“ اچانک اس کی آواز میں غصہ در آیا۔

بہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تمہیں بھی نہیں معلوم ہے کہ ابا کی قبر کہاں ہے؟“ اس بار وہ بھانجے سے مخاطب ہوا۔
 ”یہیں تھی۔“ بھانجے نے انگلی سے خالی قطعہ زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ”مگر.....“
 ”تو پھر کہاں گئی؟“ اس نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

بھانجے نے اس کی طرف دیکھا اور ہکلا کر بولا۔ ”یہیں تھی۔ یہ تو خیر ہمیں معلوم ہے۔
 مگر..... لگتا ہے، شاید بارش میں بہہ گئی۔“

بہن نے دفعۃً معذرتی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”تدفین کے کچھ دن بعد ایک بار میں
 آئی تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ابا کی قبر اس پیڑ سے دائیں جانب کوئی پندرہ قدم کے فاصلے
 پر تھی۔“

”نہیں اماں!“ بھانجے نے اختلاف کیا۔ ”بائیں طرف نہیں، دائیں جانب۔ اور اس
 دوسرے درخت سے چھ سات گز کے فاصلے پر۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“
 ”چل رہے دے۔ تجھے کیا معلوم۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اس طرف تھی۔“

دونوں ماں بیٹا بحث میں الجھ گئے۔ وہ جلتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس
 کی نظریں زمین کے اس حصے پر گئیں جس کی جانب دونوں ماں بیٹا بار بار اشارہ کر رہے
 تھے۔ اچھے خاصے وسیع قطعہ زمین پر صرف تین قبروں کے بلکے سے نشان موجود تھے۔ ان
 میں سے دو پر چوبی کتبے لگے تھے۔ ایک کتبے کے الفاظ صاف نظر آرہے تھے..... فشی بابر
 علی ولد جابر علی..... بہتر سال کی عمر میں اس دار فانی کو خیر باد کہا..... دوسرے کتبے کی تحریر
 واضح نہیں تھی مگر وہ قبر چھوٹی تھی اور غالباً اسی بچے کی تھی۔ البتہ تیسری قبر بڑی تھی مگر اس پر
 کوئی کتبہ نہیں تھا۔ اس نے بہت غور سے اس تیسری قبر کو دیکھا، پھر یکایک کہا۔

”یہ قبر جو سامنے نظر آ رہی ہے، کیا یہ ابا کی قبر ہو سکتی ہے؟“

بہن نے اس قبر کو غور سے دیکھا۔ ”نہیں، ابا کی قبر اس طرف نہیں تھی۔“

بہن اور بھانجا ایک بار پھر بحث کرنے لگے۔ اس کی جلتی ہوئی نظر اطراف میں بھٹکتی
 رہی۔ ان تین قبروں کے سوا وہاں اور کسی قبر کے آثار نہیں تھے۔ زمین دور تک ہموار نظر آ
 رہی تھی۔ بہن اور اس کے بیٹے کے بیان کے مطابق اس کے ابا کی قبر دیں کہیں تھی۔ مگر
 کہاں تھی؟ یکایک اس کا دل بھر آیا۔ سینے میں آگ سی دھک اٹھی۔ اور سارا جسم بے جان
 سا ہونے لگا۔ ٹانگیں نقاہت کے باعث زور سے کانپیں۔ اگر وہ سرعت سے آگے بڑھ کر
 پیڑ کا سہارا نہ لے لیتا تو شاید گر ہی پڑتا۔ پیڑ کے تنے پر ہاتھ رکھ کر اس نے خود کو سنبھالا
 اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کی تپش رگ رگ میں دوڑتی چلی گئی۔ آگ..... آگ.....

دبکتی ہوئی، شعلے اُگلتی ہوئی۔ اور اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے اس کا وجود کسی چتا پر رکھا ہے اور دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا اور اندوہ کی آگ میں جھلتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور بہن کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”بھائی صاحب! یہ واقعی بہت افسوس کی بات ہے۔“
 ”مگر یہ ہوا کیسے؟“ اس نے حد درجہ تلخ آواز میں سوال کیا۔

بہن کہنے لگی۔ ”آپ دیکھ رہی ہیں، قبرستان کی زمین ریتلی ہے۔ پانی پڑے تو آسانی سے بیٹھ جاتی ہے۔ اور یہاں جب بارش ہوتی ہے تو بہت تیز اور موسلا دھار ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ ابا کی قبر بھی.....“ وہ بے بسی سے ہونٹوں پر زبان پھیر کر چپ ہو گئی۔
 ”مگر دوسری قبریں تو قائم ہیں۔“ اس نے جھوٹا کر کہا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ جن قبروں کے گرد پختہ حد بندی کر دی گئی ہے یا جن کی دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے اور کتبہ بھی لگا ہے، وہ قبریں.....“ بھانجا کہتے کہتے معاً ٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا اور پُرغضب نظروں سے ماں بیٹے کو دیکھتا رہا، پھر انتہائی ترش لہجے میں بولا۔ ”ہاں ٹھیک ہے، جن کی دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے، وہ سلامت ہیں۔ محفوظ ہیں۔ ان کا نشان باقی ہے اور باقی رہے گا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب ابا کا انتقال ہوا تھا، تب میں نے لکھا بھی تھا کہ ان کی قبر کی پختہ حد بندی کر دی جائے اور کتبہ بھی لگایا جائے۔ یاد ہے نا؟ تم لوگوں سے مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔“

بہن کے ہونٹوں پر مجرمانہ خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”تم لوگ آخری بار کب قبرستان آئے تھے؟“ اس نے یکایک قدرے طیش کے عالم میں سوال کیا۔

”وہ..... بات یہ ہے کہ.....“ بہن نے ہکلا کر جواب دینے کی کوشش کی۔ ”آئے تو تھے۔ مگر.....“ پھر وہ یکجہت چپ ہو گئی۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم لوگ آخری بار کب آئے تھے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنا لڑتا ہوا جسم سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”تم لوگ صرف ابا کو دفن کرنے آئے تھے۔ ایک بوجھ اتارنے۔ چھٹکارا حاصل کرنے۔ کیونکہ مجبوری تھی۔ آئے اور دفن کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد شاید ایک آدھ بار اور آئے ہو گے۔ اور بس، اس کے بعد پھر پلٹ کر خبر نہیں لی۔ ابا کا کیا حال ہے؟ ان کا نام و نشان ہے یا نہیں؟ ساڑھے تین سال..... ہاں، ساڑھے تین سال گزر گئے اور تم لوگوں کو ابا کی یاد تک نہیں آئی۔ کیونکہ تمہیں فرصت نہیں تھی۔ بہت

مصروف ہو گئے ہو۔ یہی بات ہے نا؟ دنیا تمہارے لئے سب کچھ ہے۔ جانے والے کا کیا ہے، چلا گیا۔ حرف غلط تھا، مٹ گیا۔ اور بس“ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں آگ لگ رہی تھی۔ اس آگ کو وہ ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔ انتہائی آزر دہ ہو کر آخر چپ ہو گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر بہن نے منغوم لہجے میں کہا۔ ”بھائی صاحب! ہمیں واقعی افسوس ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ نم اور پُرسوز نظروں سے زمین کے اس ٹکڑے کو دیکھتا رہا جہاں اس کے باپ کی قبر ہونی چاہئے تھی۔ پھر نظر اطراف میں بھٹکی اور دوسری قبروں کا، جو موجود تھیں، طواف کرتی رہیں۔ بہن، بھانجا اور بھانجی چپ چاپ کھڑے رہے۔ مجرمانہ انداز میں گردن جھکائے۔ کچھ دیر یونہی گزری، پھر یکایک اس نے کہا۔

”تم لوگ جاؤ۔“



وہ دیر تک قبروں کے درمیان بھٹکتا رہا۔ ٹوٹا ہوا، دل گرفتہ اور گمشدہ۔ ایک ایسے مسافر کی طرح جس کا مال و متاع ہی نہیں، زندگی کا زادراہ بھی لٹ چکا ہو۔ زادراہ۔ ہاں، زندگی کے سفر میں یادیں اور ہمارے پرکھوں کے نام و نشان بھی ہمارے زادراہ کا حصہ ہوتے ہیں۔ جب یادیں لٹ جائیں اور نام و نشان مٹ جائیں تو ہم بالکل تہی دست و کنکال ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کنکال ہو چکا تھا اور بے مایہ ہو کر قبروں کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ اُس کی نظریں حسرت زدہ نظریں قبروں کو دیکھ رہی تھیں اور کتبے پڑھ رہی تھیں۔ نام، تاریخ، پیدائش اور وفات۔ خوبصورت عبارتوں سے مرصع۔ کہیں کہیں دل میں اتر جانے والے اشعار بھی درج تھے۔ جب بھی کسی خوبصورت شعر پر نظر پڑتی، اس کے دل میں ایک کک دل سوز کک اُٹھتی اور اسے مزید افسردہ کر دیتی۔

دھیرے دھیرے دھوپ کا اُجالا ماند پڑا، پھر دھندلکے کی چادر خلا سے اُتری اور چپے چپے پر پھیل گئی۔ قبرستان سے باہر سڑکوں پر اور دکانوں میں بتیاں روشن ہو گئیں اور سارا شہر جگمگا اُٹھا۔ مگر قبرستان کے اندر محیط ویرانی، اُداسی کچھ اور بوہمی اور بتدریج سیاہ پوش ہونے لگی۔ وہ سست قدمی سے چلتا ہوا صدر دروازے کی جانب آیا۔ دائیں طرف وہ خالی زمین تھی جہاں بہن کے بیان کے مطابق ابا کی قبر تھی۔ بائیں جانب کچھ قبریں دور تک قدرے بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ اُس نے ان تمام قبروں کو دیکھا، پھر نگاہ خالی قطعہ مین کی طرف گئی اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اُنھی۔ تصور میں اُس نے اپنے ابا کی قبر دیکھنے

کی کوشش کی اور کتبے کی تحریر پڑھی۔

اپنے پیارے ابا کی یاد میں۔

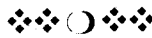
شفیق احمد ولد رفیق احمد

پیدائش 1927ء وفات 2002ء

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

یہ مصرع اُس نے لکھ کر بھیجا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ کتبے پر ضرور نکلھوایا جائے لیکن اب نہ قبر تھی، نہ کتبہ۔ اُس کے ابا کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔

وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور گلوگیر و دل گرفتہ انداز میں زمین کے خالی ٹکڑے کو دیکھتا رہا، پھر نظر اگر جیتی اور پھولوں کے پیکٹ پر ڈالی۔ جو اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھے۔ کیا کروں؟ اب ان پھولوں اور اگر جیتی کا کیا کروں؟ اُس نے ڈکھ سے سوچا اور خالی زمین کو ایک بار پھر دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت جب وہ خالی زمین کو دیکھ رہا تھا اور ابا کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا خیال اپنے بچوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بچے اب بڑے ہو گئے تھے اور اپنی اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں ڈوب کر انہوں نے اپنی ایک علیحدہ اور مخصوص دنیا بنالی تھی جس میں کسی اور کا گزر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خود اس کا بھی۔ وہ کبھی کبھار ہی اس کی خیریت پوچھتے تھے۔ کیونکہ بہت مصروف تھے۔ بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ یکایک سہم گیا۔ ایک لرزہ خیز خیال خود بخود ذہن میں ابھرا اور اس کی رگوں میں خون کو منجمد کرتا چلا آیا۔ کیا واقعی؟... اُس نے پڑمردگی سے دو ایک بار دھیرے دھیرے سانس لی اور پتھرائی ہوئی نظروں سے خالی قطعہ زمین کو دیکھتا رہا۔



لاکھوں میں ایک

کمرے میں موسیقی کی آواز گونج رہی تھی۔ شاید اسپاٹس گرلز کا کوئی گیت تھا۔ گیت کی ذہن اور موسیقی کے مد و جزر پر کرن کا چہرہ یوں تھرک رہا تھا، پلک رہا تھا اور لہرا رہا تھا، گویا وہ نشے میں ہو اور سچ مچ وہ نشے میں تھی۔ مگر بیڑیا الکوحل کے نشے میں نہیں، بلکہ نشہ تھا خوشی کا، جوش کا اور سرمستی کا۔ جس نے اسے نیم مدہوش سا کر دیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک افریب مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر دفور جذبات نے ایک متمہاٹ سی پیدا کر دی تھی۔ اس کے سانولے بازو فضا میں بلند تھے اور اس کی سڈول ٹانگیں جو نصف رانوں تک عریاں تھیں، گیت کے ردھم پر ہولے ہولے تھرک رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار گویا وہ خوب صورت نہیں تھے، بس جوانی کے رنگ نے انہیں جاذب نظر بنا دیا تھا، مگر اس کا جسم واقعی دلکش تھا۔ اس طرح ترشا ہوا کہ ہر خرم، ہر عضو اپنی جگہ مکمل تھا۔ جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ کمر کا خم اتنا ہی تھا جتنا اسے ہونا چاہئے تھا۔ سینے کا ابھار، کولہوں کے دائرے اور پنڈلیوں کی گونیاں، سر سے پاؤں تک پورے بدن کا ہر نشیب، ہر فراز اتنا متناسب و موزوں تھا کہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اگر کہیں ذرا سی بھی کمی بیشی ہو تو اس کا بدن اپنی تمام حشر ساماں دلکشی اور پُرفسوں جاذبیت کھو بیٹھے گا۔

جم یعنی جمشید احمد دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کی پُرشوق نظریں کرن پر جمی ہوئی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی انگلیاں موسیقی کے زیر و بم اور کرن کے جسم کی جنبشوں پر چٹکی بجانے میں مصروف تھیں، جبکہ بائیں ہاتھ میں بیڑ کا ڈبا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹ گیت کے بول پر تھرکتے، پھر وہ ایک چھوٹی سی چٹکی لیتا اور سرور میں ڈوبی آواز میں نعرہ لگاتا۔

”ونڈرفل کرن!..... یو آر وونڈرفل۔“

ایکایک دروازہ کھلا اور میگی نے اندر جھانکا۔

جم نے گردن گھمائی، میگی کو دیکھا اور خوش دلی سے ہوا۔ ”کم ان میگی!..... کہاں

تھیں تم اب تک؟“

میگی کے نیم انگلش، نیم آئرش چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر جم کے پاس آئی اور قالین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اتنے قریب کہ ان کے

جسوں کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ جم نے بے تکلفی سے اپنا بایاں ہاتھ میگی کی کمر میں ڈال دیا۔ ہر چند کہ میگی اس کی گرل فرینڈ نہیں تھی مگر اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بس ایک نظر جم کو دیکھا اور ہولے سے مسکرائی۔

جم نے بیزر کا ڈبا اُس کی طرف بڑھایا۔ ”وانٹ اے سب.....؟“
میگی نے اس کے ہاتھ سے ڈبا لے کر ایک بڑا گھونٹ بھرا، پھر بے تکلفی سے جم کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر بولی۔
”کرن بہت اچھا نا چتی ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں۔“ جم نے سر ہلایا۔ شی از اے ونڈر فل ڈانسر۔“ پھر اس نے غور سے میگی کو دیکھا۔ ”کیا بات ہے میگی! تم کچھ آپ سیٹ دکھائی دیتی ہو۔ خیریت تو ہے نا؟“
”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“

”اور وہ اقرار کہاں ہے؟ ہم تو تم دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔“
میگی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

اتنے میں گیت ختم ہو گیا۔ کمرے میں گونجتی ہوئی میوزک کی پُر شور آواز خاموشی میں ڈوب گئی۔ کرن نے اپنے خوبصورت اور پگھلے بدن کو وہ ایک بار اور لہرایا۔ پھر گھوم کر میگی کو دیکھا۔ اتنی دیر تک تیز اور پُر جوش رقص کرنے کے بعد اس کے پیروں پر پسینہ اُبھر آیا تھا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پیشانی، گالوں اور گردن پر چمک رہی تھیں اور سینہ سانسوں کی تیز آمد و رفت کے باعث بار بار اُبھر رہا تھا اور ڈوب رہا تھا۔ اُس نے ہتھیلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا، کرن ان کی طرف دیکھ کر زور سے مسکرائی۔ پھر قریب آ کر ان دونوں کے مقابل قالین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ میگی کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایک کش لیا، پھر بولی۔
”بہت اچھا گیت ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں۔“

کرن جم کی گرل فرینڈ تھی۔ اس نے دیکھا کہ جم کا ہاتھ میگی کی کمر میں ہے مگر اس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایک کش اور لے کر سگریٹ میگی کو واپس کی، پھر تشویش کے ساتھ بولی۔ ”کیا بات ہے میگی! تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ اور وہ انکی کہاں ہے؟ ہم نے تم دونوں کا کالج کے گیٹ پر کافی دیر انتظار کیا تھا۔“

”مجھے نہیں معلوم انکی کہاں ہے۔ میں نے تو اسے ایک ہفتے سے نہیں دیکھا۔“

”مگر کل تو مجھے ملا تھا، اب بری میں۔“ جم نے کہا۔

”ضرور ملا ہو گا۔ مگر مجھے نہیں ملا۔“ میگی کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”میں تو اسے تلاش

کرتی رہی ہوں۔ اسٹور میں بھی، جہاں وہ کام کرتا ہے، دو مرتبہ گئی۔ لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھا۔“ وہ رُکی، پھر سر ہلا کر بولی۔ ”مجھے ڈر ہے کہ شاید اب وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔“

”تو تم اس بناء پر پریشان ہو.....؟“ کرن نے پوچھا۔

میگی نے جم کے ہاتھ سے ٹن لے کر ایک اور گھونٹ بھرا، پھر کہنے لگی۔ ”کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے؟ میں اُس کے ساتھ اتنا آگے جا چکی ہوں کہ اب واپس ہونے کا خیال بھی تکلیف پہنچاتا ہے۔ لیکن اب وہ مجھے نظر انداز کر رہا ہے۔“

”نہیں، خیر ایسی بات نہیں ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔“ جم نے اُس کی کمر پر تھیلی دی۔ ”اصل میں اُس کے گھر میں کچھ مسائل ہیں جن کے باعث وہ کچھ الجھا ہوا ہے۔ مجھے ملے گا تو بات کروں گا۔“ معاوہ چپ ہو گیا۔

”تم شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔“ میگی نے اسے گہری تجسس نظروں سے گھورا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ جم نے نظریں چرائیں۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں اس سے بات کروں گا۔“

لیکن سچ یہی ہے کہ جم کی زبان پر چند الفاظ آئے تھے، جنہیں اُس نے قصد آروک لیا تھا۔ وہ میگی کو مزید پریشان اور آزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ اقرار عرف کی جان بوجھ کر میگی سے کتر رہا تھا، یا یہ کہ دونوں کی ملاقات کا نہ ہونا محض اتفاق تھا۔ تاہم اتنا اسے علم تھا کہ گزشتہ دو تین ہفتوں سے ایک اور لڑکی اس کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ جم اس لڑکی سے متعارف نہیں ہوا تھا۔ بس دو تین بار اکی کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ تھی تو ایشین ہی مگر حلے اور لباس سے پتا چلتا تھا کہ غالباً یوگنڈا یا کینیا سے آئی ہے۔ جم کو علم نہیں تھا کہ ان کی دوستی محض رسمی تھی، یا بات کچھ زیادہ تھی۔ لیکن اگر اکی نے اسے باقاعدہ اپنی گرل فرینڈ بنالیا ہو تو کم از کم جم کے لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اکی اس طرح لڑکیاں بدلتا تھا جس طرح انگلستان کا موسم بدلتا ہے۔ میگی سے پہلے مینا اکی کی دوست تھی، اس سے پہلے روبی تھی اور اس سے پہلے سلی عرف سلمی۔ میگی تو اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ وہ کئی موسم نکال گئی تھی۔ جم کے ذہن میں اندیشہ سر اُبھار رہا تھا کہ شاید اکی نے میگی سے دوستی ختم کرنے کا واقعی ارادہ کر لیا ہے اور سبب یہ ہے کہ اسے ایک نئی لڑکی مل گئی ہے۔ مگر یہ بات ایسی تھی کہ سردست میگی کو بتانا مناسب نہیں تھا اس لئے وہ چپ ہو گیا۔ تاہم دل ہی دل میں اس نے ارادہ کیا کہ اکی کو تلاش کرے گا اور اس سے میگی کے سلسلے میں گفتگو کرے گا۔

یہ ایک میگی نے کہا۔ ”اور وہ سبکی کہاں ہے؟“

”ارے ہاں۔“ کرن چونک کر بولی۔ ”وہ تو کچن میں چائے بنانے گئی تھی، ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی۔ سلی گرل۔“

”میں، کیبھتی ہوں۔“ میگی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ دروازے تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ جم نے بیئر کا ڈبا ایک طرف رکھ کر دونوں بازو پھیلا دیئے۔ کرن مسکرائی اور اس کی بانہوں میں سا گئی۔ پھر ان کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔



نکی کچن میں تھی مگر اکیلی نہیں تھی۔ دانیال بھی ساتھ تھا جو اپنے دوستوں میں ڈینی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کمر پر کیتلی چڑھی ہوئی تھی اور اس کا پانی بری طرح کھول رہا تھا اور اس سے اٹھتی ہوئی گہری بھاپ چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ مگر ان دونوں کو اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ دروازہ کھلنے کی ہلکی سی چرچاہٹ سنائی دی تھی اور قدموں کی چاپ بھی کانوں تک پہنچی تھی اور وہ جان گئے تھے کہ کوئی کچن میں آیا ہے۔ مگر انہیں اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ دونوں تو اس طرح ایک دوسرے میں سمائے ہوئے تھے جیسے ایک جان اور ایک جسم ہوں۔ نکی کے لمبے بال شانوں اور پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک باریک سلی فراک تھا جو بمشکل نصف ٹانگوں تک پہنچ رہا تھا۔ فراک کا گلا بھی اتنا کشادہ تھا کہ اس کے سینے کی پوری طرح ستر پوشی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی لمبی خوبصورت بانہیں ڈینی کے گلے میں جمائیں تھیں اور وہ پوری طرح ڈوب کر، مدہوش ہو کر اس کے ہونٹوں کو چوم رہی تھی۔ ڈینی کا ایک ہاتھ اس کی کمر میں تھا، جبکہ دوسرا ہاتھ اُس کے جسم کے دلکش نشیب و فراز کی پیائش کر رہا تھا۔ پہلے اُس کے ہاتھ نے گولائیوں کو سر کیا، پھر کمر کی گہرائی میں اُترا، پھر اوپر سرکا۔ لیکن جونہی سینے سے چھوا، نکی نے جھٹکے سے ہونٹ الگ کئے، اُس کے ہاتھ پر ہلکی سی چپت ماری اور شوخی سے بولی۔

”ڈونٹ بی سلی۔“

”اوہ، کم آن نکی!“

”نو، یواسٹوپڈ۔“

پھر اُس نے گھوم کر میگی کی طرف دیکھا۔ ”ارے میگی! تم کب آئیں؟“

”بس ابھی۔“ میگی شوخی سے مسکرائی۔ ”تم تو چائے بنانے آئی تھیں نا۔“

”اوہ گوٹ۔۔۔۔۔“ نکی زور سے چیخی۔ ”میں تو بھول ہی گئی۔“

وہ تیزی سے کیتلی کی طرف لپکی۔

نکی اور کرن کو قاعدے سے اس وقت کالج میں ہونا چاہئے تھا مگر وہ نہیں تھیں۔ ذہنی کو بھی کالج جانا تھا، وہ بھی نہیں گیا تھا۔ جم یعنی جمشید کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اُسے پولی ٹیکنیک میں ہونا چاہئے تھا مگر اس نے بھی چھٹی کر لی تھی۔ اب وہ سب کرن کی چاچی کے چھوٹے سے مکان میں جمع تھے۔ کرن کی چاچی اپنی بیٹی سے ملنے لیسٹر گئی ہوئی تھیں۔ چابی کرن کے پاس تھی۔ لہذا انہوں نے ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے وہ دن کرن کی چاچی کے مکان میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ نکی، کرن اور جم وغیرہ گھر سے نکلتے کالج جانے کے لئے لیکن کالج جانے کے بجائے ادھر ادھر مڑ گشت کرتے، پارک کا چکر لگاتے گولف کورس کی طرف نکل جاتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ذہنی اپنے بھائی کی کار لے آتا اور وہ سب بلیک پول یا ساؤتھ پورٹ پر شب خون مارتے۔

چائے بنا کر وہ کمرے میں آئے۔ کرن، نکی اور میگی نے چائے کی چسکیاں لینی شروع کیں۔ ذہنی اور جم بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ ذہنی نے ایک بڑا گھونٹ بھرنے کے بعد پیکٹ سے دو سگریٹ احتیاط سے برآمد کیں، سلگا کر ایک جم کو دی، دوسری نکی کی طرف بڑھائی۔

”بھری ہوئی ہے.....؟“ نکی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”میں صرف دو کش لوں گی۔“

نکی نے ایک طویل کش لیا۔ مگر دھواں ہونٹوں سے خارج نہیں کیا، بلکہ سینے میں اتار لیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک سرور آمیز لہر اور ایک انشاز انگیز لذت کو اپنے جسم میں دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ ایک مستی، ایک سرخوشی، رگ رگ میں، سر سے پاؤں تک۔ ایسا لگتا تھا، ایک انوکھا آتشیں کیف ہے، جو رگ رگ میں شعلے کے مانند لپکتا چلا گیا ہے۔ وہ چند لمحے اس مدھوش کر دینے والے انوکھے سرور سے لذت کشید کرتی رہی، پھر اس نے آنکھیں کھولیں، ایک اور کش لیا، پھر سگریٹ کرن کی طرف بڑھائی۔

”کرن ڈارلنگ!“

کرن نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے کر ہونٹوں سے لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

میگی معاً اٹھی اور ٹیپ ریکارڈر ایک بار پھر آن کر دیا۔

موسیقی کی آواز بلند ہوئی۔ مرکری کا کوئی گیت تھا۔ مگر گیت کیا تھا، ایک شو تھا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے کا عمل۔ گیت کے الفاظ، دھن اور سازوں کی ترتیب کو سمجھنا سہرا محال تھا۔ مگر بہر حال اس بے ترتیب شور میں بھی گویا ایک ترتیب تھی۔ جیج وپکار میں ایک لے اور دھن،

جس سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آنکھیں بند، جسم گردش میں اور بازو فضا میں بلند۔ وہ رقص بھی ایسا تھا جس میں کوئی ترتیب نہیں تھی، کوئی توازن نہیں تھا۔ بس جسم کی آڑی ترچھی حرکات تھیں اور جھٹکے تھے۔ اور شاید یہی بے ترتیبی اور عدم توازن اس رقص کا حسن تھا۔ نکی کو رقص سے دلچسپی تو تھی، مگر کچھ زیادہ نہیں۔ وہ رقص میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی اور قالین پر ہاتھ سے تھکی دے رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ ناچتے ناچتے ڈینی نے اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھ ماری۔

جواب میں نکی اور زیادہ کھل کر مسکرائی۔

وہ دیر تک رقص کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کی پیشانیاں اور گردنیں پسینے سے تر ہو گئیں اور چہرے یوں متمتا اٹھے، جیسے ان کے اندر آگ لگی ہو اور بج بج آگ ہی لگی تھی۔ خوشی کی آگ، جوش کی آگ اور لمحہ موجود سے کشید کی ہوئی لذت کی آگ۔ اپنی ذات کے سوا اور اپنے وجود سے باہر انہیں کسی شے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ جو ہو رہا ہے، ہونے دو، ہمیں کسی بات سے کوئی سروکار نہیں۔ نہ دنیا سے، نہ گزرے ہوئے کل سے اور نہ آنے والے کل سے۔ ہم تو صرف اس ایک لمحے میں زندہ رہنا چاہتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے۔ ہماری گرفت ہے۔ ہم اس ایک لمحے سے سرت کی، نشاط کی، ایک ایک رتی کشید کر لینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جینے کے لئے، ایک بھر پور اور مکمل زندگی جینے کے لئے ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے۔ اور اس دنیا میں کتنے ہیں جنہیں ایسا ایک لمحہ بھی میسر آتا ہے۔ جس پر ان کا اختیار ہو، جو ان کا اپنا ہو۔

آخر کار گیت ختم ہوا۔ رقص تمام ہوا۔ موسیقی ختم گئی۔ جم نے ایک سگریٹ جلائی، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔

”وقت ہو گیا ہے..... اب چلنا چاہئے۔“ اس نے کہا۔

”اگلے ہفتے کا کیا پروگرام ہے؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”یہ اگلے ہفتے طے کریں گے کہ کیا کرنا ہے، کہاں جانا ہے۔“ کرن نے معاذرا بے

چینی سے کہا۔ ”بس اب تم لوگ جاؤ، ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“

جم اور ڈینی رخصت ہوئے۔ چند منٹ بعد میگی بھی چلی گئی۔ اب کمرے میں نکی تھی اور

کرن۔ ان دونوں نے سب سے پہلے گھر کی حالت سنواری تاکہ جب کرن کی چاچی آئیں تو انہیں کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ منہ کی بدبو مٹانے کے لئے ماؤتھ واش سے منہ کی دھوئی اور دو دو الائچیاں چبائیں۔ پھر وہ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھیں اور اپنے اپنے بیگ کھولے جن میں کالج کی چند کتابوں کے علاوہ بھی کئی اشیاء تھیں۔ نکی نے

اپنے بیگ سے چند چوڑیاں برآمد کیں، ایک بڑا اسکارف، کچھ کپڑے اور ایک طلائی زنجیر والا لاکٹ، جس پر سات سو چھیاسی کا ہندسہ کندہ تھا۔

جب وہ اپنی اسٹریٹ میں داخل ہوئی تو سوا چار بج رہے تھے۔ جو کالج سے اس کی واپسی کا وقت تھا۔ اب اس کے جسم پر مختصر سلکی فرائک کے بجائے گہرے رنگ کا لمبا چمپر تھا اور کتھی رنگ کا پاجامہ جو زنانہ پتلون کی طرز پر سیا گیا تھا۔ جمپیر کے اوپر اُس نے ایک لمبا زنانہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں چار چار چوڑیاں تھیں اور گلے میں لاکٹ۔ ہونٹوں پر سرخی کا خفیف سا نشان بھی نہیں تھا۔ سر پر رومال بطور حجاب اس طرح باندھا گیا تھا کہ گردن اور نصف سے زیادہ پیشانی بالکل مستور ہو گئی تھی۔ بغل میں بیگ دبائے وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ گرد و پیش سے قطعی بے نیاز تھی۔

اس کے گھر کا نمبر تیرہ تھا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ مسز رحمان موجود ہیں۔ دوسرے صوفے پر اس کی اماں براجمان تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر ذرا فخر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”آگئیں بیٹا.....؟“

”ہاں امی!“

پھر اُس نے ہاتھ اٹھا کر نہایت ادب سے مسز رحمان کو سلام کیا۔ مسز رحمان نے دعا دی۔ ”جیتی رہو بیٹی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

پھر وہ دروازے سے باہر آئی اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ابھی اس نے دو تین پائیدان ہی طے کئے تھے کہ کانوں میں مسز رحمان کی آواز آئی۔

”اے بہن! سچ کہہ رہی ہوں، جب بھی تمہاری بیٹی کو دیکھتی ہوں، دل خوش ہو جاتا ہے۔ بہت ہی نیک اور فرمانبردار ہے۔ شرم و اطاعت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس میں۔

ایسی بیٹیاں کس کو ملتی ہیں بھلا۔“

پھر مامتا، خوش اور غرور کے نشے میں ڈوبی اُس کی اماں کی آواز اُبھری۔ ”ارے مسز

رحمان! میری نکہت تو یوں سمجھو کہ بس اکھوں میں ایک ہے۔“

نکہت یعنی نکلی کے ہونٹوں پر ایک چور مسکراہٹ اُبھری اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

دینو

منجھلی روتے روتے آخر تھک کر سو گئی تھی۔ بڑی کمرے کے ایک نیم تاریک کونے میں سر نیوڑائے خاموش بیٹھی تھی اور یوں گرد آلود فرش کو گھور رہی تھی، گویا وہاں اپنے بخت سیاہ کی داآزار تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مگر چھوٹا چپ نہیں ہوا تھا۔ مسلسل ریں ریں کئے جا رہا تھا۔

دین محمد صحن کے لکھوری اینٹوں والے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس کا سردائیں ہاتھ کی تھیلی پر تھا اور اس کی نظریں اندر کمرے میں بھٹک رہی تھیں۔ ان نظروں میں لاچاری تھی، شکست تھی اور شدید حسرت اور بے کسی۔ اور اس جھلاہٹ کا عکس بھی جو اس کے سینے میں موجزن تھی۔ رفتہ رفتہ جھلاہٹ بڑھی اور غصے میں بدل گئی۔ یہ کبخت، مردود آخر چپ کیوں نہیں ہوتا؟..... کیوں ریں ریں کئے جا رہا ہے؟..... اب اگر روٹی نہیں ہے، دودھ نہیں ہے تو میں کہاں سے اؤں؟..... کہاں جا کر اپنا سر پھوڑوں؟ اس کبخت کو اگر روٹی چاہئے تھی تو نامراد میرے گھر کیوں پیدا ہوا؟ کہیں اور پیدا ہوتا۔ کسی ایسے گھر میں جہاں دولت کی ریل پیل ہوتی۔ بسکٹ، کیک، پیسٹری اور روٹی کے انبار لگے ہوتے اور دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوتیں۔ نوکر چاکر ہر دم ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔ لیکن پیدا ہوا ہے میرے گھر میں، دین محمد کے گھر میں۔ بدنصیب، بد قسمت، بے مایہ دین محمد کے گھر میں۔ جو نہ اسے روٹی دے سکتا ہے اور نہ خود اپنا پیٹ بھر سکتا ہے۔ اب اگر اس بے آسرا اور ٹھکرائے ہوئے دین محمد کے گھر پیدا ہوا ہے تو پھر ترس ایک ایک بوند کے لئے..... ایک ایک لقمے کے لئے۔ اور یونہی ترس ترس کر، سسک سسک کر مر جا۔ جیسے اور بے شمار جیتے جاگتے انسان، بڑے بوڑھے، عورتیں، جوان اور بچے مر گئے یا مار دیئے گئے، ویسے ہی تُو بھی مر جا۔ کم نصیب..... مر جا..... یہ لفظ ذہن میں گونجا تو معاً اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک ابھری۔ سینے کے اندر ادا سا کھواا اور اس نے سفاکانہ انداز میں ہونٹوں پر بان پھیری۔ ایک خواہش..... ایک زہریلی خواہش اُس کے اندر یوں ابھری جیسے سانپ

اپنے بل میں بل کھاتا ہے، یہ کہ آگے بڑھے اور چھوٹے بیٹے مسیح محمد کی گردن دیوچ لے اور دبانا شروع کر دے۔ جسم و جان کی پوری قوت سے، حتیٰ کہ اس کی زبان لٹک جائے، آنکھیں اُبل پڑیں اور جسم بے جان ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھولنے لگے۔ اس کے بعد بڑی اور منجھلی کے گلے بھی گھونٹ دے۔ پھر بیوی کو بھی اس کے پیار، خستہ اور ناتواں جسم کے زندان سے آزاد کر دے۔ جسم..... ہاں، یہی تو ساری مصیبت ہے۔ ساری جھنجٹ جسم کی ہے۔ جب تک جسم زندہ رہتا ہے، تب تک پیٹ زندہ رہتا ہے۔ پیٹ زندہ رہتا ہے تو کھانا مانگتا ہے۔ روٹی اور دال اور چاول۔ لیکن جب بدن مر جائے گا تو پیٹ بھی مر جائے گا۔ اور جب پیٹ مر جائے گا تو کھانا نہیں مانگے گا۔ روٹی اور دال نہیں مانگے گا۔

موت بھلے ہی ایک دشت ناک شے ہو لیکن بہت سے غذاہوں کا..... زندگی کے غذاہوں کا حل بھی تو ہے۔ جب اور کوئی چارہ نہیں رہتا، جب زندگی چاروں طرف سے بلاؤں میں گھر جاتی ہے، جب سارے آسے ٹوٹ جاتے ہیں اور سارے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو جاتے ہیں تو موت اپنا دروازہ کھولتی ہے اور پناہ دیتی ہے۔ اور آدمی مزید دکھ سے..... ذہن کے دکھ سے اور بھوک کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔

کیا واقعی موت نجات کا دوسرا نام بھی ہے؟

اُس نے ایک بار پھر سُلگتی ہوئی، پُر غضب نظروں سے چھوٹے کو گھورا۔

مگر اُس کے یہ منفی اور جارحانہ احساسات اُس کے ذہن میں اُنھنے والی شدید لاچاری کا محض ایک لمحاتی ردِ عمل تھے۔ چند بل میں غصہ اور جھنجلاہٹ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور تب اس کے دل میں محبت کی لہر اُٹھی۔ نہیں..... وہ بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ ان سب کا گلا کیسے گھونٹ سکتا ہے؟ یہ چھوٹا، منجھلی اور بڑی۔ یہ سب تو اس کے بچے ہیں۔ اس کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اس کے وجود کا حصہ اور اس کی زندگی کا تسلسل ہیں۔ کتنے جتن سے وہ انہیں پالتا رہا ہے۔ خود بھوکا رہا ہے، مگر انہیں روٹی کھلائی ہے۔ ان کے لئے راتوں کو جاگا ہے اور ان کی صحت و زندگی کے لئے ان گنت جدے کئے ہیں۔ تو پھر وہ انہیں کیسے مار سکتا ہے؟..... نہیں، وہ انہیں نہیں مار سکتا۔ ہاں، ان کے لئے خود مر سکتا ہے۔ یہ آخری خیال ذہن میں آیا تو اس کی آنکھیں بیگم گئیں۔ اس نے زور سے سانس لی اور سیدھے ہاتھ کی انگلی سے آنسو پونچھے۔

خدا دایا.....!

پھر اُس کی نگاہ کا زاویہ بدلا اور نظر سیکنہ پر ٹھہر گئی۔ اُس کی بیوی سیکنہ جھلنگا سی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے پانچے کچھ اوپر اٹھ گئے تھے اور اس کی سہانوی، سوکھی

سوکھی، بے رونق پنڈلیاں جھانک رہی تھیں۔ اُس کا سر ایک جانب جھکا ہوا تھا۔ خشک بال جو وقت سے پہلے ہی سفید ہونا شروع ہو گئے تھے، بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے گہری اُداسی اور دیرانی جھانک رہی تھی۔ چہرے پر..... ستے ہوئے، مدقوق چہرے پر شدید حرماں نصیبی تھی۔ الاچاری تھی، خوف تھا اور بھوک تھی مگر زندگی کی کوئی رمت نہیں تھی۔ غربت نے دیے ہی اُس کے خُسن کو تاراج کیا تھا، رہی سہی کسر گزشتہ کچھ دنوں میں خوف اور بھوک نے پوری کر دی تھی۔ گال پچک گئے تھے۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنس گئی تھیں اور اس کا چہرہ ایک استخوانی کھنڈر کی طرح نظر آنے لگا تھا۔

کھنڈر..... دین محمد کے سینے میں یکا یک اس کا دل جُچ کر ٹوٹا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر ایک سرد آہ بھری۔ پہلے تو یہ چہرہ کھنڈر نہیں تھا۔ اور یہ کچھ بہت زیادہ پرانی بات نہیں، کچھ ہی برس تو ہوئے ہیں جب اس کے لیج چہرے پر ایسی تازگی، شادابی اور کشش تھی کہ نظر ایک لمحے کے لئے وہیں جم کر رہ جاتی تھی۔ دین محمد اسے کبھی کبھی مذاق میں اور کبھی محبت سے بنگال کی جادوگرنی کہتا تھا۔ حالانکہ سیکنے نے بنگال کی جھلک تک کبھی نہ دیکھی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں، اس کے سیاہ دراز بالوں میں اور اس کے پورے سراپا میں بنگال کی روایتی جادوگریوں جیسا ہی سحر تھا کہ جو بھی ایک بار دیکھتا، پلٹ کر دوسری بار دیکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا اور یہ صرف چند سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن ان کچھ برسوں میں اس کی شخصیت کا سارا سحر بھاپ بن کر اڑ گیا۔ جب پیٹ میں روٹی نہ پہنچے، جب تنگدستی اور فکریں اور اندیشے شب و روز ڈستے رہیں..... خوف ہر لمحہ دامن گیر رہے تو بنگال کی جادوگریوں کا ہی نہیں، کوہ قاف کی پریوں کا خُسن بھی مر جاتا ہے۔ سیکنے کا خُسن بھی غربت، محرومی اور فکروں کی نذر ہو گیا۔ اگر ایک آدھ رمت کہیں باقی رہ بھی گئی تھی تو گزشتہ کچھ دنوں کے خوف و دہشت اور عدم تحفظ کے احساس نے اسے بھی چھین لیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک اُجاڑ، ویران، بوسیدہ کھنڈر بن کر رہ گئی تھی جس میں مردہ خوابوں، اُمیدوں اور خواہشوں کی چڑیلیں ماری ماری پھرا کرتی تھیں۔

وہ کچھ دیر ترس بھری اور پشیمان نظروں سے سیکنے کو دیکھتا رہا، پھر زمین پر دونوں ہاتھ ٹکا کر آہستہ سے اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اُس کے گھٹنوں کی ہڈیاں کڑکڑائیں۔ ہونٹوں سے خود بخود ایک کراہ خارج ہوئی۔ کھڑا ہوا تو کمر میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر لاشعوری طور پر اپنے آپ کو سہارا دیا، پھر افسردہ نظروں سے صحن کے باہر دیکھا۔ سامنے والے مکان میں استادہ نیم کے پیڑ کی گھنی شاخوں میں کچھ دیر اُس کی نظر ریں بسیں، جہاں اند ایک چڑیاں شور مچانے میں مصروف تھیں۔ پھر اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

آسمان..... گرد و غبار اور دھوئیں کے عقب میں دُور تک پھیلا ہوا، اکھوں کروڑوں سال پرانا، دیران، بے حس آسمان، یوں سرد مہری اور تحقیر سے دھرتی کے باسیوں کو دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو..... کم بختو! یہ کیا ہے تم نے؟ یہ کیا کر رہے ہو تم؟..... کیسی سربسز و شاداب، خوبصورت، انمول اور بے پناہ نعمتوں سے بھری ہوئی دنیا تمہیں ملی تھی۔ لیکن تم نے اس دنیا کا..... رنگ و نور اور حسن سے معمور اس دنیا کا کیا حشر کیا۔ دن رات اسے اُجاڑنے اور برباد کرنے میں جتے ہوئے ہو۔ ڈوب مرو بد بختو! چلو بھر پانی میں۔ مگر نہیں، تم نہیں مرو گے کہ تم تو بے حیا اور کمینے بھی ہو۔

دین محمد کی خالی خالی نظریں کچھ دیر آسمان پر بھٹکتی رہیں، پھر نیچے اُتریں اور چھوٹے سے آنگن کے مغربی کونے میں کھڑے پرانے اور قدرے بدنما رکشے پر جم گئیں۔ یہ رکشا دین محمد کا نہیں تھا۔ اس کے مالک تو ماسٹر بشیر تھے۔ دین محمد ان کے لئے روزانہ اُجرت کی بناء پر رکشا چلاتا تھا۔ جس دن آگ بھڑکی تھی، اُس دن دین محمد کو اتنا موقع ہی نہیں مل سکا تھا کہ وہ ماسٹر بشیر کی دکان پر جا کر معمول کے مطابق رکشا ان کے حوالے کر سکتا۔ جان بچا کر سیدھا وہ گھر آیا اور پھر گھر ہی میں قید ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ سڑکوں پر موت نے ڈیرے جما لئے تھے۔ ماسٹر بشیر کی دکان اور گھر خاصے دُور اور دوسرے علاقے میں تھے۔ اس علاقے میں بہیمیت اور درندگی کا ایسا ناچ ہوا کہ سارے راستے مسدود ہو گئے اور رکشا کی واپسی تو درکنار، وہ ماسٹر بشیر کی خیریت معلوم کرنے میں نہ جاسکا۔ پتا نہیں بے چاروں پر کیا گزری۔ بچے بھی ہیں یا..... مگر اس آخری خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا اور دل ہی دل میں بڑی عاجزی سے دعا مانگی۔

”اللہ کرے ماسٹر بشیر خیریت سے ہوں۔“

رکشا کافی پرانا تھا۔ اس کی گدی کی ریگزین دو ایک جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ رنگ و روغن پھیکا پڑ گیا تھا اور پہیوں پر کہیں کہیں رنگ بھی لگ گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ رکشا دین محمد کو بہت عزیز تھا۔ اس کے اور رکشے کے درمیان گزشتہ چند برسوں میں ایک خاص جذباتی رشتہ خود بخود استوار ہو گیا تھا۔ اس جذباتی تعلق خاطر کا سبب یہ تھا کہ پرانا اور کافی بدنما ہونے کے باوجود یہ رکشا برسوں سے دین محمد اور اس کے بچوں کی روٹی کا وسیلہ بنا ہوا تھا۔ صبح سے شام تک وہ رکشا شہر کی سڑکوں پر دوڑاتا رہتا۔ دھوپ میں، بارش میں۔ خود اس کا حوصلہ اکثر پست ہونے لگتا تھا لیکن رکشا اُف تک نہ کرتا۔ دھوپ سے تپتی سڑکوں پر بے چوں و چرا دوڑتا رہتا اور شام تک اتنے پیسے مہیا کر دیتا کہ اس کے بچوں کو دال روٹی مل جاتی۔ یہ رفاقت دونوں کے درمیان برسوں سے قائم تھی اور رفتہ رفتہ دین محمد ایسا محسوس کرنے لگا تھا

جیسے وہ رکشا کوئی بے زبان مشین نہیں ہے، بلکہ انسانوں کی طرح اس کے اندر بھی احساسات اور جذبات ہیں۔ وہ دین محمد کے دکھوں، ضرورتوں اور حالات و مسائل کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ دین محمد کی طرح وہ بھی اس کے بچوں کو پالنے کا فریضہ ایک ذمے داری سمجھ کر نبھارہا ہے۔

دین محمد چند لمحے اپنائیت اور قدرے ممنونیت سے رکشے کو دیکھتا رہا، پھر تھکے ہوئے انداز میں ایک افسردہ سانس لے کر گھوما اور اپنے خستہ جسم کا بوجھ اپنی ناتواں مانگوں پر گھیٹ کر اندر کمرے میں لے گیا۔

چھوٹے بچے کی ریں ریں بدستور جاری تھی مگر اب اس کی آواز شاید نقاہت یا شاید تھکاوٹ کے سبب مدہم پڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر چند ایک کھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے گالوں پر سوکھ کر بدنما اور کریہہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دین محمد اس کے قریب ٹھہر کر خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے جھکا اور بچے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

”چپ ہو جانا.....!“ اس کی آواز کمزور تھی مگر اس سے گہری شفقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن بچہ چپ نہیں ہوا۔

”کیا کریں بھی۔ یہ تو چپتا ہی نہیں۔“ وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”بھوکا ہے نا۔“ سکیذہ نے سنا ہوا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”مگر تم پریشان نہ ہو۔ ابھی سو جائے گا۔“

”کیا گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے؟“

سکیذہ کو اس بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس ایک نظر..... ایک شاکی، مجروح نظر کافی تھی۔ دین محمد نے یوں گردن جھکالی، گویا اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہو۔ کچھ دیر گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا اور بچے کی پشت پر ہولے ہولے تھپکی دیتا رہا، پھر افسردہ آواز میں بولا۔

”کیا کروں؟..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا دن دیکھنا پڑے گا۔ کیسی مجبوری اور الاچاری ہے۔ بچے بھوکے ہیں اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پڑوسی بھی جان بچا کر بھاگ گئے یا کیمپ میں چلے گئے۔ جو دو چار رہ گئے ہیں ان سے کہاں تک مانگوں؟ اور مانگوں بھی تو کیا دے سکتے ہیں وہ؟ ان کے اپنے گھروں میں بھی تو بھوک بال کھولے اور پاؤں پیارے بیٹھی ہے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ سکیذہ نے پست آواز میں اتفاق کیا۔ ”جانے یہ عذاب کب

ختم ہوگا اور کب ہمارے سروں سے دہشت کی چادر اترے گی۔ بڑے تو خیر برداشت کر سکتے ہیں، بھوکے بھی رہ سکتے ہیں مگر بچے.....؟“ سیکنے نے رک کر ٹھنڈی سانس لی۔ ”کل تو خیر انہیں روٹی مل گئی تھی۔ پیٹ بھر گیا تھا۔ مگر آج صبح سے بھوکے ہیں۔ اور.....“ پھر وہ یکایک سہم کر چپ ہو گئی۔

دین محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اور..... اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کتنا لاچار ہوں۔“

سیکنے کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ”مگر تم اپنے آپ کو کیوں الزام دے رہے ہو؟ تمہارا تو کوئی دوش نہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ سب ان لوگوں کا کیا دھرا ہے جو نہ جانے کب سے دلوں میں نفرت اور دشمنی چھپائے بیٹھے تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔ جو نبی انہیں موقع ملا، اپنے دلوں کا سارا زہر انہوں نے اُگل دیا۔ عذاب میں پڑے تو ہم جیسے عام، غریب اور بے سہارا لوگ۔“ سیکنے نے رک کر ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ بھی شاید ہمارے کرموں کا پھل ہے۔“

دین محمد چپ رہا اور غمگین نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

”او، اسے مجھے دے دو۔ تم خواہ مخواہ پریشان مت ہو۔“

بچے کو بیوی کی گود میں دے کر دین محمد کچھ دیر کھڑا رہا اور بے مقصد نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر کمرے سے باہر آیا اور بغیر کسی نیت یا ارادے کے چھوٹا سا آنگن عبور کر کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بھی اُس نے اس انداز میں کھولا، گویا اسے علم نہ ہو کہ کیا کر رہا ہے گلی میں نکل کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور دائیں بائیں نظر ڈالی۔ پوری گلی ایک آبپنی اور لرزہ خیز سنائے اور سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس گلی میں صبح سے شام تک خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ سودا سلف بیچنے والے چکر لگاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور بچے سارا دن دوڑتے بھاگتے اور شور مچاتے نظر آتے تھے۔ مگر اب وہی گلی ایک سرے سے دوسرے سرے تک خاموشی اور ویرانی کے کفن میں اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ لگتا تھا، کوئی ذی روح وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ گلی کے بیشتر افراد نے اسی میں عافیت جانی کہ جان بچانے کے لئے کسی محفوظ علاقے میں چلے جائیں یا کیمپ میں پناہ لے لیں۔ حالانکہ یہ علاقہ بھی کچھ زیادہ غیر محفوظ نہ تھا، مگر یہ خطرہ بہر حال موجود تھا کہ ممکن ہے، وہ لوگ جو خون کے پیاسے ہیں، یہاں تک بھی پہنچ ہی جائیں۔ چنانچہ بیشتر افراد گلی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کچھ لوگ نہیں گئے تھے یا نہیں جاسکتے تھے۔ تن بہ تقدیر رک گئے تھے۔ اگر موت نہ ہو چکی ہے تو کہیں بھی جائیں، بچ نہیں سکتے۔ موت کے

خونفک پنچے ہمیں تلاش کر ہی لیں گے اور زندگی کا کمزور دھاگا توڑ ڈالیں گے۔ لیکن اگر زندگی ہے تو لاکھ خطرہ سہی، موت ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

نہ جانے والوں میں دین محمد بھی شامل تھا۔ تاہم اس کے رکنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے اپنے بچوں کی جانیں عزیز نہیں تھیں بلکہ ہوا یہ تھا کہ اسے بھاگنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ پہلے دو ایک دن تو وہ اس خیال میں رہا کہ خون خرابا دو ایک دن میں تھم جائے گا اور گھر چھوڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے بعد حالات اس حد تک خراب ہو گئے کہ وہ گھر چھوڑنے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔ یہ خوف پاؤں کی زنجیر بن گیا کہ ممکن ہے، گلی چھوڑنے کے بعد کیمپ یا کسی زیادہ محفوظ علاقے تک پہنچنا نصیب ہی نہ ہو اور راستے ہی میں زندگی بچانے کی کوشش انجام کو پہنچ جائے۔

دین محمد کچھ دیر کھڑا رہا اور ویران نظروں سے گلی میں دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کان لگا کر آوازیں سننے کی کوشش کی۔ وہ آوازیں جو ساری رات اُسے ڈراتی تھیں اور اس کے بچوں کو رلاتی تھیں۔ نعروں کی آوازیں اور گولیاں چلنے کی آوازیں۔ مگر اس وقت اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ نہ صرف گلی میں بلکہ گلی سے باہر بھی لرزہ خیز سناٹا تھا۔ ایسا گہرا سکوت اور سناٹا جو قبرستانوں اور مرگھٹ میں ہوتا ہے۔..... قبرستان اور مرگھٹ..... تو واقعی سارے شہر میں کوئی زندہ نہیں۔ سارے ذی نفس مر چکے ہیں۔ پورا شہر ایک بڑے قبرستان یا ایک وحشت ناک مرگھٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دین محمد نے سہم کر سوچا۔

پھر اس نے پاؤں اٹھایا اور اپنے بھوکے، ناتواں جسم کو اپنی کمزور ٹانگوں پر گھسیٹنا شروع کیا۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھتا رہا اور وہ کچھ اس طرح چلتا رہا، گویا اُسے مطلق احساس نہ ہو کہ کیا کر رہا ہے۔ اس بات سے بھی بے خبر ہو کہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ چند منٹ میں وہ اس حصے میں پہنچ گیا جہاں گلی بل کھا کر نصف دائرے میں مڑتی ہوئی آگے جا کر سڑک سے مل گئی تھی۔ موڑ پر پہنچتے ہی وہ یکایک زکا، چونکا، پھر افسردگی سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

سامنے اپنے گھر کی چوکھٹ پر داؤد بھائی بیٹھے تھے۔
 ”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ داؤد بھائی نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں یکایک چپ ہو گئے جیسے ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ ہو، یا پھر یہ کہ کہنے کے لئے تو بہت کچھ ہے، دکھانے کے لئے ان گنت زخم بھی ہیں۔ مگر زبان کیسے کھولیں؟ کچھ کہنے کے لئے الفاظ کہاں سے لائیں؟ کہانیاں ایک جیسی ہیں۔ زخم بھی ایک

دوسرے سے مختلف نہیں۔ اور ان سے اٹھنے والی ٹیسوں کی نوعیت بھی ایک جیسی ہے۔ اور باتیں بھی وہی ہیں۔ تباہی اور بربادی کی باتیں، آگ اور خون کی باتیں، مجبوری اور لاچارگی کی باتیں۔ تو پھر اب اور کیا کہیں ایک دوسرے سے۔ بار بار کریدے ہوئے زخم ایک بار پھر کریدیں تو کیا ہوگا ماسوا اس کے کہ مزید ٹیسیں اٹھیں گی اور درد فزوں تر ہوگا۔ چنانچہ دونوں خاموش رہے۔ مگر ایسی حالت میں خاموشی بھی سوہان روح بن جاتی ہے۔ دل میں سویوں کی طرح چبھنے لگتی ہے اور زبان کھولے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ زخم کھرپنے سے درد تو ہوتا ہے لیکن ایک لذت، ایک تسکین بھی ملتی ہے۔ چنانچہ داؤد بھائی نے معاً زبان کھولی۔

”کیسے ہو؟“

دین محمد نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا جیسے کہہ رہا ہو، داؤد بھائی! یہ کیسا سوال کیا تم نے؟ کیا جواب ہو سکتا ہے اس بات کا؟ میں کیسا ہوں؟ تم کیسے ہو؟ ہم سب کا کیا حال ہے؟ تم کو خوب علم ہے۔ ہم سب پر کیا گزری ہے؟ کیا گزر رہی ہے؟ میں، تم، ہم سب بڑے مظلوم، بے چارے، ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں۔ ہمیں کس نے نہیں ٹھکرایا، اپنوں نے، غیروں نے اور پوری دنیا نے۔ اور انہوں نے بھی جن پر ہم نے بھروسہ کیا۔ یہ مٹی، یہ سرزمین بھی جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں اور جس کی خوشبو سے ہمارے وجود، ہماری روحیں آباد ہیں، اس نے بھی لگتا ہے کہ اب شاید آنکھیں پھیر لی ہیں۔ اب کہاں ٹھکانا ہے۔ ہزاروں مارے گئے، بے شمار گھر نذر آتش کئے گئے، بے آسرا لوگوں کو زندہ جلایا گیا، حاملہ عورت کی کوکھ سے بچی نکال کر تلوار کی نوک پر اُچھالی گئی۔ وہ بچی جس نے ابھی اس دنیا میں آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں، پیدا ہونے سے پہلے ہی نفرت، جنون اور درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پھر بھی تم پوچھتے ہو میں کیسا ہوں؟..... اب تم ہی بتاؤ، میں کیا جواب دوں؟

دین محمد نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر بھی داؤد بھائی نے اس کا جواب سن لیا اور شاید انہیں احساس بھی ہو گیا کہ انہیں ایسا سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ اس طرح گریزن جھکالی گویا پشیمان ہو گئے ہوں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دین محمد نے یونہی غالباً کچھ بات کرنے کی نیت سے کہا۔

”بڑا سنا ہے۔“

”ہاں۔“ داؤد بھائی نے گردن اٹھائی۔ ”بڑا سنا ہے۔“

”آج نعروں کی آوازیں بھی ابھی تک سنائی نہیں دیں۔ نہ ہی فائرنگ ہوئی ہے۔ رات

میں بھی بس دو چار فاروں ہی کی آوازیں آئی تھیں اور کچھ نعرے بھی لگے تھے۔ مگر ان کی آواز مدہم تھی۔ شاید دور سے آئی تھی۔“ دین محمد نے مزید اظہار خیال کیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ داؤد بھائی نے کہا۔ ”کل سے کچھ خاموشی ہے مگر یہ خاموشی بھی بالکل ویسی ہی ہے، جیسی طوفان کی آمد سے پہلے ہوتی ہے۔ اب کل کیا ہوگا، کون جانے؟“

”داؤد بھائی! تم باہر گئے تھے؟“ دین محمد نے معا سوال کیا۔

داؤد بھائی کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”بھئی تمہیں تو پتا ہے، پچھلے چند دنوں سے حالات ذرا قابو میں آئے ہیں۔ کرفو میں نرمی ہوئی ہے۔ اور دھیرے دھیرے وقفہ بھی بڑھا ہے۔ میں نے کل پہلی بار ذرا ہمت کی تھی اور اپنے داماد علی کو ساتھ لے کر کچھ دیر کے لئے باہر گیا تھا لیکن کچھ اچھا نہیں لگا۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ ہر طرف وحشت اور نحوست برس رہی تھی۔ ایسا لگتا ہے، جیسے پورے شہر پر آسیب نے سایہ کر لیا ہو۔ ہم دونوں چوراہے تک گئے۔ چند ایک اشیاء خریدیں اور فوراً واپس لوٹ آئے۔ آگے جانے کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔“

”آج تو شام سات بجے تک کرفو ہٹا رہے گا؟“ دین محمد نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں، یہ تو ہے۔“ داؤد بھائی نے ٹھنڈی سانس لے کر ارد گرد نظر ڈالی۔ ”مگر میاں دینو! اس کا فائدہ تو کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے تحفظ کی ضمانت کہاں ہے؟ زیادہ تر دکانیں کھلتی ہی نہیں۔ اور کوئی کھولے بھی تو اس کے پاس ضرورت کی تمام اشیاء نہیں ہوتیں۔ پھر خریداری ندارد۔ لوگوں کے پاس پیسہ نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ باہر جاؤ تو سڑکوں کی ویرانی دیکھ کر ہول آتا ہے۔“

دین محمد کچھ دیر چپ رہا اور بے چارگی سے زمین کو گھورتا رہا، پھر شکستہ لہجے میں بولا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو داؤد بھائی! بڑی بربادی ہوئی۔ سب کچھ اجڑ گیا۔“

”میاں! ہم جیسے عام، غریب اور بے آسرا لوگوں کا حال تو اس پرندے جیسا ہے جو ایک ایک تنکا چن کر دنوں کی محنت کے بعد ایک گھونسلہ بناتا ہے۔ بڑے چاؤ سے، بڑی لگن سے، یہ سوچ کر کہ وہ اس گھونسلے میں سکون، اطمینان اور امن سے رہے گا۔ لیکن جب گھونسلہ بن کر تیار ہوتا ہے تو اچانک آندھی چلتی ہے۔ تیز دتد، غصہ ور، اندھی اور بے رحم آندھی اور گھونسلے کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ ایک ایک تنکا بکھیر دیتی ہے۔ بے چارہ پرندہ کچھ نہیں کر پاتا۔ بس ڈکھ واندوہ سے اور بے کسی سے اپنے گھر کو اجڑتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ ہم جیسے عام اور بے وقعت لوگ دن رات کی جستجو سے ایک چھوٹی سی گڑہستی بناتے ہیں تاکہ یہ جو ایک چھوٹی سی زندگی ہمیں ملی ہے، اسے سکون سے، امن سے جی سکیں۔ لیکن

پھر یوں ہوتا ہے، اور اب تو ایسا اکثر ہوتا ہے کہ نفرت اور دشمنی کی آندھی چلتی ہے اور سب کچھ.....“ وہ معاہدوں پر زبان پھیر کر چپ ہو گئے۔

دین محمد بھی کبھی نظروں سے داؤد بھائی کے عمر رسیدہ، جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر گہری اُداسی تھی، خوف تھا اور پچھتاوا۔ جیسے انہیں اپنے ہونے پر..... اپنے انسان ہونے پر پچھتاوا ہو۔ ہاں، کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے انسان ہونے پر شرمندگی اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، کاش وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ صحرا میں کھلا ہوا پھول ہوتا یا آسمان پر اڑتا پرندہ، کچھ بھی ہوتا، مگر انسان نہ ہوتا۔ پر انسان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ فیصلے کا اختیار اسے تو نہیں۔ فیصلے تو وہ کرتا ہے جو ہر شے کا خالق ہے۔ دین محمد نے سوچا اور سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے آس پاس دیکھا اور قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

”اور تم یہ ہے کہ کوئی ہمارا پرسان حال بھی نہیں۔“

”ارے میاں دینو! کون ہو گا ہمارا پرسان حال۔“ داؤد بھائی تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولے۔ ”ہمارا دکھ درد بانٹنا تو دور کی بات ہے، الٹا ہی لوگ قصور وار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھو، اس شہر میں پچھلے چند دنوں میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ بے شمار بے گناہ بچے، عورتیں، جوان اور بوڑھے کیڑے مکوڑوں کی طرح مارے گئے۔ املاک نذر آتش کی گئیں، درندگی اور خونریزی کے ایسے ایسے کھیل رچائے گئے کہ چشم فلک نے کاہے کو کبھی دیکھے ہوں گے۔ لیکن کسی نے انہیں نہیں روکا۔ پولیس ان کے ساتھ تھی۔ انتظامیہ ان کی طرف دار تھی۔ حکومت انہیں شاباش دے رہی تھی۔ حتیٰ کہ پرائم منسٹر نے بھی برملا کہہ دیا کہ یہ تو ”رد عمل“ ہے.....“ داؤد بھائی لمحہ بھر کے لئے رکے، پھر مزید کہا۔ ”نہیں میاں! ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔ اب تو ایسا ہے کہ شاید ہمیں کسی سے کوئی امید رکھنی ہی نہیں چاہئے۔“

دین محمد چپ رہا اور سہمی ہوئی نظروں سے داؤد بھائی کو دیکھتا رہا۔ داؤد بھائی کی زبان سے نکلنے والے آخری جملے سن کر اس نے اپنے جسم میں دہشت کی تیز لہر کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟..... کیا واقعی اب ہمارے پیروں کے نیچے زمین نہیں ہے؟ کیا واقعی ہم اب ناامیدی کے خلاء میں بھٹک رہے ہیں؟ اور ہماری کوئی منزل نہیں ہے؟ بس یوں ہے کہ بے یقینی، بے سستی کے تاریک خلاء میں بھٹکتے رہیں گے۔ اور آخر کار ایک دن..... دین محمد نے کچی زمین پر انگلی سے سوالیہ نشان بنایا۔ اسے رنجیدہ نظروں سے چند لمحے دیکھتا رہا، پھر بد دلی سے نشان کو منا کر اس نے زور سے سانس لی اور داؤد بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ تلخ سی ہنسی کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

”خیر چھوڑو میاں دینو! ان باتوں کو..... یہ باتیں تو ہم کرتے ہی رہیں گے۔ یہ ردائے زندگی کے پیوند ہیں جنہیں ہم ہمیشہ رفو کرتے رہتے ہیں، پھر بھی یہ کبھی رفو نہیں ہوتے۔ تم سناؤ، گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟“

دین محمد نے پھیکسی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ”خیریت ویریت کیا داؤد بھائی! میں اصل میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔“ وہ جھک کر چپ ہو گیا۔

”کیا کہنا چاہتے تھے؟ کہو۔“ داؤد بھائی نے جلدی سے پوچھا۔

”بچے بھوکے ہیں۔“ دین محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اگر آپ.....“ مگر وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

”بچے بھوکے ہیں؟ کیا گھر میں کچھ نہیں ہے؟“ داؤد بھائی نے حیرت سے سوال کیا۔

”آپ تو جانتے ہیں، ہم جیسے لاکھوں لوگ روز کنواں کھودتے اور روز پیاس بجھاتے ہیں۔ جمع پونجی تو کچھ خاص ہوتی نہیں۔ اب کیا ہے کہ اتنے دن سے گھر میں بند ہیں۔ جو کچھ پلے تھا، خرچ ہو گیا۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی ختم ہوئیں۔ دال، چاول، آٹا، کچھ بھی نہیں۔ کل تو خیر بچوں نے کھالیا تھا۔ لیکن آج صبح سے.....“ اس نے بات پوری نہیں کی اور اُمید بھری نظروں سے داؤد بھائی کو دیکھا۔

”تم رُکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

داؤد بھائی دیوار کا سہارا لے کر اٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ ان کی واپسی کوئی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں تین روٹیاں اور تام چینی کی ایک بدرنگ رکابی میں دال تھی۔ انہوں نے روٹیاں اور رکابی دین محمد کی طرف بڑھائی اور بڑبڑائے۔

”کمال ہے، اتنی دیر سے بیٹھے بک بک کر رہے ہو۔ بتایا ہی نہیں کہ بچے بھوکے ہیں۔ لومیاں! جاؤ جا کر بچوں کو روٹی کھلاؤ۔ تین روٹیاں ہیں۔ کچھ نہ کچھ تسلی تو ہو ہی جائے گی۔“

دین محمد نے ہاتھ بڑھا کر روٹیاں اور رکابی سنبھال لی۔ ممنون نظروں سے داؤد بھائی کو دیکھا اور ہکلا کر بولا۔ ”شکریہ داؤد بھائی! مگر آپ کے گھر میں بھی تو.....“

داؤد بھائی نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ارے میاں! ہم بوڑھے لوگ ایک دو دن بھوکے بھی رہ سکتے ہیں آج تو ہم نے پیٹ بھر لیا ہے، کل کی کل دیکھی جائے گی۔ مگر بچوں کی بات اور ہے۔ وہ تو بھوکے نہیں رہ سکتے نا۔ جاؤ بھئی، جا کر انہیں روٹی کھلاؤ۔“

”آپ کا شکریہ داؤد بھائی!“

دین محمد نے چند ایک قدم گھر کی جانب بڑھائے، پھر رک گیا، گھوم کر داؤد بھائی کا

طرف دیکھا۔ ”داؤد بھائی! کیا خیال ہے آپ کا؟ باہر جانا مناسب ہوگا؟“
 ”کیا تم باہر جانے کے بارے میں سوچ رہے ہو.....؟“ داؤد بھائی نے حیرت سے سوال کیا۔

دین محمد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لئے رکشالے جاؤں۔ بس کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن پر سواریاں ضرور ہوں گی۔ اگر دو چار روپے مل جائیں تو کھانے پینے کی کچھ چیزیں خرید لوں۔ ابھی کر فیو لگنے میں تو کافی وقت ہے۔“
 ”اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ باہر خطرہ ہے یا نہیں، تو میاں دینو! خطرہ تو ہے۔ بے شک فوج آگئی ہے، بلوا بظاہر تھم گیا ہے اور حالات بھی اوپر اوپر پُرسکون ہی نظر آتے ہیں۔ مگر خطرہ بہر حال موجود ہے۔ یہاں وہاں اکاؤکاوار تپیں بدستور ہو رہی ہیں۔ ابھی کل ہی چوراہے کے اس طرف ایک دکان اور مکان میں آگ لگائی گئی اور دو افراد کو چھرا گھونپا گیا۔ مر گئے بے چارے۔ مگر پھر بھی کچھ لوگ باہر جا رہے ہیں۔ جانا پڑتا ہے۔ مجبوری لے جاتی ہے۔ تم بھی اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ مگر ذرا ہوشیار رہنا اور بس کے اڈے پر ہی جانا۔ وہاں فوج کے کچھ جوان موجود رہتے ہیں اس لئے خطرہ ذرا کم ہے۔ مگر.....“
 ”مگر.....؟“ دین محمد نے سوالیہ نظروں سے داؤد بھائی کو دیکھا۔

”کسی دور دراز محلے کی سواری مت لینا۔ اسٹیشن کی سواری مل جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ کھلی سڑکوں پر خطرہ نسبتاً کم ہے۔ اور ہاں، سات بجے تک ضرور واپس لوٹ آنا۔“
 جب دین محمد گھر میں داخل ہوا تو اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ تین روٹیاں کافی ہوتی ہیں۔ تینوں بچوں کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ تو پہنچ ہی جائے گا۔ سیکنہ بھی دو چار لقمے لے لے گی۔ تھوڑی تسلی ہو جائے گی۔ مگر کل کیا ہوگا؟ بھوک..... یہ کبخت، نامراد بھوک تو روز لگتی ہے۔ پیٹ تو روز روٹی مانگتا ہے۔ روٹی..... روٹی..... روٹی..... چنانچہ کل بھی بھوک لگے گی اور بچے روٹی مانگیں گے۔ تب کیا کروں گا میں؟ داؤد بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ بڑے تو دو چار روز بھوکے بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن بچے نہیں رہ سکتے۔ ان کے لئے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”یہ..... یہ روٹی کہاں سے مل گئی؟“ یہ بات سیکنہ نے اس وقت بڑی حیرت سے کہی جب اس نے روٹیاں اور وال کی رکابی اس کے سامنے رکھی۔

”داؤد بھائی نے دی ہیں۔ بہت درد مند آدمی ہیں وہ۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔“

”مگر.....؟“

”بھئی اب اگر مگر کچھ مت کرو۔ بچے بھوکے ہیں۔“ اُس نے بڑی کی طرف دیکھا جو

گر نہ نظروں سے روئیوں کو گھورنے لگی تھی۔ ”تم انہیں روٹی کھلاؤ۔ کچھ تسلی ہو جائے گی۔“ پھر وہ صحن میں آیا۔ پھٹی ہوئی میلی بنیان کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اس کی نظر کھوٹی پر گئی جہاں بھورے رنگ کی ایک بنڈی تنگی ہوئی تھی۔ بنڈی کس کی تھی؟ اُس کو ٹھیک ٹھیک یاد نہیں تھا شاید اس کے کسی دوست کی تھی اور بھول چوک میں اس کے گھر رہ گئی تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بنڈی اتاری اور پہن لی۔ لنگی کی لانگ باندھ لی پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ چار پائی پر سیکنہ کا ایک بوسیدہ دوپٹہ پڑا تھا۔ اس نے دوپٹہ اٹھا کر سر پر پیٹ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر مگر عجلت بھرے انداز میں آگے بڑھا۔

سیکنہ اس دوران اسے حیرت اور قدرے پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے دروازہ چوپٹ کھولا اور رکشا گھسینا تو معاً چونکی اور تقریباً چیخ کر بولی۔

”ارے..... ارے، کیا کر رہے ہو تم؟“

”باہر جا رہا ہوں۔“ اس نے نرم آواز میں جواب دیا۔

”باہر جا رہے ہو.....؟“ سیکنہ جھپٹ کر اٹھی۔ ”ارے کہیں تمہارا سر تو نہیں پھر گیا

ہے؟ باہر اتنی مارا ماری ہو رہی ہے اور تم باہر جا رہے ہو۔“

”جانا پڑے گا۔“ اس نے تحمل مگر قطعیت سے کہا۔ ”آج تو چلو روٹی مل گئی ہے۔ لیکن

کل کیا ہوگا؟ ہم بچوں کو بھوکا تو نہیں مار سکتے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے جاتا ہوں۔ اگر چار

چھ روپے مل گئے تو میں کھانے کا کچھ سامان لیتا آؤں گا۔“

”ہرگز نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ سیکنہ نے غصے سے کہا۔

”میں تمہارے خوف اور ترؤد کو سمجھتا ہوں۔“ دین محمد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ ”باہر خطرہ تو

ہے مگر فوج بھی موجود ہے۔ کرفیو میں سات بجے تک نرمی ہے۔“ وہ رکا، پھر کہا۔ ”تم گھبراؤ

مت۔ میں جلد ہی آ جاؤں گا۔“

”اور اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو.....؟“ سیکنہ کی آواز سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ دین

محمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے؟ اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟..... اگر کچھ

ہونا مقدر ہو چکا ہے تو ہو کر رہے گا۔ وہ گھر میں بیٹھا رہے، پاتال میں جا کر چھپ جائے،

ہونی کے دار سے نہیں بچ سکتا۔ ہونی کے نا دیدہ ہاتھ اسے تلاش کر ہی لیں گے۔ تو پھر

خوفزدہ ہونا اور پیش بندی کرنا بے سود ہے۔ اگر اس کی زندگی میں ابھی کچھ اور شب و روز

لکھے ہیں تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ جان سلامت لے کر واپس آ جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ

اس نے سیکنہ سے نہیں کہا۔ کچھ دیر اسے محبت اور تشکر سے دیکھتا رہا، پھر ملائمت سے بولا۔

”سیکنہ! پریشان نہ ہو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ جلدی ہی واپس آ جاؤں گا۔“

بس یہ دعا کرو کہ مجھے دو ایک اچھی سواریاں مل جائیں۔“
پھر اس نے رکشا باہر نکالا۔
لیکن اُسے پُر تشویش نظروں سے دیکھتی رہی۔



سڑکوں پر دیرانی تھی، وحشت تھی اور خوف تھا۔ بربریت، جنون اور بربادی کے روح فرسا مناظر تھے۔ جلتی ہوئی دکانیں، مکانات، توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کے آثار۔ چند دن کے ہولناک اور وحشیانہ فسادات نے سب کچھ اُجاڑ دیا تھا۔ بسی بسائی بستی کو دیرانے میں بدل دیا تھا۔ حالانکہ یہ بازار کتنا آباد تھا۔ کیسی ہماہمی اور چہل پہل رہتی تھی۔ مگر وہ ساری رونق جو زندگی سے عبارت تھی، اب جلاوطن ہو کر کہیں اور چلی گئی تھی۔ اور اس کی جگہ کفن پوش دیرانی نے لے لی تھی۔

دین محمد سہمی ہوئی نظروں سے اطراف میں دیکھتا ہوا پیڈل پر پاؤں مارتا رہا۔ سڑک کے دونوں جانب فٹ پاتھ پر لوگ آ جا رہے تھے۔ زیادہ تر دکانیں تو بند تھیں مگر یہاں وہاں کچھ دکانیں کھلی بھی تھیں اور ان پر گاہکوں کی مختصر سی بھیڑ بھی نظر آرہی تھی۔ مگر ہر شخص عجلت میں تھا۔ سہا ہوا تھا۔ ہر چہرے پر تشنک اور بے یقینی تھی اور بے اعتباری۔ جیسے ارد گرد کی کسی شے پر بھروسہ نہ ہو۔ جیسے اسے شبہ ہو کہ بس اگلے پل کچھ ہو جائے گا۔ کوئی خنجر اس کی پیٹھ میں اتر جائے گا۔ کوئی گولی اچانک کسی طرف سے آئے گی اور اسے چاٹ جائے گی۔ یا پھر یلکنت ایک ہجوم نمودار ہو گا۔ غیظ و غضب اور جنون میں بھرا ہوا اور راہ چلتے ہر شخص کو موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔

خود دین محمد کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ اس کے پاؤں پیڈل کو چکر دینے میں مصروف تھے۔ مگر نظر خوفزدہ نظر ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ دل میں خدشات اور وسوسے سر اُٹھا رہے تھے۔ اس کی گردن اور کنپٹیوں پر پسینے کی نمی اُبھر آئی تھی۔ دوا ایک بار تو اس کے من میں یہ خواہش اُبھری کہ واپس لوٹ جائے۔ مگر وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ تینوں بچوں اور لیکنہ کے کملائے ہوئے چہرے اس کے تصور میں منعکس تھے اور بار بار کہہ رہے تھے۔ روٹی..... روٹی..... اور اُسے اکسار ہے تھے۔ اور پیڈل مارو..... اور پیڈل مارو..... بس کے اڈے پر پہنچو اور تھوڑی بہت مزدوری کرو۔ ہمارے لئے کھانا۔ اُکر آؤ..... کھانا..... کھانا..... چنانچہ وہ پیڈل مارتا رہا اور رکشا گرد آلود سڑک پر دوڑتا رہا۔

بس کے اڈے پر اس کی توقع کے برعکس خاصا سناٹا تھا۔ محض چند ایک افراد ہی ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف فوج کے کچھ جوان بھی موجود تھے۔ دین محمد

انہیں دیکھتا ہوا رکشا اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں تین رکشے موجود تھے۔ یہ بات بھی دین محمد کی امید کے برخلاف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹینڈ پر کافی رکشے ہوں گے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے، کچھ دیر پہلے کوئی بس آئی ہو اور زیادہ تر رکشے سواریاں لے کر چلے گئے ہوں۔ اس سوچ میں ڈوبا ہوا وہ اسٹینڈ پر پہنچا۔

تینوں رکشا ڈرائیور اس کے واقف تھے۔ ابراہیم، حمید اور ستار میاں۔ اس نے باری باری تینوں کو سلام کیا۔ ابراہیم نے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔

”کیسے ہو؟..... سب خیریت تو ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ اور سب خیریت.....“ پھر وہ سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

حمید اور ستار میاں بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب ہی کے چہروں پر ایک ہی جملہ تھا۔ ’خیریت تو ہے۔‘ مگر اس بات کا جواب دینے کی ضرورت کسی کو بھی نہیں تھی۔ ایک دوسرے کا حال پوچھنے اور خیریت معلوم کرنے کے لئے زبان کو زحمت دینے کی حاجت قطعی نہیں تھی کہ خوفزدہ آنکھیں اور بے روح چہرے خود ہی ساری کہانیاں سنارہے تھے۔ وہ کہانیاں جو گزشتہ کچھ دنوں کی دہشت اور عدم تحفظ کے احساس نے لکھی تھیں۔ چنانچہ کچھ دیر کے لئے سکوت چھا گیا۔ دین محمد نے تھکی تھکی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نظر ایک لالہ جی پر پڑی جو کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور پُر تجسس انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے جسم پر سفید براق کُرتہ تھا اور ویسی ہی دھوئی بھی۔ واسکٹ غالباً سیاہ مخمل کی تھی البتہ گڈڑی کا رنگ بھورا تھا۔ ان کے پاؤں کے قریب ہی ایک چھوٹا سوٹ کیس اور ایک تھیلا رکھا تھا۔ وہ غالباً کسی کے منتظر تھے۔ دین محمد نے لمحہ بھر انہیں دیکھا، پھر حمید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شکستہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

”بہت بربادی ہوئی بھیا!..... سب کچھ لٹ گیا۔“

”ہاں۔“ ابراہیم نے غمگین لہجے میں کہا۔ ”برسوں میں جو کچھ جوڑ جوڑ کر بنایا تھا، سب تباہ ہو گیا۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اب یہ شہر چھوڑ کر چلا ہی جاؤں۔ گاؤں سے کئی بار اب بھی زور دے کر بلا چکے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو بھئی۔ شاید ہم میں سے بہتوں کو جانا ہی پڑے گا۔ یہاں تو اب سوائے دکھ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”صرف دکھ ہی نہیں، موت بھی تو کہو بھئی۔“

”ہاں..... اور موت بھی۔ اب تو یہاں اگلے پل کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔“

چند منٹ کے لئے پھر خاموشی کی چادر پھیل گئی۔ دین محمد نے رکشا آگے بڑھایا اور فٹ

پاتھ کے نزدیک کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ارادہ کیا کہ حمید یا ابراہیم سے ایک بیڑی مانگے۔ بہت دیر سے اس نے بیڑی نہیں پی تھی اور تمباکو نوشی کی خواہش اب شدید تر ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے گردن موڑی اور حمید کی طرف دیکھا۔ تبھی ستار میاں کی اونچی آواز گونجی۔

”اچھا بھئی دینو! اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔“

”اچھا..... پھر ملاقات ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا۔“ دین محمد نے کہا۔

ستار میاں چلے گئے۔ اس نے حمید سے بیڑی لے کر سلگائی اور اپنے رکشے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اُس کی نظر لالہ جی پر پڑی۔ لالہ جی سوٹ کیس اور تھیلا فٹ پاتھ پر ہی چھوڑ کر رکشے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حمید اور ابراہیم کی نظر ان پر پڑی تو غلٹ سے لپکے۔ ابراہیم نے خوشامدانہ مسکراہٹ اور خاصی لجاجت سے کہا۔

”آئیے سیٹھ جی! رکشا چاہئے؟ کہاں چلنا ہے، میں لے چلتا ہوں۔“

لالہ جی معارک گئے۔ خشونت آمیز نظروں سے ابراہیم کے باریش چہرے کو دیکھا، پھر نہایت نخوت اور حقارت سے بولے۔

”دُور ہٹ..... مجھے نہیں چاہئے تیرا رکشا۔“

”مگر سیٹھ جی.....“ ابراہیم ہلکا گیا۔

”میں نے کہا نا، ہٹو۔ دفع ہو جاؤ۔“ لالہ جی نے اُسے پھر جھڑکا۔

ابراہیم مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

لالہ جی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے، پھر گردن گھمائی اور جونہی ان کی نظر دین محمد سے ملی، وہ یلکھت بدل گئے۔ چہرے پر مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔ بشاش انداز میں آگے بڑھ کر دین محمد کے پاس آئے اور خاصی اپنائیت سے مگر مربیانہ لہجے میں بولے۔ ”کہو بھئی، اسٹیشن چلو گے؟“

دین محمد نے بے کسی اور کسی حد تک شرمندگی سے، چور نظروں سے ابراہیم اور حمید کی طرف دیکھا، پھر اُس کی پست آواز بمشکل لالہ جی کے کانوں تک پہنچی۔

”جی چلوں گا۔“

”تو پھر ذرا تھیلا اور سوٹ کیس اٹھا لاؤ۔“ لالہ جی نے انگلی سے اشارہ کیا۔

”جی بہتر ہے۔“ دین محمد نے کہا اور قدم آگے بڑھایا۔

لالہ جی کی آواز پھر گونجی۔ ”تمہارا نام دینو ہے نا..... دینو.....؟“ انہوں نے دینو پر

زور دیا۔

”جی ہاں۔“

لیکن پھر دو قدم چل کر ہی دین محمد معایوں رک گیا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ذہن میں ایک شعلہ سالپکا اور اس کے وجود کو جھلسا گیا۔ پھر معاً ایک سرد لہر رگ و پے میں دوڑی اور اسے سر سے پاؤں تک منجمد کر گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالہ جی کی طرف دیکھا..... کیا بات ہے؟ لالہ جی نے یہ بات کیوں کہی؟ کیا سمجھ رہے ہیں وہ؟ کیا واقعی؟..... نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ہو سکتی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک خود کو دیکھا۔ لنگی، بندھی اور سر پر بندھی ہوئی پگڑی۔ پھر اس کی نظر ابراہیم اور حمید کی طرف گئی۔ گرتے، پا جامہ اور سر پر ٹوپی۔ ہاں..... یہی بات ہے..... بلاشبہ یہی بات ہے۔ اُس نے ایک بار پھر لالہ جی کی طرف دیکھا اور اس کا پورا جسم کانپا۔ بے بسی..... لاچارگی..... بے بضاعتی..... کیا کروں میں؟..... کیا کروں میں؟ بچے بھوکے ہیں۔ سیکڑے بھوکے ہیں۔ کل روٹی کہاں سے آئے گی؟..... اوہ میرے خدا!..... اُس نے حد درجہ بے کسی سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایک پل سوچا، پھر یکا یک مڑ کر لالہ جی کے پاس آیا۔

”لالہ جی! رکشا خالی نہیں ہے۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔
 ”ارے کیا ہوا؟..... کیا بیکار باتیں کر رہے ہو؟ ابھی تو تم.....“ لالہ جی نے کہنے کی کوشش کی۔

وہ بات کاٹ کر سختی سے بولا۔
 ”میں نے کہا نا، رکشا خالی نہیں ہے۔“
 لالہ جی چند لمحے اُسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے فٹ پاتھ کی طرف، جہاں ان کا سوٹ کیس رکھا تھا، بڑھ گئے۔
 دین محمد انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔



انمول

یہ جو بے حد مکینہ آدمی سامنے بیٹھا مجھ پر ہنس رہا ہے، جانتے ہیں آپ، یہ کون ہے؟ نہیں جانتے ہیں نا؟ ابتدا میں، میں بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن پھر اچانک مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ کوئی اور نہیں، دراصل میں خود ہی ہوں۔ میں، یعنی میرا وہ وجود جو میرے اندر رہتا ہے۔ اور جس دن سے میں نے اسے جانا ہے، اس دن سے یہ میرا پیری بن گیا ہے اور میرا جینا حرام کئے ہوئے ہے۔

اکثر یوں ہوتا ہے کہ ذرا سی تنہائی ہو یا میں کسی ذہنی ”گھپلے“ کا شکار ہوں تو ایسے مواقع پر یہ اچک کر باہر آ جاتا ہے اور میرا مذاق اڑانا شروع کر دیتا ہے۔ بندروں کی طرح دانت نکال کر مجھ پر ہنستا ہے اور اپنی باتوں سے جو زہر میں بچھے تیردوں سے زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہیں، میرے ذہن کے پر نچے اڑانا شروع کر دیتا ہے۔ عجیب و غریب سوالات کرتا ہے۔ ایسی بے سرو پیر کی داہیات باتیں، جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی میں بحث پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ اس کے ہر سوال کا، اپنی سمجھ کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے ہر اعتراض کو رد کرتا ہوں لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ شخص، یہ منحوس، مردود شخص ایسے تابڑ توڑ حملے کرتا ہے کہ میں چاروں شانے چت ہو جاتا ہوں۔

میں اس شخص سے بالکل عاجز آ گیا ہوں۔ کئی بار چاہا کہ اسے قتل کر کے کسی ایسے دشوار گزار اور دور دراز ویرانے میں دفن کر دوں جہاں سے پھر اس کی واپسی ممکن نہ ہو سکے۔ مگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکا۔ یہ کم بخت شیطان کی طرح چالاک اور لومڑی کی طرح مکار ہے۔ اپنا دفاع کرنا خوب جانتا ہے۔ میری ہر چال کو ناکام بنانے کے ہنر سے واقف ہے۔ نتیجہ یہ کہ میں آج تک اسے قتل نہ کر سکا۔ ہر بار منہ کی کھانی پڑی۔ ایسے موقع پر جب میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہوتا ہوں، یہ مجھ پر ہنستا ہے، قہقہہ لگاتا ہے اور بے حد زہریلے لہجے میں کہتا ہے۔

”تم مجھ سے بھاگنا چاہتے ہو۔ ہے نا؟ لیکن بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ میں تو تمہارے

اندر ہی موجود ہوں اور اس وقت تک تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گا جب تک تم زندہ ہو۔“
 ”چپ ہے، کیمنے! سورا!“ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہوتا۔
 ”ہاں، اگر تم مر جاؤ تو نجات.....“

”اے چپ مردود!“ میں بات کاٹ کر غراتا ہوں۔

میں جب کوئی کام کرنے چلتا ہوں، یہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اونچ نیچ، نیکی اور بدی کے حوالے دیتا ہے۔ ساتھ ہی دھمکیاں بھی۔ لیکن میں پرواہ نہیں کرتا۔ سنی ان سنی کر دیتا ہوں۔ کیونکہ جانتا ہوں اگر اس کی باتوں کی پرواہ کروں گا تو بھوکا مر جاؤں یا ساری زندگی جیل میں گزاریں پڑے۔ جی ہاں..... یہ دنیا ایسی ہی جگہ ہے۔ یہاں نفرت ہے، کیمنگی ہے۔ تعصب اور تفریق ہے..... انسانوں کا ظلم انسانوں کے ساتھ۔ پھر غریبی ہے اور بیکاری اور بھوک..... گویا جنگل کا قانون لگا ہوا ہے۔ ہر بڑا جانور چھوٹے جانور کو کھا رہا ہے، اس کا خون پی رہا ہے اور پھر اس کی لاش پر رقص کر رہا ہے۔ جشن منا رہا ہے اور ذرا بھی شرمندہ نہیں ہے۔ میں نے یہ ساری باتیں اس کم بخت کو بتائیں، ایک نہیں، ان گنت مثالیں اور دلیلیں دیں لیکن یہ نہیں مانتا۔ بحث شروع کر دیتا ہے۔ نیکی، شرافت، آدمیت کا احترام اور ضمیر کی آسودگی۔ نہ جانے کہاں کہاں کی ہانکتا ہے۔ ایسی باتیں جو میرے پلے نہیں پڑتیں۔ بھلا کہیں ضمیر کی آسودگی سے پیٹ بھرتا ہے؟ اگر بھر سکتا ہے تو اس وقت کیوں نہیں بھرا جب..... مگر یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ بھوک تو سبھی کو لگتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو بھوک کا عذاب ہر روز سہتے ہیں۔ بھوک کی گود میں پیدا ہوتے ہیں اور بھوک ہی کی آغوش میں مر جاتے ہیں۔ ضمیر نے کس کس کا دوزخ ٹھنڈا کیا ہے۔

لیکن شاید یہ آدمی جو میرے اندر رہتا ہے، بھوک کے معنی نہیں سمجھتا۔ ممکن ہے، سمجھتا ہو مگر اہمیت نہیں دیتا۔ بس اس کا کام تو یہ ہے کہ میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اس وقت سے میرے ناک میں دم کر رکھا ہے جب سے مجھ میں سمجھ بوجھ پیدا ہوئی ہے۔ اگر شروع میں، میں نے دو چار چوریاں کیں یا کبھی کبھار جو اکھیل لیا..... تھوڑی سی شراب پی لی تو اس میں کیا بری بات ہے؟ دو چار عورتوں سے عشق کرنے اور کبھی کبھار اس بازار کا چکر لگا لینے میں آخر کیا برائی ہے؟ کتنے ہی لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ کچھ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں، کچھ چوری چھپے اور رات کے اندھیرے میں تاکہ اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رکھ سکیں۔ اس حمام میں بے شمار لوگ ننگے ہیں۔ میں اکیلا تو نہیں۔

ویسے یہ ضمیر کا معاملہ جو ہے، یہ کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ یہ کم بخت میرا ضمیر

ہی میرے پیچھے کیوں پڑا رہتا ہے؟ اس دنیا میں اور بھی تو ہیں۔ مثلاً وہ جو امریکہ کا صدر ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... ہاں یاد آیا، بش۔ اور پھر اس کا یار غار بلیر۔ اور وہ جو روس کا صدر ہے۔ اور پھر دوسرے بھی ہیں۔ ان سب کے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اور پھر وہ بھی ہیں جو مذہب کے نام پر نفرت اور تعصب کو ہوا دیتے اور جنگ کراتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مذہب کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو کمزوروں اور مجبوروں کا حق مارتے ہیں۔ زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار اور سیاست داں۔ لیکن ان کا ضمیر انہیں کچھ نہیں کہتا۔ کیا ان سب لوگوں نے ضمیر کو، اپنے اندر کے آدمی کو مار کر کہیں دفن کر دیا ہے؟ اگر ہاں، تو کیسے یہ کام کیا ہے انہوں نے؟ میں تو آج تک نہیں کر سکا۔

مگر جوئے اور چوری چکاری کا معاملہ چند سال پہلے کا ہے۔ شروع شروع میں، میں نے سوچا تھا، یہ سورا بھی نیا ہے۔ کچھ دن میں سب کچھ سیکھ لے گا۔ سمجھ جائے گا تو اسے عقل آجائے گی اور اس کی زبان خود بخود بند ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ مردود میری ہی طرح ضدی ہے۔ نہ خاموش ہوتا ہے، نہ مرتا ہے۔ کم بخت کچھ عرصے کے لئے سو ہی جائے تو مجھے کچھ اطمینان نصیب ہو۔

اب اس وقت یہ ناہنجار اس لئے مجھ پر ہنس رہا ہے کیونکہ میں پچھلے تین چار دن سے پریشان ہوں۔ سوچتا رہا ہوں، ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرتا رہا ہوں لیکن کسی طرح اس پریشانی کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ساری تگ و دو بیکار گئی۔ اس تمام عرصے میں یہ آدمی مسلسل میرے ساتھ رہا ہے۔ اپنی اونڈھی سیدھی باتوں سے میرا دماغ چاٹتا رہا ہے..... کس چکر میں پڑے ہو؟ چھوڑ دو بھی، تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اک ذرا سے چوہدری کے لئے اتنا جھنجٹ اٹھا رہے ہو۔ اگر کوئی ”نگ“ نہیں ملتا تو گولی مارو۔ لعنت بھیجو چوہدری پر، کاہے اپنی ٹانگیں توڑ رہے ہو مفت میں.....!

”اے چپ.....“ میں غرایا۔ ”کینے! تو جانتا ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ چوہدری میرا پرانا کرم فرما ہے۔“

دراصل ان دنوں ستارے ہی کچھ گردش میں تھے! بہت تگ و دو کی، پھر بھی کام نہیں بنا۔ ادھر بہار کالونی میں لٹن کے پاس گیا، ناظم آباد اور منگھویر روڈ پر نھو کے پاس بھی کئی چکر لگائے۔ ایک بار جٹ لائن میں گامے پہلوان کی خوشامدیں بھی کیں لیکن ان سب نے کہ میرے یار ہیں، معذوری کا اظہار کیا اور میری ساری دوڑ دھوپ کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں نکالا جس سے میری پریشانی اور بڑھ گئی۔

لیکن چوہدری کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ میرا پرانا مہربان اور بہت اچھا ”کسٹمر“ ہے۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ میں جو دو چار دھندے آج کل کرتا ہوں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ میں ”بزئس“ کرنے والی عورتوں کا ”ایجنٹ“ بھی ہوں۔ لالو کھیت اور آس پاس کے دو چار محلوں میں کوئی دس بارہ عورتیں ہیں جو اپنی مرضی سے دھندا کرتی ہیں اور میرا ان سے تعلق صرف اتنا ہے کہ میں ان کے لئے ”شوقین“ تلاش کرتا ہوں۔ یہ ایک طرح سے ”سائیڈ بزئس“ ہے۔ میں ہر روز شام کو چار پانچ بجے گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ صدر میں اور بندر روڈ پر جو بلی سینما کے آس پاس گھومتا رہتا ہوں اور ان لوگوں کو تلاش کر لیتا ہوں جو خود میری یا مجھ جیسے لوگوں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

کوئی چھ مہینے ادھر کی بات ہے، جب چوہدری مجھے خیبر ہوٹل کی بچھلی گلی میں ملا تھا۔ پہلے ”معالے“ میں اس نے مجھے پچاس روپے علیحدہ سے دیئے تھے۔ اور اگلی صبح بہت خوش اور مطمئن ہو کر کہا تھا۔

”عبدل!..... میں تو ابھی شوقین ہوں۔ اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ میرے لئے کیا کرتے ہو۔ اتنا یاد رکھنا کہ مجھے پیسے کے معاملے میں ہمیشہ کھرا پاؤ گے۔“

”یہ آج والا معاملہ کیسا رہا چوہدری صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”اچھا ہی رہا۔ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ ذرا کوئی لڑکی وڑکی ہو تو۔ اب تم تو سمجھتے ہی ہو، میرا کیا مطلب ہے۔“

”ہاں سمجھتا ہوں چوہدری صاحب!..... اطمینان رکھئے۔ میں آپ کو واپس نہیں ہونے دوں گا۔“

چوہدری نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی وہ ثابت ہوا۔ پیسے کا کھرا اور دل کا غنی۔ جب بھی وہ میرے پاس آیا اور میں نے کوئی نئی چیز پیش کی، تب ہی اس نے پچاس ساٹھ روپے سے کم انعام نہ دیا۔ کمیشن جو ملتا، وہ الگ۔ میری جیب میں ہر وقت روپیہ رہنے لگا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ چوہدری جیسے دو چار شوقین اور مل جائیں تو سمجھو کہ دارے نیارے ہو جائیں۔ سال دو برس بعد یہ دھندا کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

لیکن ایک مہینے ہی میں چوہدری کا دل ادب گیا۔ پھر بھی اس نے کسی نئی چیز کے لئے کبھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھار یونہی سرسری طور پر ذرا ”ذائقہ“ بدلنے کے لئے کہا تو میں لکڑیاں گامے کے پاس سے کسی کو پکڑ لایا اور چوہدری کی خوش پوری کر دی۔

مگر یہ چکر آخر کب تک چلتا۔ آخر چوہدری اکتا ہی گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر نائب ہو گیا۔ میں دو تین ہفتے تک اُسے تلاش کرتا رہا اور آخر کار جب وہ ملا تو مجھے اس

الہجن میں پھنسا گیا، جواب میرے لئے درد سرنی ہوئی ہے۔ اس شام وہ حسب معمول صدر میں ملا تھا۔ میں نے ذرا فدیہ انداز میں سلام کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا اور کیوں؟ تو وہ بولا۔

”بھئی عبدل! برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟“

”کہئے۔“

”دیکھو تمہارے پاس جتنی بھی چیزیں ہیں، سب میرے لئے پرانی ہو گئیں۔ بس اسی بناء پر میں تم سے نہیں ملا۔“ وہ رکا، پھر بولا۔ ”اب تو کوئی نئی چیز ہونی چاہئے۔“

”نئی چیز.....؟“

”ہاں، کوئی لونڈیا ہو۔ ذرا نو جوان، کم عمری۔“ وہ بازاری انداز میں آنکھ مار کر ہنسا۔

”لونڈیا.....؟“ میرے حلق میں تھوک اٹک گیا۔

”ہاں یار!..... اچھی سی، ذرا دلربا سی۔ اور بالکل نئی ہو تو کیا بات ہے۔ تین سو روپے تمہیں الگ سے دوں گا۔ لڑکی کے پیسے الگ۔ اب تک جتنی عورتوں سے ملوایا ہے، ان میں کوئی بھی پچیس سے نیچے نہیں تھی۔ کوئی سولہ سترہ سال کی ہو تو..... پورے تین سو دوں گا۔“

”تین سو.....؟“

”ہاں، اور لڑکی کی فیس الگ۔ جتنے وہ مانگے گی۔ ہزار، بارہ سو..... تو پھر بولو، کب

تیک؟“

میں نے جواب دینے میں تھوڑا تاثر کیا، پھر یہ سوچ کر کہ کہیں نہ کہیں سے کوئی لونڈیا تلاش کر ہی لوں گا، اقرار کر لیا۔ لیکن ہے، گاما پہلوان ہے، ادھر تھو اور سلیمان ہیں۔ کسی کے پاس تو ایسی لڑکی ہوگی ہی۔ لے آؤں گا۔ چوہدری جیسے آدمی کو ناراض کرنا اچھا نہیں۔ موٹی اسامی ہے۔ ایسا شاہ خرچ کہاں ملتا ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکل گیا تو سمجھو کئی سو روپے ماہوار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ لہذا کچھ نہ کچھ کروں گا اور ضرور کروں گا۔ بات پورے تین سو روپے کی ہے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے وعدہ کر لیا۔

مگر تین چار دن کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی جب کامیابی نہ ہوئی تو میری نظر انتخاب رہبری پر ٹھہر گئی۔

رہبری اگرچہ خوبصورت نہیں ہے۔ سانواا سا نگ ہے۔ کھڑا ناک نقشہ، درمیانہ قد، پھولوں کی طرح ہلکی پھلکی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور بال بہت خوبصورت ہیں۔ بڑی بڑی کجبراری آنکھوں میں ایسا نشہ ہے کہ آدمی ڈوب ڈوب جائے۔ بال اتنے سیاہ اور دراز کہ

پنڈلیوں کو چومتے ہیں۔ اگر کھول کر بکھرا دے تو لگے گھٹا چھا گئی ہے۔ ذہلی اور دھان پان سی ہونے کے باعث بیس اکیس سال کی رہبری مشکل سے سولہ سترہ کی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چوہدری اسے دیکھتے ہی خوش ہو جائے گا۔ چوہدری جیسے لوگ رہبری جیسی لڑکی کو ضرور پسند کرتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

سہ پہر کو جب میں نے اس سے رات میں آنے کے لئے کہا تو وہ بولی۔ ”مگر میں تو آج میلاد شریف میں جا رہی ہوں۔“

”مت جاؤ۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔“

”مگر.....؟“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہارے ابا کی رات کی ڈیوٹی ہے۔ اپنی اماں کو میلاد شریف میں جانے دو۔ اور تم میرے پاس آ جانا۔“

رہبری کچھ دیر سوچتی رہی اور مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ جیسے کسی کشکش میں ہو۔ جیسے کوئی بات طے کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”اچھی بات ہے۔“ آخر کار اس نے کہا۔ ”میں خود بھی تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ رات میں آ جاؤں گی۔“



اب اس سے رات کے دس بج چکے ہیں۔ میں کوارٹر کے صحن میں بیٹھا ہوا چوہدری کا انتظار کر رہا ہوں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں وہ آتا ہوگا۔ رہبری میرے پاس کوئی ساڑھے آٹھ بجے آ گئی تھی۔ اس وقت وہ کمرے میں چار پائی پر پڑی پتا نہیں کیا کر رہی ہے۔ کبھی وہ دھیمے سُر وں میں گانے لگتی ہے، کبھی مجھے آواز دیتی ہے۔ اور میں ابھی آتا ہوں کہہ کر ٹال جاتا ہوں۔ لیکن یہ سور کا بچہ، ذلیل تب ہی سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ میں کئی بار سمجھا چکا ہوں، ڈانٹ ڈپٹ کر چکا ہوں لیکن اس پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ میری ہی طرح بے غیرت اور ڈھیٹ ہے۔ اب وہ اچک کر سامنے والی شکستہ میز پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا ہے اور اپنے بڑے بڑے نکو سے چلا جاتا ہے۔

دفعۃً اس نے کہا۔

”فرض کرو کہ رہبری چوہدری کو پہچان گئی اور اس نے شور مچا دیا تو؟“

”یہ ناممکن ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”میں پورے دو پیگ دسکی کے اسے پلا چکا

ہوں۔ اس طرح کہ اس کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہوا۔ چوہدری کے آنے تک ایک دو پیگ اور پلا دوں گا۔ اسے اپنا ہوش ہی نہ رہے گا تو چوہدری کو پہچان جانے کے باوجود

کچھ نہ کہہ سکے گی۔ بلکہ شاید اسے افسوس بھی ہو کہ آج جیسے سرور سے وہ اب تک کیوں محروم رہی۔“

”سوچ لو.....“

”میں نے خوب سوچ لیا ہے۔“

دراصل سارا منصوبہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر اور بہت احتیاط سے بنایا تھا۔ رہبری کو اصل معاملے کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ تو یہی سمجھ رہی ہے کہ میرے پاس آئی ہے اور رات میرے پاس ہی رہے گی۔ لیکن میں نے پروگرام کے مطابق نہایت چالاکی سے دھسکی گئے یکے بعد دیگرے دو پیگ شربت میں ملا کر اسے پلا دیئے۔ رہبری کو ذائقہ مختلف محسوس ہوا تھا اور اس نے کچھ منہ بھی بنایا تھا۔ مگر اسے بہر حال کوئی شک نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر میں اچھا خاصا نشہ ہو گیا تو وہ ادھر ادھر کی ہانکنے لگی۔ اور میں بھی چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں نہ رہے۔ چوہدری آئے گا تو میں اسے بھی ساری بات سمجھا دوں گا اور کہہ دوں گا کہ رات میں وہ بھی دو ایک پیگ پلا دے۔ اسے اندر بھیجنے سے پہلے اندھیرا کر دوں گا تاکہ کچھ دیر تک رہبری اس غلط فہمی میں رہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور نہیں، میں ہوں..... اس کے بعد اگر وہ چوہدری کو پہچان بھی گئی تو کچھ نہ کہے گی۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ”تو تم کو ذرا بھی افسوس نہیں ہے؟“

”کا ہے کا افسوس.....؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

”رہبری..... وہ بے چاری شریف اور معصوم لڑکی ہے۔ جب اس پر اس فریب اور تمہاری کمینگی کا حال کھلے گا تو اسے کتنا رنج ہوگا۔“

”شریف ہے وہ تو پھر چار چھ مرتبہ میرے ساتھ وقت کیوں گزار چکی ہے؟ کیا اسی کا نام شرافت ہے؟“

”تم ہی نے اسے بہکایا تھا۔ ورنہ وہ تو نہ آنا چاہتی تھی۔“

”ابے چپ..... اُنکو کا پٹھا۔“

”تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کم از کم تم نے اس سے یہی کہا تھا۔ اور وہ بے چاری غریب والدین کی مجبور لڑکی تمہاری سہری باتوں کے جال میں پھنس کر یہاں آتی رہی ہے۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں تم اس سے شادی کرنے سے انکار نہ کر دو، وہ اپنا آپ

تمہارے حوالے کرتی رہی ہے۔ ورنہ اس کی شرافت میں کیا شبہ ہے۔ کیسے تو تم ہو۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا تو اس دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔“

”مگر سوچ لو..... تم نے اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

”تو پھر.....؟“

”پھر یہ کہ کیا تم اس سے چوہدری کی آمد کے بعد بھی شادی کر سکو گے؟“

میں نے یکایک اپنے آپ کو ٹٹولا۔ ہاں، کیا واقعی میں اس سے شادی کروں گا؟ کیا واقعی میں اس سے محبت کرتا ہوں؟ محبت..... ہا ہا ہا..... اب میری باری تھی کہ اس پر ہنوں، اس کا مذاق اڑاؤں۔ چنانچہ میں نے کئی قبضے لگائے..... اے اُلو، بے وقوف! جیسی محبت میں نے کی، ایسی محبت ہر گلی میں، ہر محلے میں نہ جانے کتنی عورتیں، نہ جانے کتنے مرد کرتے ہیں۔ لیکن یہ محبت نہیں ہوتی، بلکہ اسے ضرورت کہتے ہیں۔ محبت کا نام تو محض خود کو دھوکا دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بیس اکیس سال کی یہ چھوکری اتنی نادان تو نہ تھی کہ محض میرے وعدوں پر چلی آتی۔ دراصل وہ خود بھی ضرورت مند تھی۔ گویا ہم دونوں نے ایک دوسرے کی ضرورت پوری کی۔ بھلا کہیں محبت ایسی ہوتی ہے؟“

”تم محض خود کو دھوکا دے رہے ہو..... الفاظ کا چکر.....“ اس نے تنخی سے کہا۔

”بکو مت..... ارسطو کی اولاد۔“ میں نے زور سے ڈانٹا۔

دراصل جس محلے میں، میں رہتا ہوں یہ عام لوگوں کا، غریبوں کا محلہ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے کی کہادت پر پورے اُترتے ہیں۔ زندگی یہاں زندگی نہیں ایک ڈھکوسلا ہے۔ خود کو دھوکا دینے کی ایک ایسی کوشش کہ ان گلیوں میں رہنے والے ساری عمر یہ دھوکا خود کو دیتے رہتے ہیں اور انہیں کبھی احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ زندگی پر بوجھ ہیں یا زندگی ان کے لئے ایک بوجھ ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ بوجھ اس وقت تک اٹھایا جاتا ہے جب تک بوجھ اٹھانے کی سکت رہتی ہے۔ اس کے بعد بوجھ اٹھانے والا تو نہیں رہتا لیکن بوجھ باقی رہتا ہے جو دوسرے کندھوں پر منتقل ہو جاتا ہے۔ یہاں لوگ باگ مجھے اچھا خاصا شریف آدمی سمجھتے ہیں۔ انہیں میرے اصل دھندے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ میں کھارادر میں اپنے ایک دوست کی شراکت میں سائیکل کی ایک دکان چلاتا ہوں۔ رہبری بھی اس گلی میں میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر رہتی ہے۔ اس کے والدین بے حد غریب ہیں۔ اور شاید یہ غریبی ہی ہے کہ اتنی عمر ہو جانے کے باوجود اس کی شادی کی کوئی صورت نہیں بن پائی تھی۔ میری معلومات کے مطابق چند ایک بارر شتے آئے تھے، مگر لڑکے والے ایک بار آنے کے بعد پھر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے۔ کیونکہ انہیں قیاس کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ جہیز کے نام پر سونے کا ایک چھلّا بھی مشکل ہی سے ملے گا۔

جب میں نے پہلے پہل رہبری کی طرف توجہ دی تو میرا خیال تھا کہ یہ تو راستے میں پڑا ہوا ایک سکہ ہے جسے میں اٹھا کر استعمال کر سکتا ہوں۔ ویسے اس کم بخت کی بات بھی غلط نہیں۔ میں نے واقعی رہبری سے محبت کا دعویٰ اور پھر شادی کا وعدہ کیا تھا۔ کرنا پڑتا ہے بھی۔ سکہ اٹھانے کے لئے تھوڑی سی ہوشیاری تو کرنی پڑتی ہے۔ سو میں نے بھی کی۔

مگر ایسا نہیں تھا کہ رہبری نے کوئی پس و پیش نہیں کیا تھا۔ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت روٹی تھی۔ میرے آگے ہاتھ جوڑے تھے لیکن آخر کار مجبور ہو گئی تھی، کہیں میں غصے میں شادی ہی سے انکار نہ کر دوں۔ جبکہ مفلسی اور احساس کمتری نے اُسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر شادی کر کے اپنا گھر آباد کرنا چاہتی تھی۔

لیکن میں نے تو اس سے محبت نہیں کی تھی، نہ اب کرتا ہوں۔ بھلا کہیں ایسی لڑکی سے محبت کی جاتی ہے؟ ایک سانولی سی، عام سی لڑکی۔ اس میں ہے ہی کیا کہ میں اس کے لئے اپنی زندگی کی وہ تمام خوشیاں جو مجھے آنے والے دنوں میں مل سکتی ہیں، ختم کر لوں۔ اتنا احسن نہیں ہوں میں۔ رہ گیا میرا وعدہ تو ایسے وعدے نہ جانے کتنے مرد نہ جانے کتنی عورتوں سے کرتے ہیں۔ تو کیا سب ہی سچ سچ شادی بھی کر لیتے ہیں؟

یہ ایک میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ چوہدری کو بس اب چند منٹ میں آ جانا چاہئے۔ میں ایک سگریٹ جلا کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ وہ کم بخت وہیں بیٹھا رہا۔

رہبری اچھے خاصے گھر سے سرور میں تھی اور یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر تھی کہ اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے؟ مستی اس کی آنکھوں میں ٹوٹ کر اُٹھ آئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور مدہم سُروں میں گنگنا رہی تھی۔ ”مورا بالم بے دردی“..... میں نے سوچا، بس ایک پیگ اور۔ اس کے بعد اس کے لئے چوہدری میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ چنانچہ شربت میں ایک پیگ ملایا اور اس پر جھک گیا۔ وہ ذرا اٹھلا کر اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کر بولی۔

”میں کب تک یہاں اکیلی لیٹی رہوں گی؟“

”بس تھوڑی دیر اور۔ پھر میں آتا ہوں۔ لو، یہ پی جاؤ۔ شاباش.....“

جب وہ گلاس خالی کر چکی تو کہنے لگی۔ ”میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ مگر تم کب تک مجھے یونہی ٹالتے رہو گے؟ میرے بابا سے شادی کے لئے کیوں نہیں کہتے؟“

”کہوں گا۔“ میں نے خوش مزاجی سے کہا۔ ”بس کچھ دن ٹھہر جاؤ، پھر میں تم سے شادی کروں گا۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تمہیں؟“

”بھروسہ تو ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی۔

”تو پھر اطمینان رکھو۔ اور ہاں، تم کیا بات بتانا چاہتی ہو؟“

یہ کہہ کر میں اس پر جھک گیا۔

اور تب ہی باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ مخصوص قسم کی دستک تھی۔ اس لئے میں فوراً سمجھ گیا کہ چوہدری کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں رہبری کو چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر رہبری کو دیکھا، پھر باہر نکلا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ میں دوڑ کر چوہدری کے استقبال کے لئے نہیں گیا۔ بلکہ جب صحن میں آیا تو قدم سست تھے اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کم بخت ابھی تک وہیں بیٹھا تھا اور غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری سست چال کو دیکھ کر وہ یکایک قہقہہ مار کر ہنسا۔

”کیا بات ہے مسٹر! اپنے قدموں کو سنبھالو۔ یہ کانپ رہے ہیں۔ کہیں گر نہ پڑنا۔“

اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”چپ بے..... سائلے، ذلیل، کمینے۔“ میں نے کتوں کی طرح دانت نکال کر کہا۔

دروازے پر چوہدری کھڑا تھا۔ میں اس کے سامنے رک گیا اور یوں اسے دیکھنے لگا جیسے وہ میرے لئے اجنبی ہو۔ وہ مسکرا کر بولا۔

”کہو عبدل! کام بن گیا؟“

”ہاں بن گیا۔“ اپنی آواز خود مجھے اجنبی معلوم ہوئی۔

”کہاں ہے.....؟“

”اندر کمرے میں۔“

”کیسی ہے.....؟“ چوہدری نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”بہت خوبصورت ہے۔ بالکل نوجوان لونڈیا۔ ایسی لڑکی اب تک تمہاری زندگی میں نہ آئی ہوگی چوہدری!“ میں نے رک کر زور سے سانس لی۔ ”اور کافی نشتے میں ہے۔ ذرا بھی گڑبڑ نہیں کرے گی۔“

”تو پھر میں چلوں اندر؟“

میں چپ رہا۔

چوہدری نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر دس دس کے کئی نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اور میں نے نوٹ اس طرح تھام لئے جیسے میں کوئی بے جان پتلا ہوں۔ اتنے میں، میں خود اپنے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہنسنے لگا..... اتنی بڑی رقم..... نوٹ ہی نوٹ..... نئے، چمکتے ہوئے..... سجدے میں گر پڑو عبدل! یہ تو تمہارا خدا ہے۔ خدا.....

اس کے لئے تم کہا کچھ نہیں کرتے ہو۔ ہے نا.....

چوہدری باقی نوٹ اپنی جیب میں رکھ کر بولا۔

”لڑکی کے پیسے میں اسی کو دے دوں گا۔ کتنے دینا ہوں گے؟ ایک ہزار ٹھیک رہیں گے نا؟ ویسے چاہو تو تم لے لو۔ اور ہاں، تم کہاں رہو گے؟“

میں کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ چوہدری کا راستہ روکے ہوئے، اپنے خدا کو ہاتھ میں لئے ہوئے..... پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے زور سے سارے نوٹ چوہدری کی جیب میں ٹھونس دیئے اور غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

”نہیں..... نہیں..... چوہدری! تم اس لڑکی سے نہیں مل سکتے۔ تم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ وہ ایک شریف اور باحیا لڑکی ہے۔ وہ راستے میں پڑا ہوا سکہ نہیں، ایک نایاب موتی ہے۔ اور انمول ہے۔ یہ اپنے پیسے لو اور چلے جاؤ یہاں سے۔“

”عبدل.....“

”کچھ نہیں..... میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور پھر کبھی میرے پاس نہ آنا۔“

چوہدری نے کچھ اور کہنا چاہا، لیکن میں نے یکایک پلٹ کر پُر شور آواز سے دروازہ بند کر دیا اور دوڑتا ہوا رہبری کے پاس چلا گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے یکایک رہبری کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

میں تم سے شادی کروں گا رہبری..... میں تم سے شادی کروں گا۔ اور بہت جلد.....! نہ جانے کیوں باوجود خواہش کے میں چوہدری کو یہ نہیں بتا سکا تھا کہ رہبری میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔



کل، آج اور.....

صدیقی نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ ”اصل میں بات نکتہ نظر کی ہے۔“
 ”ہاں۔“ فاروقی نے چسکی لی اور اتفاق میں سر ہلایا۔ ”منفی اور مثبت دو پہلو ہوتے ہیں۔ اگر نصف گلاس میں پانی ہو تو دیکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ آدھا گلاس خالی دیکھتا ہے یا نصف گلاس بھرا ہوا۔“

”اور بد قسمتی سے ہم آدھا گلاس خالی ہی دیکھتے ہیں۔“ اعجاز احمد نے اظہار خیال کیا۔
 ”مگر کیوں؟..... یہ رجحان ہمارے اندر کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟“ نور علی نے حسب عادت حجتی انداز میں گفتگو میں شرکت کی۔ ”اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہم منفی انداز فکر رکھتے ہیں تو اس کے اسباب داخلی ہیں یا خارجی؟.....“

”دونوں ہی باتیں ہیں۔“ فاروقی نے پھر سڑپ کی مدھم سی آواز کے ساتھ چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”اختلاف کی گنجائش رکھتے ہوئے میں یہ کہوں کہ ہم اجتماعی احساس کمتری کا شکار ہیں اور یہ کیفیت خارجی اسباب کے ساتھ ساتھ کچھ داخلی عوامل کا نتیجہ بھی ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں ہمارے یہاں جو کچھ ہوا، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ دور ٹیکنالوجی اور سماجی شعور سے عبارت ہے لیکن ہم نے ایک قدم بھی پیش رفت نہیں کی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس افسوس ناک حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ.....“

”بھئی فاروقی صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ عثمان صاحب نے اپنے مخصوص تحمل آمیز لہجے میں گفتگو میں حصہ لیا۔ ”گزشتہ تین چار دہائیوں میں ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایک دوڑ لگی ہے۔ اس دوڑ میں آگے بڑھنا اور جیتنا تو دور کی بات ہے ہم تو شاید اس دوڑ میں شامل ہی نہیں ہوئے۔“

”کیونکہ ہم تو آدھے گلاس پر قناعت کئے ہوئے تھے۔“ اعجاز احمد نے آہستہ سے کہا۔
 جیلانی لچر روم میں داخل ہوا۔ دروازے پر ایک لمحے کے لئے رکا۔ بڑی میز کے گرد وہ سب حسب معمول جمع تھے اور بحث میں مصروف تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی

مسکراہٹ ابھری۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب کھانے کے وقفے میں وہ لنچ روم میں جمع ہوتے تو خود بخود باتوں کا سلسلہ چل پڑتا۔ ایک موضوع سے دوسرا موضوع۔ ابتداء عموماً ذاتی مسائل، پریشانیوں اور مہنگائی سے ہوتی۔ پھر خود بخود بغیر کسی نیت یا ارادے کے فلم، ادب اور حالات حاضرہ سے ہوتی ہوئی سیاست وغیرہ تک پہنچ جاتی۔ خوب گرما گرم بحث ہوتی۔ منطق بگھاری جاتی، سیاست کے نیچے اُدھیڑے جاتے اور پیچیدہ ترین عصری، عالمی مسائل بھی جنگلی بجاتے حل کر دیئے جاتے۔ بحث کے دوران میں اکثر تلخی بھی پیدا ہو جاتی، جو عارضی ہوتی۔ لنچ ختم ہوتا تو وہ سب تلخی اور گرما گرمی کو بھول کر اپنی اپنی میزوں پر پہنچتے اور معمول کے مطابق فائلوں میں سرکھپانا شروع کر دیتے۔

وہ آگے بڑھا۔ قریب سے ایک کرسی گھسیٹ کر عثمان صاحب کی بغل میں رکھی اور اطمینان سے بیٹھ کر واجد کی طرف دیکھا۔ واجد اپنے سرمئی بالوں میں انگلیاں پھیر کر ذرا فلسفیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”ہاں، یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اکثر ممالک اس دوڑ میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اتنے کہ ہم ان کی گرد کو بھی پہنچنے سے قاصر ہیں اور یہ بات نہایت افسوس ناک ہے۔“

”تمہاری باتوں سے مایوسی کی نو آ رہی ہے۔“ صدیقی نے مسکرا کر قدرے مزاحیہ پیرائے میں کہا۔

”اگر ایسا ہے تو میں مجبور ہوں۔“ واجد نے کہا۔ ”لیکن آدھا گلاس جو خالی ہے، اسے بھرنے کا ہم نے کبھی جتن ہی نہیں کیا۔“

”اصل میں یہ معاملہ بے عملی اور خود اعتمادی کے فقدان کا ہے۔“ فاروقی نے سگریٹ سلگائی۔

”اور اب صورت یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر طرف افرا تفری اور انتشار ہے اور بے سستی اور بے چہرگی۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک ادراک نہیں ہے کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟ کہیں جا بھی رہے ہیں یا پھر یہ کہ.....“ اعجاز احمد بات ادھوری ہی چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

”اگر آپ غور کریں تو محسوس ہو گا کہ یہ مسئلہ اجتماعی احساس کمتری کا بھی ہے۔“ فاروقی نے اظہار خیال کیا۔

”شاید ہمارے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس پر ہم فخر کر سکیں۔“ عثمان صاحب نے لقمہ دیا۔

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔“ انور حسین جو قریب کی میز پر بیٹھا تھا اور ان کی گفتگو بہت دلچسپی اور غور سے سن رہا تھا، معاً اونچی اور قدرے تلخ آواز میں بولا اور کرسی گھسیٹ کر قریب آ گیا۔ ”آپ لوگوں کی باتیں ابید از حقیقت بھی ہیں اور احساس شکست کی غماز بھی۔ آپ لوگ صرف تاریک پہلو دیکھ رہے ہیں اور روشن پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ دراصل آپ لوگ متاثر ہیں۔“

”متاثر ہیں؟..... کس بات سے؟“ صدیقی نے چونک کر پوچھا۔

”مغرب کے پریگنڈے سے۔“ انور حسین نے میز پر ہاتھ مارا۔

”پریگنڈے سے.....؟“

”ہاں.....“

ایک ان سب کو خاموشی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدیقی نے ابھی ہوئی نظروں سے انور حسین کو دیکھا اور ہونٹوں پر اس طرح زبان پھیری جیسے طے نہ کر پا رہا ہو کہ انور حسین کی بات کے جواب میں کہے تو کیا کہے۔ اعجاز احمد بھی چپ رہا۔ فاروقی نے بلا سبب ہی ڈیبا کھول کر ایک سگریٹ نکالی، پھر واپس رکھ دی۔ داجد نے کرسی پر پہلو بدل کر عثمان صاحب کی طرف دیکھا اور سر کو ہلکا سا جھکا دیا۔ جیلانی خاموشی سے سب کے چہرے دیکھتا رہا۔ چند لمحے گہرے سکوت میں گزرے، پھر انور حسین نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

”جی ہاں..... حقیقت یہی ہے۔“

”مگر بھئی انور! تمہاری بات ہر چند کہ بے وزن نہیں۔ مگر.....“ عثمان صاحب نے کہنے کی کوشش کی۔

”مگر کیا؟ حقیقت یہی ہے عثمان صاحب!“ انور حسین نے پُر جوش انداز میں قطع کلام کیا۔ ”میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کچھ خامیاں ہیں۔ کچھ کمی بھی ہے۔ اور ہم سے کچھ کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں۔ مگر صورت حال اتنی بھی مایوس کن نہیں، جس کا اظہار آپ حضرات کی باتوں سے ہوتا ہے۔ اور ایک آپ لوگوں پر ہی منحصر نہیں، بد قسمتی سے ہماری پوری قوم اسی پنج پر سوچتی اور محسوس کرتی ہے۔ بس یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہم کمتر ہیں، پچھڑے ہوئے ہیں، غریب ہیں۔ اور یہ کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، جس پر ہمیں فخر ہو۔ اور یہ رجحان صرف اور صرف دو وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔“

”دو وجوہ سے.....؟“

”جی ہاں.....“ انور حسین نے ایک سگریٹ لگائی اور بدستور جوش و خروش سے کہتا

رہا۔ ”اول ہمارے رہنماؤں کی منفی سوچ اور غلط روش کی بناء پر اور دوئم مغربی ممالک کے نہایت موثر پروپیگنڈے کے باعث۔ ہمارے رہنماؤں اور اکابرین کا کیا کردار رہا ہے، فی الحال اسے الگ رکھئے۔ میں بات پروپیگنڈے کی کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں پروپیگنڈا سب سے کامیاب اور موثر ترین ہتھیار ہے۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا۔ آپ پروپیگنڈے کی مدد سے سفید کو سیاہ اور دن کو رات بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ اور یقین کیجئے، اگر آپ دن کو رات کہیں گے تو انجام کار لوگ یقین کر لیں گے۔ بس ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب سے کچھ مدت پہلے تک مغرب کے چند ممالک کا تقریباً پوری دنیا پر قبضہ تھا۔ پھر ایک ایک کر کے بیشتر ممالک نے طوق غلامی گلے سے اتارا اور آزاد ہوئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ آزادی بھی محض نمائشی تھی اور کافی حد تک اب بھی ہے۔ مغربی ممالک بہت چالاک، شاطر اور منصوبہ بند ہیں۔ انہوں نے ایک نئی چال چلی۔ یہ کہ بیشتر ممالک کو انہوں نے آزادی تو دی مگر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی متنازعہ مسئلہ بھی چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی تقریباً ہر ملک کو اقتصادی غلامی کے شکنجے میں جکڑا اور ہر ملک میں اپنی پٹھو حکومتیں بٹھانی شروع کیں۔ جی ہاں، غلامی کا یہ ایک نیا انداز ہے۔ اب وہ لوگ کسی ملک پر قبضہ کر کے خود حکومت تو نہیں کرتے۔ ضرورت بھی کیا ہے۔ اب وہ یہ کرتے ہیں کہ ”جی حضور“ قسم کے سیاست دانوں کو مسند حکومت پر بٹھا کر پس پردہ حکومت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے کہ نہ ہینگ لگتی ہے، نہ پھٹکری، پھر بھی رنگ چوکھا آتا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے، بیشتر ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کا کیا کردار ہے۔ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنا اور حسب منشاء نتائج حاصل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ انور نے رُک کر زور سے سانس لی۔

”بھئی اس بات پر تو میں بھی انور کی تائید کرتا ہوں۔“ نور علی نے گردن کو جنبش دی۔ ”ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان، سرمایہ دار اور اکابرین جو ہمیں اس صورت حال سے بچا سکتے تھے، وہ بھی مغربی طاقتوں کے آلہ کار بن گئے۔“

”مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔“ انور نے مزید کہا۔ ”اقتصادی بااادستی کے حصول کے بعد مغربی ممالک نے یہ کیا کہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا۔ ان کی فلمیں، ان کے گاسی میگزین اور دوسرے ذرائع، ان سب کی مدد سے انہوں نے مغرب کی ایک ایسی تصویر پیش کرنا شروع کی جو بظاہر حد درجہ خوبصورت اور رنگین تھی اور آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ نتیجہ

ہوا کہ ایک طرف تو ہم مرعوب ہوئے اور دوسری طرف رفتہ رفتہ ایک پستی اور کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ہم نے یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ ان کے پاس سب کچھ ہے۔ بہت کچھ ہے۔ اور ہم بالکل تہی دست، تہی دامن ہیں۔“

”مگر بھی انہوں نے ترقی تو بہت کی ہے۔ تقریباً ہر میدان میں۔ یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔“ عثمان صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

”بے شک، اس سے کسی کو انکار نہیں۔“ انور حسین نے زور سے کش لیا۔ ”لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اشعوری طور پر اس احساس کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور یہ کہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔“

”خیر یہ تو ہے۔“ صدیقی نے تسلیم کیا۔ ”ایسا تو ہرگز نہیں ہے کہ ہمارا دامن بالکل ہی خالی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو ہمارے پاس بھی ہے۔“

”ارے صاحب! کچھ نہیں، بہت کچھ ہے۔“ انور نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔

”ہماری تہذیب اور روایات جو دنیا کی کسی بھی قوم کی تہذیب سے کم تر نہیں، ہماری ثقافت جو کئی لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ تعمیرات کے شعبے میں ہم نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہمارا ملک اگر غور کیجئے تو قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اور پھر ہمارا ادب، ہم مغرب کی طرف دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، ورنہ میر، غالب اور اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر کتنی قوموں نے پیدا کئے ہیں؟ اعلیٰ درجے کے سائنس دانوں کی بھی کمی نہیں۔ حکمت میں ہم کسی سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں۔ اور پھر ہماری تاریخ.....“ انور نے رُک کر پُر افتخار نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ ”جی ہاں۔ ہماری تاریخ جو سینکڑوں سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتنی صلیبی جنگیں ہم نے جیتیں۔ یاد کیجئے، اسپین سے لے کر ہندوستان تک کتنی فتوحات ہم نے حاصل کیں۔ کیسی کیسی عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ اکبر اور اورنگ زیب تک کیسے کیسے شہنشاہ ہم نے پیدا کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہیت کو جو عظمت، رعب اور جلال و افتخار ہم نے دیا، وہ کسی اور قوم نے نہیں دیا۔ ایک زمانہ تھا جب چہار دانگ عالم میں ہمارا ڈنکا بجاتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ تہذیب و تمدن اور حقوق انسانی کا تصور پہلی بار ہم نے دنیا کو دیا۔ مغربی ممالک کے پاس آج سوشل سکیورٹی ہے۔ یہ نظریہ بھی انہوں نے ہم سے ہی لیا، ہمارے زکوٰۃ کے نظام سے۔ جو بچ پوچھے تو ان کے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جو خالص ان کا اپنا ہو۔ ہر نظریہ اور ہر تصور انہوں نے کسی نہ کسی صورت ہم سے ہی لیا ہے۔“ انور نے ٹھہر کر سگریٹ الیش ٹرے میں بجھائی۔ ”پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا۔“

”سنے کہ مغرب مادہ پرست ہے۔ جبکہ ہم نے روحانیت کا دامن آج بھی نہیں چھوڑا ہے۔“

ہم نے کیسے کیسے عظیم المرتبت مفکر، علماء اور.....“

گفتگو چلتی اور دیر تک چلتی اور شاید بحث کا رنگ اختیار کر لیتی۔ کیونکہ کم از کم عثمان صاحب، فاروقی اور واجد، انور حسین کے پیش کردہ حقائق و دلائل کو کسی حد تک تسلیم کرنے کے باوصف پوری طرح متفق نظر نہیں آتے تھے۔ مگر لنچ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔ بادل ناخواستہ انہوں نے گفتگو ختم کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ صدیقی نے نقن بند کرنے کے بعد کرسی سے اٹھتے ہوئے معاً جیلانی کی طرف دیکھا اور ذرا تجسس آمیز انداز میں بولا۔

”کیا بات ہے یار جیلانی! تم نے تو گفتگو میں کوئی حصہ ہی نہیں لیا۔ بہت خاموش ہو۔“

”میں سن رہا تھا۔“ اس نے پھیکسی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

صدیقی چونکا۔ ”یار جیلانی! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ اور کچھ اُداس بھی..... خیریت تو ہے؟“

اُس نے کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے صدیقی کی طرف دیکھا اور خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کیا۔ ایک کشمکش سی چہرے پر نمودار ہوئی، جیسے الجھا ہو کہ کہے یا نہ کہے۔ پھر ارادہ بدل دیا اور مدہم آواز میں بولا۔

”نہیں..... کوئی بات نہیں ہے۔“

دفتر سے نکلا تو سہ پہر دم توڑ رہی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق بس پکڑی اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا، اگلے اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے مسافر اتاج کے بوروں کی طرح بس میں ٹھنسن جائیں گے۔ اس طرح کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ کونے میں کھڑکی کے قریب بیٹھے تاکہ سانس لینے میں دشواری نہ ہو۔

بس چلی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا اور خالی خالی نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ دوسرے اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے بس میں مسافروں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ بس کے تنگ اور گھٹے گھٹے ماحول میں جس تھا، گرمی تھی، بدبو تھی اور شور تھا۔ جس میں ایسی گالیاں بھی شامل تھیں جنہیں مہذب اور شائستہ لوگ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر وہ ہر بات سے بے خبر تھا۔ نظریں باہر جمی ہوئی تھیں اور وہی منظر آنکھوں کے سامنے تھا جو وہ ہر روز دیکھتا تھا۔ بھاگ دوڑ، افراتفری۔ بے سکونی اور شور۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شخص ایک بے یقینی اور خوف میں مبتلا ہے۔ مگر کس بات کا خوف؟ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ لیکن بازار میں چلتے پھرتے اُسے اکثر اس خوف کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چپے چپے پہ، بازاروں میں، گلیوں

میں، سڑکوں اور گھروں کے اندر اور باہر، خوف کا ایک غیر مرئی سایہ موجود ہے۔ ہر شخص اس خوف کا شکار ہے۔ ہر چند کہ کسی کو بھی شاید اس خوف کا احساس نہیں ہے۔ مگر یہ خوف ہے کیا؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ خوف کہاں سے آیا ہے؟

گھر کا منظر حسب معمول ویسا ہی تھا جیسا ہر روز ہوتا تھا۔ اُداس، پھیکا اور بے رونق۔ اُس کی بیوی کلثوم نے معمول کے مطابق مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں مسرت اور شگفتگی نہیں تھی۔ جواب میں وہ بھی مسکرایا۔ تاہم اس کی مسکراہٹ بھی ایک میکانیکی ردِ عمل کے سوا کچھ نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنی بیوی کا چہرہ غور سے دیکھا اور کوئی شے اس کے سینے میں آہستہ سے ٹوٹی۔ کیا یہ وہی کلثوم ہے جس سے اُس نے بارہ سال پہلے شادی کی تھی؟..... شاید نہیں۔ کیونکہ جس کلثوم سے اس نے شادی کی تھی، وہ تو بہت حسین تھی۔ بہت تر دتازہ اور شاداب تھی۔ اس کی آنکھوں میں قدیمیں جلتی تھیں۔ اس کے رخساروں پر صدمہ کھلنے والے گلابوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر چینیلی کی کلیاں چمکتی تھیں۔ مسکراتی تھی تو ستارے دکتے تھے۔ چلتی تھی تو بہاروں کا خرام بھی شر ماتا تھا۔ اس کا پورا سراپا ایسا تھا کہ ایک نظر دیکھ کر جان اور ایمان سب کچھ ہار جانے کو جی چاہتا تھا۔ مگر یہ کیا ہوا کہ صرف بارہ سال میں سب کچھ بدل گیا۔ اُس نے افسردگی سے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بارہ سال پہلے یہ عورت اثبات تھی، اب نفی ہے۔ خود اپنا ڈھنڈلا اور بے قیمت سایہ بن کر رہ گئی ہے۔ ڈکھوں نے، محرومیوں نے اور فکرِ امروز و فردا نے اُس کے سراپے سے سُسن، تازگی اور دلکشی کی ایک ایک رت چھین لی ہے۔ اب کلثوم کے ہاتھوں پر نیلی نیلی ابھری ہوئی رگیں ہیں۔ آنکھوں کے گرد سرمئی حلقے اور کنپٹیوں کے اوپر بالوں میں کہیں کہیں ہلکی سی چاندی۔ ٹھوڑی کے نیچے کی کھال بھی نرم پڑ گئی ہے۔ بارہ سال کا عرصہ اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا۔ مگر بیس سال کی کلثوم بتیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ ڈھلتی عمر کی نظر آنے لگی ہے۔ کبھی کبھی جب وہ کلثوم کے سراپا کو غور سے دیکھتا ہے تو رنج کے ساتھ ساتھ ایک انجانا سا احساسِ جرم بھی اسے گھیر لیتا ہے۔ جیسے کلثوم کے سُسن اور شادابی کے زوال کا وہ خود بھی ذمے دار ہے۔ اگر اس کے حالات اتنے پست نہ ہوتے، اگر اس کی آمدنی زیادہ ہوتی یا دفتر کے دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ بھی اوپر کی آمدنی کو جائز گردانتا اور کلثوم کو فکر و پریشانی سے مبرا ایک پُر آسائش زندگی کے لوازمات فراہم کرتا تو کلثوم کی دلکشی اور جوانی کو وقت کی دیمک اتنی جلدی نہ چاٹتی۔ مگر وہ بھی کیا کرتا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے، ان گنت درخواستیں لکھی تھیں، بے شمار انٹرویو دیئے تھے، چند ایک بار چھوٹی چھوٹی۔ فائز شیں بھی پہنپائی گئی تھیں مگر اس کی تعلیمی اسناد کے مطابق ملازمت نہیں ملی۔ یہ کئی

سال پہلے کی بات ہے۔ پھر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ جو کچھ میسر تھا، اسی پر قناعت کر لی۔ اور کلثوم اور بچوں کو وہ سب کچھ مہیا نہ کر سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

اُس نے ایک بار پھر کلثوم کے چہرے پر نظر ڈالی اور ہولے سے مسکرایا۔

کلثوم نے معاذرا حیرت سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟..... ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے جھج ہو کر آہستہ سے کہا۔

”چائے بناؤں؟“

”ہاں۔“ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”ذرا تھک گیا ہوں۔ اگر ایک اسپرڈ ہو تو

دے دو۔ اور ہاں، گڑیا کی طبیعت کیسی ہے؟ ہسپتال لے گئی تھیں؟“

”نہیں۔ ڈاکٹر سخاوت حسین کے یہاں لے گئی تھی۔“

”ڈاکٹر سخاوت؟ مگر بھی وہ تو بہت مہنگا ہے۔“

”ہاں، اُس کی فیس تو خیر زیادہ ہے۔“ کلثوم نے بارچی خانے کی طرف بڑھتے

ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں بیزاری اور تلخی تھی۔ ”لیکن سرکاری ہسپتالوں میں کیا ملتا ہے؟

رنگین پانی۔ ایک ہفتہ ہو گیا، گڑیا کی طبیعت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر سخاوت مہنگا ہے

مگر اس کی دوا سے گڑیا کا بخار کافی کم ہو گیا ہے۔ دو چار دن میں اللہ نے چاہا تو بالکل

ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ کمرے میں چلا گیا اور چارپائی پر نیم دراز ہو کر اخبار دیکھنے لگا۔ اخبار دو دن پرانا

تھا۔ اس میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ باقاعدگی سے اخبار خرید سکتا۔ عموماً اتوار کا ایڈیشن

خرید لیا کرتا تھا۔ اُس نے ان تمام سرخیوں پر ایک بار پھر سرسری طور پر نظر ڈالی جنہیں پہلے

ہی دیکھ چکا تھا۔ کچھ دیر میں کلثوم چائے لے کر آگئی۔ سرہانے کی نیبل پر پیالی رکھ کر اُس

نے ذرا اور اپنائیت سے پوچھا۔

”کیا طبیعت زیادہ خراب ہے؟“

”ارے نہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ذرا تھکاؤٹ ہے۔ سر بھاری ہو رہا ہے اور بس۔ ابھی

ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“ پھر ذرا رک کر پوچھا۔ ”کاشف کہاں ہے؟“

”آصفہ باجی کے یہاں گیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔“ کلثوم نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

”حاجی صاحب کے پاس گئے تھے؟“

اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سہم کر کلثوم کی طرف دیکھا۔ اُسے معلوم تھا، کلثوم

یہ سوال ضرور کرے گی۔ تاہم اُس کے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔

کیونکہ جو جواب اُس کے پاس تھا، جانتا تھا، کلثوم کی تشفی اس سے نہیں ہوگی۔ پھر کیا

کرے؟ اُس نے ذرا بے بسی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر پیالی اٹھائی اور ایک پئسکی لی۔
 ”ہاں گیا تھا۔“ اُس کا لہجہ پست تھا۔
 ”پھر کیا ہوا؟“

یہ ایک جھنجھاہٹ کی ایک آتشیں لہر اٹھی اور اس کے سارے وجود کو دھکا گئی..... ارے ہوتا کیا محترمہ کلثوم بیگم! وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ تم کس دنیا میں ہو؟ کن خوش فہمیوں میں مبتلا ہو؟ یہ جو ہمارے یہاں شرافت، اخلاق، ایمان اور حرام و حلال کے دعوے ہیں، سب کاغذی ہیں۔ ہر بات، مراسم اور رشتے مصنوعی۔ جو کسی کام نہیں آتے۔ جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو سارے دعوے اور الفاظ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ یہی ہم سب کا مقدر ہے اور اسی میں ہمیں جینا ہے..... مگر اُس نے کچھ نہیں کہا۔ الفاظ زبان پر ہی روک لئے۔ ہمدردی اور رحم سے کلثوم کی طرف دیکھا اور مدہم لہجے میں بولا۔

”انہوں نے معذرت کر لی۔“

”معذرت کر لی؟“ کلثوم نے چونک کر کہا۔ ”مگر کیوں؟..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے ابا مرحوم کے گہرے دوست رہ چکے ہیں وہ۔ ہم سے بھی اچھے تعلقات ہیں۔ بہت اثر رسوخ ہے اُن کا۔ اور.....“ کلثوم نے شدید حیرت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور پھر انہیں معلوم بھی ہے کہ معصوم بے گناہ ہے۔“

معصوم، کلثوم کا چھوٹا بھائی تھا۔ دو دن قبل پولیس نے اسے شراکتیزی اور امن عامہ خطرے میں ڈالنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ حالانکہ اُس کا جرم صرف اتنا تھا کہ بد قسمتی سے اس وقت وہ اس سڑک پر موجود تھا جہاں دو مخالف سیاسی گروہوں کے درمیان تصادم ہوا۔ ایک پارٹی جلوس نکال رہی تھی۔ اُس کے اراکین کا دعویٰ تھا کہ وہ پُر امن مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب سے مخالف سیاسی پارٹی کے لوگ آئے اور انہوں نے ہنگامہ آرائی شروع کی۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ پولیس نے خود بھی ہنگامے کو ہوا دینے کی کوشش کی۔ حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ بہر نوع دونوں گروہوں میں زبردست تصادم ہوا۔ اسٹکوں اور پتھروں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ شاید چاقو چھرے بھی چلائے گئے تھے۔ جانی نقصان تو خیر کوئی نہیں ہوا مگر متعدد افراد زخمی ہوئے تھے۔ پولیس نے خاصی تعداد میں ”شرپسندوں“ کو گرفتار کیا تھا جن میں زیادہ تر آئندہ چند گھنٹوں میں چھوڑ دیئے تھے۔ کیونکہ پولیس کو ان کی ”بے گناہی“ کے کافی ”ثبوت“ مل گئے تھے۔ مگر کچھ افراد بدستور حوالات میں تھے اور ان میں معصوم بھی۔

شامل تھا۔

حالانکہ معصوم کا سیاسی عناصر یا ہنگامے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو وہاں اپنی بیماری کی دوا لینے گیا تھا۔ لیکن حماقت اس سے یہ ہوئی کہ ہنگامہ شروع ہوا تو ایک طرف ٹھہر کر تماشا دیکھنے لگا۔ جب پولیس نے لاشی چارج شروع کیا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ پولیس نے اسے بھی دھریا۔ اب دو دن سے وہ حوالات میں تھا اور جیلانی ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ کئی لوگوں سے ملا تھا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ حاجی عبداللہ صاحب کے پاس بھی اسی سلسلے میں گیا تھا۔ حاجی صاحب کا تعلق بھی قانون اور انصاف کے محکمے ہی سے تھا۔ بڑے افسر تھے۔ بہت اثر رسوخ کے مالک تھے۔ مشہور تھا کہ نہایت نیک نفس، ایماندار اور خدا ترس ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک کلثوم کے والد مرحوم کے ہم نوالہ وہم پیالہ رہ چکے تھے۔ وہ مراسم کسی حد تک ابھی بھی برقرار تھے۔ کلثوم نے خود ہی کہا تھا کہ حاجی صاحب کے پاس جاؤ۔ وہ سفارش کر دیں گے تو معصوم ضرور رہا ہو جائے گا۔ چنانچہ جیلانی صبح ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بے نیل مرام واپس آ گیا تھا۔

”آخر کیا کہا انہوں نے؟“ کلثوم نے پوچھا۔

اُسے جھنجھلاہٹ پر قابو پانے میں کچھ دیر لگی۔ پھر نرم مگر خشک لہجے میں بولا۔ ”کہنے لگے کہ انہیں بہت افسوس ہے معصوم کی گرفتاری کا۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہو گا مگر وہ مجبور ہیں۔ اگر سفارش کریں تو ان کی نیک نامی پر برا اثر پڑے گا، وغیرہ وغیرہ۔ مایوس ہو کر میں واپس ہوا اور سیدھا متعلقہ پولیس اسٹیشن پہنچا۔ افسر انچارج صاحب سے تو خیر ملاقات نہ ہو سکی، ایک اور شخص ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود ہی مجھ سے گفتگو کی تھی۔ نام ہے نیک محمد۔ شاید دفتر میں کسی اہم عہدے پر فائز ہے۔“

”تو اُس نے کیا کہا.....؟“

جیلانی نے ٹھنڈی سانس لے کر ہمدردی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ”نیک محمد نے کہا، آپ دو دن سے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ فضول ہے۔ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اگر اپنے بھائی کو بچانا چاہتے ہیں تو کچھ لے دے کر معاملہ رفع دفع کیجئے۔ ورنہ کچھ نہیں ہو گا۔ میں نے اس سے کہا کہ معصوم بے قصور ہے۔ یہ سن کر نیک محمد ہنسا، پھر کہنے لگا۔ ہمیں معلوم ہے۔ جتنے افراد گرفتار ہوئے تھے ان میں زیادہ تر بے گناہ ہی تھے۔ پھر میں نے اتفاق سے حاجی عبداللہ صاحب کا ذکر کیا تو نیک محمد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔“

”قہقہہ لگایا، کیوں؟“ کلثوم نے حیرت سے پوچھا۔

اُس نے ہارے ہوئے انداز میں گردن کو جنبش دی۔ ”نیک محمد ہنسا، پھر کہنے لگا۔ آپ کس چکر میں پڑے ہیں؟ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ ارے بھائی سب ملکوں میں سورج مشرق سے نکلتا ہوگا، ہمارے یہاں مغرب سے نکلتا ہے۔ جی ہاں، یہاں جو کچھ ”لیا دیا“ جاتا ہے اس میں اوپر دانوں کا بھی حصہ ہوتا ہے جو نہایت ”ایمانداری“ سے انہیں پہنچا دیا جاتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں کچھ؟“

کلثوم چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی پھر کمزور آواز میں بولی۔
”تو کیا حاجی صاحب بھی.....؟“

جیلانی نے زخمی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔
”مگر وہ تو اتنے نیک، پارسا اور خدا ترس مشہور ہیں.....؟“

جیلانی آہستہ سے مسکرایا۔ اس کی طنز میں ڈوبی ہوئی تلخ مسکراہٹ ہی کلثوم کے سوال کا جواب تھی۔

چند لمحے کے بعد کلثوم نے کہا۔ ”تو گویا کچھ لئے دیئے بغیر بات نہیں بنے گی؟“

”بظاہر تو یہی لگتا ہے۔“ اس کی آواز سے مایوسی اور جھنجھلاہٹ مترشح تھی۔

”کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی؟“ کلثوم نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

اس نے پیالی اٹھا کر چسکی لی۔ ”میں نے نیک محمد سے سرسری طور پر یہ سوال کیا تھا۔

جواب میں وہ کہنے لگا کہ آپ مجھے نہیں جانتے، مگر میں آپ سے واقف ہوں۔ آپ شریف

آدی ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ کم سے کم میں کام بن جائے۔ پھر بھی.....“ اس نے

رک کر ٹھنڈی سانس لی۔ ”دو تین ہزار تو لگ ہی جائیں گے۔“

”دو تین ہزار.....؟“

”ہاں، ممکن ہے کچھ زیادہ۔“

اس نے کلثوم کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ بدلتے دیکھا۔ پہلے سرخ ہوا، پھر بندرتیج

پھیکا اور بے رنگ۔ وہ صاف محسوس کر سکتا تھا کہ کلثوم کے اندر پہلے ادا اٹھا۔ طیش کا لاوا۔

پھر مایوسی اور الاچاری کے احساس نے اس لاوے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ پھر اُسے کلثوم کی

آنکھوں میں نئی نظر آئی اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ۔ وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شاید الفاظ

نہیں مل رہے تھے۔ جب کچھ طے نہ کر سکی تو زور سے سانس لے کر بولی۔

”میرے اللہ! اتنا روپیہ اب کہاں سے آئے گا؟“

پھر وہ مرے مرے قدموں سے باہر چلی گئی۔

وہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور اخبار پر نظر ڈالتا رہا۔ پھر دھاکے سے متعلق اس خبر کو

دوبارہ پڑھا جس میں ایک بڑی عمارت کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ دھماکے کے نتیجے میں پانچ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مرنے والوں میں دو غیر ملکی بھی شامل تھے۔ تیس افراد زخمی ہوئے تھے جن میں سے چار کی حالت نازک بتائی گئی تھی۔ مجرم کون تھے، اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ نہ ہی کسی گرفتاری کا ذکر تھا۔ دو تین خبریں ذہنی اور لوٹ مار کے متعلق تھیں۔ ایک خبر پولیس چھاپے کے بارے میں تھی۔ خبر کے مطابق پولیس نے شہر کے ایک اندرونی اور بدنام علاقے میں ایک عمارت پر چھاپہ مارا تھا جہاں سے کئی کروڑ روپے کی منشیات برآمد ہوئی تھی۔ لیکن کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ ایک رپورٹ افغانستان پر امریکہ کے تازہ حملوں کے حوالے سے تھی۔ اس رپورٹ میں پناہ گزینوں کی تازہ صورت حال کا ذکر بھی تھا جو روز بروز تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی۔ اندرونی صفحات پر ایک تاریخی مضمون تھا۔ بغداد کے دور زریں کے بارے میں۔ جب وہاں دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ مضمون کے نیچے ایک تجزیاتی رپورٹ تھی۔ غیر ملکی قرضوں سے متعلق۔ رپورٹ زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس نے یونہی بے دھیانی سے رپورٹ پڑھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ، طنزیہ، مظلوم اور زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کا دھیان کلثوم کی طرف چلا گیا۔ کلثوم اُمید سے ہے۔ ابھی تیسرا مہینہ ہے۔ لیکن یہ کیسا ستم ہے کہ جب میرا بچہ اس دنیا میں آئے گا تو ہزاروں روپے کا مقروض ہوگا۔

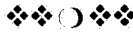
اُس نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دھیان اخبار کی خبروں سے ہٹ کر باہر چلا گیا۔ کاشف آگیا تھا اور اپنی ماں سے کسی بات پر جھگڑ رہا تھا۔ اس نے ذرا توجہ سے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

”میرا جوتا بالکل پھٹ گیا ہے۔“

”ہاں..... معلوم ہے مجھے۔“ کلثوم کی تھکی ہوئی آواز آئی۔ ”کل بازار چلوں گی۔“
 ”کل، کل.....“ کاشف کی آواز میں مصنوعی غصہ تھا۔ ”کل بھی آپ نے کہا تھا، کل چلوں گی۔ اب آج کہہ رہی ہیں، کل چلوں گی۔ مگر کل کہیں گی، اچھا کل چلوں گی۔“
 کلثوم کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”ارے بیٹا! آج تو فرصت نہیں ملی۔ مگر کل ضرور چلوں گی۔ اطمینان رکھو۔“

’کل..... وہ یک لخت چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کل..... کل..... ایک دہشت خیز لہر اُس کے دماغ میں اُٹھی اور رگ و پے میں دوڑتی چلی گئی۔ اُسے نور حسین کے الفاظ یاد آئے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ایک عظیم الشان اور درخشاں ماضی اور پُر شکوہ تاریخ۔ ٹھیک ہے، ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ہم نے اسپین، عرب اور ہندوستان میں عظیم الشان

سلطنتیں قائم کیں۔ ہم نے جاہ و جلال والے شہنشاہ پیدا کئے۔ ہم نے دودھ کی نہریں بہائیں اور دنیا کو علوم و فنون کے خزانے دیئے۔ ہم نے فتوحات حاصل کیں اور بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے..... ہمارے پاس بلاشبہ ایک تابناک ماضی ہے۔ مگر وہ تو گزرا ہوا 'کل' ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا آنے والا 'کل' بھی..... اُس نے معاً ہونٹوں پر زبان پھیری اور خوف زدہ نظروں سے، کھلے دروازے سے آنگن میں کھیلے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا۔



پاکستانی وقت
داتا گرام

پڑیے گر بیمار تو

اُجالا دھیرے دھیرے معدوم ہوا، جیسے دھیرے دھیرے اُمید ٹوٹی ہے یا سہارا چھوٹا ہے یا نبض ذوقی ہے۔ کھڑکی سے نظر آنے والا آسمان کا وہ ٹکڑا جو اس کی کائنات تھا، گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ درختوں کے جھنڈ، جن کی تنگی شاخوں میں سارا دن پرندے شور مچاتے تھے، رفتہ رفتہ سیاہ پوش ہوئے۔ وہ چپ چاپ کھڑکی سے باہر سیاہ بادلوں اور پیڑوں کے ڈھندلے ہیولوں کو دیکھتا رہا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مگر وہ اسٹ نہیں جلا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بستر سے نہیں اُٹھ سکتا تھا۔ اُٹھنا اور چلنا پھرنا تو درکنار، اُسے تو کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پیٹھ کے بل مستقل طور پر لیٹا رہتا تھا۔ کئی ہفتے یونہی گزر گئے تھے اور ابھی نہ جانے اور کتنے دن اسی طرح صاحب فراش رہنا تھا۔ اُس نے گردن موڑ کر دروازے پر نظر ڈالی، جو نصف کھلا ہوا تھا۔ اسٹ کا سوچے دروازے کے قریب تھا۔ وہ وہاں تک نہیں جاسکتا تھا، مگر سر ہانے رکھا لیمپ ضرور جلا سکتا تھا کیونکہ لیمپ کا سوچے جو ایک لمبے تار سے منسلک تھا، اس کے ہاتھ کے قریب ہی تھا۔ تاہم اس نے پردہ نہیں کی۔ اندھیرا ہے تو کیا ہوا؟ اندھیرا کہاں نہیں ہے؟ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اندھیرا تو ہر طرف ہے اور ہر جگہ ہے۔ چپے چپے پر پھیلا ہوا ہے اور اپنی نحوست سے روشنی کو تاراج کر رہا ہے۔ تنہائی، ڈکھ اور کم نصیبی کا اندھیرا اور نفرت کا اندھیرا۔ جہالت اور گمراہی، عداوت اور بے مہری کا اندھیرا..... ان گنت شکلوں میں ہے یہ اندھیرا اور نہ جانے کہاں سے آیا ہے اور جانے کب سے مسلط ہے۔ آدمی نے اس اندھیرے سے لڑنے کے لئے اکھ جتن کئے۔ علم کی روشنی دریافت کی اور اسے چہار سو پھیلا یا مگر اندھیرا ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ تو پھر اس اندھیرے سے، جو اس وقت کمرے میں موجود ہے اور میرے چاروں طرف سانس لے رہا ہے، کیا ڈرنا؟..... اُس نے ہاتھ اٹھا کر کنپٹی پر شہادت کی انگلی پھیری اور دھیرے سے سانس لی۔

دروازے کے باہر راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک نوجوان اور بے حد

خوبصورت عورت، ایک مرد اور دو بچے گزر رہے تھے۔ دونوں بچوں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ خاص طور پر اس کے پلاسٹریڈ کو جو معمول سے کافی اونچا اور قدرے عجیب تھا۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا اور ہنسے۔ عورت نے فوراً بچوں کو تہدیدي انداز میں ڈانٹا۔ ”اسٹاپ اٹ!“ پھر معذرت بھری نظروں سے اُس کی جانب دیکھا اور خوش دلی سے مسکرائی۔

”ہیلو!“

”ہیلو!“ اُس نے افسردہ آواز میں کہا۔

”کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟“ عورت یکایک رک گئی۔

اُس نے عورت کے سنہری بالوں کو دیکھا۔ اُس کی روشن آنکھوں اور شگفتہ چہرے کو دیکھا، اُس کی مہربان اور دوستانہ مسکراہٹ کو دیکھا۔ نہیں، اندھیرا ہر طرف نہیں ہے۔ کہیں کہیں روشنی کی کرن بھی ہے۔ پھر اُس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیونکہ میں لائٹ نہیں جلا سکتا۔“

”میں جلا دوں؟“

عورت کمرے میں آ گئی۔ مرد اور دونوں بچے دروازے ہی میں کھڑے رہے۔ عورت نے سوچ سمجھ کر تلاش کر کے آن کیا، پھر غائر نظروں سے سر سے پاؤں تک اُسے اور اُس کے بیڈ کو دیکھا، دوستانہ انداز میں مسکرائی اور نرم لہجے میں بولی۔

”تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“

”اب تو بہت اچھا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ خطرہ ٹل چکا ہے۔ بس کمزوری ہے جو وقت کے ساتھ رفع ہو جائے گی۔ مگر ابھی کچھ دن اور ہسپتال میں رہنا ہوگا۔“

”مجھے امید ہے تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔“ عورت نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“

مرد اور بچوں نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئے۔ وہ ان کے قدموں کی آوازیں سنتا رہا، جو ایک موسیقی ریز تسلسل سے راہداری میں گونج رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ آوازیں دور ہوتی گئیں، مدھم ہوتی گئیں، پھر معدوم ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ نصف

کھلے دروازے کو دیکھتا رہا۔ راہداری میں دائیں جانب وسیع و عریض وارڈ تھا، جہاں سے مریضوں، نرسوں اور ملاقاتیوں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ باتوں کی آوازیں، برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں۔ کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے مریضوں کو چائے دی گئی تھی اور بار بار گھنٹی بجنے کی آواز، ساتھ ہی وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ کیونکہ ملاقات کا وقت ختم ہونے والا تھا اور اب ملاقاتی واپس جا رہے تھے۔ جانے والوں میں کبھی کبھی کوئی ایک لمحے کے لئے رُک کر اُسے دیکھتا، خوش اخلاقی سے ہاتھ ہلاتا اور مسکرا کر کہتا۔

”گڈ نائٹ.....“

یہ اس کا روز کا معمول تھا اور مصروفیت بھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے کبھی کھڑکیوں سے باہر درختوں کے جھنڈ، آتے جاتے پرندوں اور دور تک پھیلے آسمان کو اور کبھی دروازے کی جانب گردن موڑ کر راہداری میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا اور وارڈ سے آنے والی آوازیں سنتا، یہی اس کی دنیا تھی، یہی اس کی کائنات۔ مگر یہ کائنات کچھ خوبصورت نہیں تھی بلکہ بہت بے رونق تھی۔ اس میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ کوئی نور نہیں تھا اور کوئی حرکت نہیں تھی۔ ہر شے بے مصرف اور بے معنی ہونے کے افسردہ احساس کی ردا میں لپٹی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے باہر کا منظر بے حد یکساں، بے کار اور لالچئی تھا۔ خزاں نے درختوں کا خُسن اور ان کا لباس چھین لیا تھا۔ سبز پتے بس کہیں کہیں نظر آتے ورنہ حد نظر تک ننگی، سیاہ، بے رونق شاخوں کے جھنڈ کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ ویران آسمان پر بے رونق بادلوں کے علاوہ کبھی کبھی کچھ پرندے بے مقصد طور پر اڑتے نظر آتے۔

جب وہ باہر کی یکسانیت اور اُداسی سے تھک جاتا تو راہداری کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ لوگ آتے جاتے رہتے اور وہ انہیں یوں دیکھتا رہتا جیسے کچھ نہ دیکھ رہا ہو۔ آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ کچھ ایسے تھے کہ بس کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ جبکہ کچھ افراد پابندی سے آتے تھے اور وہ انہیں پہچاننے لگا تھا۔ مثلاً ایک تو وہی خوبصورت عورت تھی جس نے لائٹ جلائی تھی۔ وہ اپنے دونوں بچوں اور شوہر کے ساتھ ہر شام چھ بجے آتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت تھی۔ سیاہ، بھدے اُونی کوٹ میں لپٹی ہوئی، سر پر ایک میلا سا رومال بندھا ہوا اور ہاتھ میں ایک پرانا تھیلا جو خاصا دزنی نظر آتا تھا۔ وہ عموماً دوپہر میں بارہ بجے آتی تھی اور ملاقات کا وقت ختم ہونے پر واپس جاتی تھی۔ پھر ایک لمبا ترنگ آدمی تھا۔ سر سے گنجا، آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا ہوا، ہاتھ میں چھڑی۔ وہ کسی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ بس گردن جھکائے چپ چاپ یوں گزر جاتا کہ اس کے پیروں کی چاپ تک نہ سنائی دیتی۔

اسی طرح اور بھی کئی لوگ تھے جنہیں وہ پہچاننے لگا تھا۔ ان آنے جانے والوں کے مزاج اور انداز بھی مختلف تھے۔ کچھ دروازے کے سامنے سے گزرتے وقت گردن گھما کر اس کی طرف دیکھتے اور اس کی سانولی رنگت پر نظر پڑتے ہی ان کے چہروں پر ناگواری پھیل جاتی۔ کبھی کبھی ایک آدھ جملہ اس کے کانوں میں پڑ جاتا۔ 'پاکی ہے'۔ اکثر افراد اُسے بالکل نظر انداز کر دیتے۔ یعنی اس کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ جبکہ چند ایک ایسے بھی تھے جو خوش دل اور خوش مزاج تھے۔ وہ اس کی جانب دیکھتے، دوستانہ انداز میں مسکراتے اور اونچی آواز میں "گڈ نائٹ" کہتے۔ وہ مسکرا کر جواب دیتا اور دیکھتا رہتا۔ وقت گزرتا، ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا اور پھر کمرے میں اور کھڑکیوں سے باہر راہداری میں خاموشیوں پھیل جاتی جیسے ٹوٹے ہوئے دلوں میں دھیرے دھیرے غم اور مایوسی سرایت کر جاتی ہے۔

وارڈ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند ثانیے بعد نرس نورما کمرے میں داخل ہوئی۔ حسب معمول نورما کے جھریوں سے بھرے اٹھاون سالہ چہرے پر سرد مہری اور ناگواری تھی اور آنکھوں میں روشنی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ خفا اور بیزار ہے۔ اس کا انداز گفتگو بھی دوسری نرسوں کے برعکس کسی حد تک ناشائستہ اور خشک تھا۔ بولتی تو یوں لگتا جیسے پتھر مار رہی ہو۔ کمرے میں آ کر اس نے سرد نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور بغیر مسکرائے کھڑکیوں کی جانب بڑھ گئی۔

"یہ پردے ابھی تک کیوں کھلے ہیں؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی درشتی تھی۔

اُس کا جی چاہا، کہے 'یہ تمہارا کام ہے۔ تم اب تک کہاں تھیں؟' مگر وہ چپ رہا۔ اسے شبہ تھا کہ نورما غالباً اُس کی سانولی رنگت کی بناء پر اسے پسند نہیں کرتی ہے۔ اس لئے وہ اس سے گفتگو کرنے میں محتاط رہتا تھا۔ نورما زیر لب کچھ بڑبڑائی۔ اس کے کانوں تک صرف آواز پہنچی، الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ نورما نے پردے بند کئے، پھر اس کی جانب گھومی۔

"تمہارے بچے آج نہیں آئے؟"

"آئے تھے، چلے گئے۔"

"چائے پو گے؟"

"ہاں....."

نورما چلی گئی۔

وہ خاموش لینا وارڈ سے آنے والی آوازوں کو سنتا رہا۔ نرس شرلی نے کسی کو آواز دی۔ پھر نورما کی کھر دردی آواز سنائی دی۔ 'احمد کو چائے چاہئے'۔ پھر کسی نے وارڈ کا دروازہ

کھولا اور اونچی آواز میں ”گڈ نائٹ“ کہا۔ پھر قدموں کی چاپ اُبھری اور گڈ نائٹ کہنے والا سامنے سے گزرا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ قدرے پستہ قد اور خاصا جسیم۔ چھڑی کی مدد سے دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ اُس نے ایک طائرانہ سی نظر اُس پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

نور ماچند منٹ بعد واپس آئی۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کا کپ اور اسٹرا تھی۔ وہ اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ گردن اُٹھانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ لیٹے لیٹے ساری ضروریات پوری کرتا تھا۔ نوزما کے ہاتھ سے کپ لے کر اس نے اسٹرا کا ایک سرا کپ میں ڈالا اور دوسرا سرا منہ میں لے کر زور سے گھونٹ بھرا اور تھکی ہوئی نظروں سے نور ما کو جاتے ہوئے دیکھا۔



رات کی تاریکی دھیرے دھیرے چاروں اور پھیل گئی جیسے کھنڈروں میں رفتہ رفتہ ویرانی پھیلتی ہے۔

اب ہر طرف خاموشی تھی اور سناٹا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ راہداری کی لائٹ کسی نے بند کر دی تھی اور اب وہاں اندھیرا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ وہ CLAUSTROPHOBIC نہیں تھا مگر رات میں جب کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے جاتے اور دروازہ بھی بند ہو جاتا تو اسے گھٹن سی ہونے لگتی۔ ایسا لگتا جیسے وہ کسی زندان میں بند ہے۔ تب ایک بے نام سا خوف اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ یہ خوف عجیب سا تھا۔ انجانا اور نامانوس۔ زندگی میں کبھی اُسے اس خوف کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے ساری دنیا اچانک بالکل ویران اور خالی ہو گئی ہے۔ کہیں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی آواز ہے اور نہ روشنی۔ بس ایک عظیم اور بے کنار ویرانہ ہے۔ وہ اس خالی اور سنسان ویرانے میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔

تھکن اور کمزوری کے باعث اسے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ پیٹھ میں درد ہو رہا تھا اور ٹانگوں میں اٹھن۔ بدن میں لگتا تھا جیسے جان ہی نہ ہو۔ اُسے دوا کی شدید ضرورت تھی مگر ابھی نرس جبکی کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ جب تک جبکی نہیں آئے گا، اور اسے دوا نہیں دے گی اور گرم گرم چائے کا ایک کپ، تب تک درد میں کمی نہیں ہوگی۔

کچھ دیر وہ خالی اور بے مقصد نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا، پھر تھک کر گردن گھمائی اور نظریں جھکا کر اپنے جسم کو دیکھا۔ سینے سے پاؤں تک، ہڈیوں کا ڈھانچا۔ یکا یک اس کا دل بھر آیا۔ گو وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر خود بخود آنکھیں نم ہو گئیں۔ چند ماہ کے اندر کیا کچھ ہو گیا ہے۔ کیسا تندرست اور خوش باش تھا، اب محض ایک پر چھائیں ہے۔ پہلے خواہشاں

سے بھرا ہوا تھا، اب کوئی خواہش نہیں۔ یوں کھوکھلا اور خالی ہو گیا ہے کہ کوئی جذبہ ہے نہ اُمید، اور نہ کوئی مقصد۔ اس کے ارد گرد ہر شے صرف ایک تماشا ہے اور وہ محض ایک تماشا ہی۔ گزشتہ چند ماہ میں اس نے جو تماشے دیکھے ہیں، وہ دآزار بھی ہیں اور بے حد مضحکہ خیز بھی۔ اُس نے چہروں کے پیچھے چہرے دیکھے اور اس پر منکشف ہوا کہ وہ چہرے جو چہروں کے پیچھے تھے، نہ صرف انہی کی دیکھے تھے بلکہ بے حد گھناؤنے اور مکروہ بھی تھے۔ تب وہ ڈرا اور مغموم ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ نہ ہوتا تو کیا حرج تھا۔ جن چہروں کو وہ پہچانتا تھا، گو وہ مصنوعی تھے، مگر وہی نظر کے سامنے رہتے تو کم از کم اسے رنج اور مایوسی کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ پھر اُس نے باتیں سنی تھیں، شہد میں لپٹی ہوئی، مگر اندر سے زہر کی طرح تلخ اور قاتل۔ اُس نے ہونٹوں پر مسکراہٹیں دیکھی تھیں، بظاہر دلکش اور نگافتہ، لیکن ایسی دودھاری کہ اس کی روح اور احساس کو کاٹتی تھیں۔ ان مسکراہٹوں نے بار بار اس کے دل پر چر کے لگائے تھے اور باتوں نے نمک پاشی کی تھی۔ اور جب اس کے دل میں ٹیسیں اُٹھتی تھیں تو وہ مسکرایا تھا۔ یوں جیسے اپنے حال پر رویا ہو۔

اُسے گزشتہ شام یاد آئی جب اس کی بیوی اور بچے معمول کے مطابق ملنے آئے تھے۔ اُس کی بیوی ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ الگ، تھلگ، لا تعلق۔ جیسے کوئی غیر ہو۔ اُس کی آنکھوں میں برہمی اور چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔ گزشتہ تین چار دن سے وہ خفا تھی۔ مگر کیوں؟ اس کا علم کم از کم اُسے نہیں تھا۔ وہ کمرے میں آ کر ایک طرف بیٹھ جاتی تھی۔ خاموش اور بیزار۔ کچھ بولتی نہیں تھی۔ ملاقات کا وقت پورا ہونے پر چپ چاپ اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ تین چار دن یوں ہی گزر گئے تھے۔ اُسے بڑا عجیب تھا۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ وہ ناتواں ہو کر بسترِ علالت پر پڑا ہوا ہے۔ کر دٹ تک نہیں لے سکتا۔ ایسی حالت میں بھلا کوئی اس سے خفا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہ تو اتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اس پر ہنسی بھی نہیں آتی۔ چنانچہ وہ بھی نہیں ہنسا تھا۔ حیرت سے اپنی بیوی کو دیکھا تھا اور بیٹے سے پوچھا تھا۔

”کیا بات ہے؟..... کیا ہوا ہے؟“

اُس کی بیوی کے چہرے پر پھیلی خفگی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اُس نے گھور کر اُسے دیکھا، زیر لب کچھ بڑبڑائی اور جواب دیئے بغیر منہ پھیر لیا۔

پھر ملاقات کا وقت ختم ہوا اور اس کی بیوی یوں اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی جیسے جان پہچان تک نہ ہو۔ بیوی کی اس بے رخی پر اسے رنج ہوا۔ پھر ہنسی آئی۔ پہلے اسے صرف رنج ہوتا تھا۔ جب وہ لوگ جو اس کے ارد گرد تھے، ایسی کوئی دآزار حرکت کرتے

تھے تو اُسے رنج ہوتا تھا۔ مگر اب اُس نے ہنسنا بھی سیکھ لیا تھا۔ گو اس میں وقت لگا اور یہ آسان بھی نہیں تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سمجھا لیا کہ ہر شے کی طرح وہ خود بھی ایک تماشا ہے۔ اور خود اپنا ہی تماشا کی بھی۔ لہذا اسے رنج نہیں کرنا چاہئے، صرف تماشا دیکھنا چاہئے اور لطف اُٹھانا چاہئے۔ اپنے ہی زخموں پر نمک پاشی ہوتے دیکھنا، ”اپنوں“ کی ”غیریت“ کا نظارہ کرنا اور اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی، بے رخی اور بے مہری کا تماشا دیکھنا بجائے خود بے حد دلچسپ اور پُر لطف ہو سکتا ہے۔ سنسنی خیز اور پُر جوش۔ آخر کتنے لوگ ہوں گے اس دنیا میں جو خود ہی تماشا بنیں اور خود ہی تماشا کی بھی۔ نہیں، اس کے لئے بڑے جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ ایسا کر سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ یہ وصف اپنے آپ میں پیدا کرے۔ ہر چند کہ یہ بے حد اذیت ناک اور دلآزار کام تھا مگر دھیرے دھیرے اس نے یہ ہنر سیکھ لیا اور اب وہ تماشا دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتا ہے۔

اُس نے ہاتھ اٹھا کر بھیگی آنکھوں کو خشک کیا اور دروازے کی جانب دیکھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ لمبے بھر بعد دروازہ کھلا اور جیکو لین اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر معمول کے مطابق مسکراہٹ تھی۔ اُس نے گرو ویش کا جائزہ لیا، پھر اُسے دیکھا۔ ”ہیلو یگ مین!“ جیکو نے کہا۔ ”کیا بات ہے، کچھ اُداس نظر آ رہے ہو؟“

”نہیں تو..... میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”چائے پیو۔“ جیکو نے کپ اور اسٹرا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ”تم اپنے آپ کو پریشان مت کیا کرو۔ اُداسی کا بوجھ اپنے دل پر لادنا اچھی بات نہیں۔ کم آن، چیئر اپ۔“ جیکو نے سائیڈ کیبنٹ کا جائزہ لیا۔ پانی کا جگ خالی تھا۔ اُس نے جگ اُٹھایا۔ ”میں تازہ پانی لے کر آتی ہوں۔“

”مجھے دوا چاہئے۔“ اس کی آواز میں تھکن تھی۔ ”بہت درد ہو رہا ہے۔“

جیکو نے ہمدردی سے اس کی جانب دیکھا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ مگر ہمت سے کام لو۔ تھوڑے دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ کمزوری رفع ہونے میں کچھ دن تو لگیں گے نا۔“ جیکو نے اس کے پیروں پر کمرل درست کیا، پھر بولی۔ ”چائے پی لو۔ سینڈرا ابھی آتی ہے دوا لے کر۔“

جیکو چلی گئی۔ اُس نے اسٹرا کی مدد سے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور گردن موڑ کر کھڑکی کے بند پردوں کی طرف دیکھا جس کے شیشے یکایک زور سے چمکے اور بادل گرجنے کی لرزہ خیز آواز سے ساری فضا مرتعش ہو گئی تھی۔ انگلستان کے موسم کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ابھی

پُر سکون ہے، دیکھتے دیکھتے بادلوں کی یلغار ہوگی، بھکڑ چلنے لگیں گے اور موسم برشگال ہو جائے گا۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ کچھ دیر پہلے فضا بالکل پُر سکون تھی۔ نہ بارش، نہ ہوا۔ مگر پھر بادل گہرے ہوئے، ہوا تیز ہو گئی اور طوفان باد و باراں شروع ہو گیا۔ بادلوں کی گرج اور ہوا کے بھکڑوں کے شور سے فضا تہ بالا ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے بے شمار پاگل روہیں چیخ چیخ کر ماتم کر رہی ہوں۔ بجلی کڑکتی تو کھڑکیوں کے شیشے چمک اٹھتے۔ پھر بارش کی تیز بو چھاڑ شیشوں کو یوں زور زور سے بجاتی جیسے ماتم کرنے والی پاگل روہیں دستک دے رہی ہوں۔ وہ چپ چاپ لیٹا در ماندہ نظروں سے کھڑکیوں کے پردوں کو دیکھتا رہا۔ جب بجلی کڑکتی اور بادلوں کی گرج گڑا ہٹ بلند ہوتی تو اُس کا دل ہولے ہولے کانپنے لگتا۔

ایک ایک اُس کا دل گھبرانے لگا۔ ایک وحشت سی طاری ہو گئی۔ کمرے کا زندان کچھ اور تنگ ہو گیا اور اس کا دل چاہا کہ چپکے سے اٹھے اور دروازہ کھول کر باہر نکل جائے۔ مگر وہ اٹھ نہیں سکتا تھا۔ ہاں ایک کام کر سکتا تھا، جو وہ اکثر کرتا تھا اور جس سے اسے، کچھ دیر کے لئے ہی سہی، بے حد سکون بھی ملتا تھا اور تحفظ کا احساس بھی۔ چنانچہ اس نے گردن گھما کر دروازے کی جانب دیکھا۔ راہداری میں خاموشی تھی۔ سینڈرا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ چند لمحے اُس نے وارڈ سے آنے والی ہلکی ہلکی آوازوں کو سنا، پھر یکا یک آنکھیں بند کیں۔ ذہن کا دریچہ کھولا اور چپکے سے اپنے ذہن کی دنیا میں اتر گیا۔



یہ دنیا جو اس کے ذہن کے نہاں خانے میں کہیں آباد ہے، بے حد خوبصورت ہے۔ رنگ و نور سے معمور۔ چاروں اور سبز دوب کے قالین بچھے ہیں۔ خوش رنگ و خوش نما پھولوں کے تختے کے تختے حد نظر تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ ٹھنڈے، میٹھے اور شفاف پانی کے چشمے رل ترل کا گیت گاتے ہیں اور خوبصورت پرندوں کی چہکار سے فضا موسیقی ریز رہتی ہے۔ اس دنیا میں کہیں کوئی بد صورتی نہیں ہے۔ اندھیرا نہیں ہے اور خوف بھی نہیں ہے۔ صرف نور ہے۔ امن اور شانتی اور اپنی ذات کا اعتبار۔ وہ اکثر ایسا کرتا ہے کہ جب باہر کی دنیا کے جھوٹ، فریب، دعا اور بے چارگی، بے سہارے پن کے اندھیرے سے ڈر جاتا ہے اور کوئی جائے امان نہیں ملتی ہے تو وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں آباد اس دنیا میں چپکے سے چلا جاتا ہے اور محفوظ ہو جاتا ہے باہر کے ہر عذاب سے۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہا ہے، ہری دوب پر اور شبنم کے ٹھنڈے ریشمی قطرے اس کے تلوہوں کو چوم رہے ہیں۔ وہ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ خوشنما پھولوں اور سبز پتوں کو اور سنتا

ہے جھرنوں کی رل ترل اور پرندوں کی چہکار۔ خوش ہوتا ہے کہ یہ دنیا جو اس کے ذہن میں ہے، کتنی محفوظ و مامون ہے اور باہر کے دکھ اور عذاب چاہیں بھی تو اسے آزار نہیں پہنچا سکتے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ جاتا ہے اور بے حد خوش ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ تب یکایک اس کی نظر اس پر پڑتی ہے۔

وہ ایک بے حد خوب صورت اور پیاری سی بچی ہے۔ سنہری بال، روشن آنکھیں، گلال جیسی رنگت، سر سے پاؤں تک اس کا ریشمی بدن نور میں گندھا ہوا۔ ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ زندگی بلاشبہ نفعی نہیں، اثبات ہے۔ اس کی عمر تین سال ہوگی یا شاید چار سال۔ وہ بچی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں کہ اس کے ذہن نے اس لڑکی کو کیوں تخلیق کیا ہے؟ بس وہ اتنا جانتا ہے کہ وہ معصوم سی لڑکی اس کے ذہن کی دنیا میں رہتی ہے اور پوری دنیا میں وہی ایک اس کی دوست ہے۔

وہ مسکراتا ہے۔ بچی بھی مسکراتی ہے۔
”چلو کھیلیں۔“

”کیا کھیلیں؟“

”آنکھ مچولی۔“

”نہیں.....“ وہ یکایک سہم جاتا ہے۔ ”آنکھ مچولی نہیں۔ کیونکہ آنکھ مچولی میں لوگ چھپ جاتے ہیں۔ پھر انہیں کتنا بھی ڈھونڈ، وہ نہیں ملتے۔ کہیں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے آنکھ مچولی کا کھیل اچھا نہیں لگتا۔“

”لوگ چھپتے ہیں تو پھر ملتے کیوں نہیں؟ کہاں چلے جاتے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ دھیرے سے سانس لیتا ہے۔

”اچھا تو پھر سبز گھاس پر چلیں؟“

”چلو۔“

دونوں گھاس پر چلتے ہیں۔ دھیرے دھیرے پھولوں کو دیکھتے ہوئے، ہنستے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے۔ وہ بار بار بچی کو دیکھتا ہے۔ بچی کے جسم پر سفید سنہری لباس ہے۔ پیروں میں سنہری جوتے اور سفید موزے۔ بالوں میں ہلکا سبز ربن بندھا ہوا۔ اس لباس میں وہ بے حد پیاری لگتی ہے۔ جیسے وہ کوئی ننھی سی پری ہو۔ معصوم اور پاکیزہ اور..... پھر وہ سہم جاتا ہے اور نور سے بچی کو دیکھتا ہے۔ ابھی یہ چھوٹی ہے، مگر وقت گزرے گا اور یہ بڑی ہوگی تو..... بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو کبھی کبھی بالکل بدل جاتے ہیں..... وہ

سہی ہوئی نظروں سے بچی کو دیکھتا ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ اس بچی کو کبھی بڑی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے اندر وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ کیونکہ اگر وہ بڑی ہو گئی تو..... وہ افسردہ ہو کر دھیرے سے سانس لیتا ہے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے۔

یکایک بچی کہتی ہے۔ ”تم تو باہر کی دنیا میں رہتے ہو۔ کیسی ہے وہ دنیا؟“

”وہ دنیا اتنی اچھی نہیں، جتنی یہ ہے۔“ وہ افسردگی سے جواب دیتا ہے۔

”کیوں؟“

”کیونکہ وہاں بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔“

”بڑے ہو جاتے ہیں؟..... کیا مطلب؟“

وہ یکایک چونکتا ہے۔ ”میرا مطلب ہے۔“ وہ کہتا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے اور کیسے؟ وہ رنج بھری نظروں سے بچی کو دیکھتا ہے اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ”تم اس دنیا میں کبھی مت جانا۔ وہاں ہر طرف ہوا میں زہر گھلا ہوا ہے۔ نفرت کا زہر۔ عداوت اور بے انصافی۔ وہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ سب اجنبی اور غیر ہیں اور آستینوں میں خنجر چھپائے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دغا دیتے ہیں اور قتل کرتے ہیں۔ کبھی زبان کے نام پر، کبھی صوبے اور قوم کے نام پر اور کبھی مذہب کے جنون میں۔ وہاں بناتا کوئی نہیں، سب بگاڑنے میں جتے ہوئے ہیں۔ تم وہاں جاؤ گی تو.....“ وہ رک کر زور سے سانس لیتا ہے۔ ”نہیں، تم وہاں کبھی مت جانا۔“

”اچھا، وہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے؟“ بچی حیرت سے کہتی ہے۔

”ہاں۔“

”مگر سب ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ وہ آزدگی سے کہتا ہے۔ ”کہیں نہ کہیں کچھ خرابی ضرور ہے۔ مگر کوئی اس خرابی کو تلاش نہیں کرتا۔ اس کا علاج نہیں کرتا۔ وہاں نہ کوئی رشتہ ہے، نہ دوستی، نہ مروت۔ جب کوئی بیمار پڑ جاتا ہے اور ہسپتال چلا جاتا ہے تو.....“ وہ یکایک چپ ہو جاتا ہے۔

”اچھا خیر چھوڑو۔“ بچی کہتی ہے۔ ”وہ دیکھو کتنا پیارا پھول ہے۔ آؤ پھول گئیں۔“

”گنو.....“

”ایک، دو، تین، چار، پانچ۔“

”دس، گیارہ، بارہ، تیرہ.....“ وہ تیزی سے گنتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ ”مگر پھول تو بہت سارے ہیں۔ ہم کب تک گئیں گے؟“

”اچھا تو پھر تتلیاں پکڑیں۔“

”چلو۔“

یہ ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ جلدی سے واپس لوٹ آیا۔



سینڈرا اندر داخل ہوئی۔ اس نے اُداس نظروں سے سینڈرا کو دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سینڈرا کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کپ تھا جس میں دو آئیں تھیں۔ اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”سوری..... مجھے آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ مصروفیت بہت زیادہ ہے اور آج پارٹ ٹائم نرس بھی نہیں آئی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

سینڈرا نے اس کا کمر درست کیا۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر دوستانہ انداز میں تھپتھا کر بولی۔ ”بہت درد ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔“

”دوا لے لو.....“ سینڈرا نے کہا۔ ”آرام ملے گا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔“

مگر دوا لینے کے بعد بھی اسے آرام نہیں ملا، نہ نیند آئی۔ سارے جسم میں شانوں سے لے کر پاؤں تک درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ پنڈلیوں میں ہلکی ہلکی اٹنھن ہو رہی تھی۔ کمزوری، شدید کمزوری۔ سارا بدن بالکل بے جان سا ہو رہا تھا۔ شکستہ اور ٹوٹا ہوا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کروٹ لے اور دھیرے دھیرے پیٹھ سہلائے۔ کیونکہ پیٹھ میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ کروٹ نہیں لے سکتا تھا، نہ پہلو کے بل لیٹ سکتا تھا۔ چنانچہ الجھن اور درد کی اذیت سے بچنے کے لئے اس نے اپنی توجہ کھڑکی پر مرکوز کر دی۔ بارش بدستور ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی اور بادل بھی گرجتے تھے۔ بارش کی تیز بو چھاڑیشوں پر پڑتی تو ایک عجیب سا شور بلند ہوتا جو اسے اچھا لگتا۔

کچھ دیر تک وہ بارش کے شور کو سنتا رہا، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ راہداری کی لائٹ پہلے ہی بند تھی، اب وارڈ کی بیشتر روشنیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ مریض سونے کے لئے لیٹ چکے تھے اور رفتہ رفتہ خاموشی نے گرد و پیش کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ چند لمحوں خالی اور بے معنی نظروں سے وہ دروازے کو دیکھتا رہا، پھر اس نے زور سے سانس لی اور چپکے سے سائیڈ لیٹ کا سوئچ دبا دیا۔

اب کمرے میں اندھیرا تھا..... خاموشی اور بے سہارا ہونے کا احساس۔ اُسے اندھیرا

اچھا نہیں لگتا تھا اور نہ تنہائی۔ کیونکہ جب اندھیرا ہوتا تو اُداسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی اور بے چارگی اور بچھتاؤ۔ نیند سے محروم آنکھوں کے سامنے یاروں کا میلہ لگ جاتا۔ گئے دنوں کی یادیں۔ اس کی پوری زندگی اور وہ سارے خواب، روشن، خوبصورت اور اُمیدوں سے بھرے ہوئے، جو اس نے لڑکپن میں دیکھے تھے، اور جو پورے نہیں ہوئے تھے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ کہاں اس کا وطن، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، پلا بڑھا تھا اور کہاں انگلستان کا یہ مضافاتی ہسپتال۔ زندگی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے، کہاں کہاں سفر کرتی ہے۔ اس نے تو کبھی اس چھوٹے سے شہر کا نام تک نہیں سنا تھا۔ مگر اب وہ یہاں موجود ہے اور بستر علالت پر پڑا ہوا ہے۔ اکیلا اور اُداس۔ سارا دن اور ساری رات یا تو کھڑکی سے آسمان کو اور بادلوں اور درختوں کو نکتا رہتا ہے اور یا پھر اُس کی آنکھیں راہداری میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ اُس کے بچے روز آتے ہیں اور کبھی کبھی دو چار ملنے والے بھی۔ مگر اور کوئی نہیں آتا اور نہ کسی کا خط آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی کو علم ہی نہیں کہ وہ بیمار ہے۔ اور شاید یہ ٹھیک بھی ہے۔ وہ لوگ جو اسے پیار کرتے تھے، اس کے ماں باپ اور چھوٹا بھائی، وہ آنکھ مجولی کے کھیل میں کہیں چھپ گئے اور وہ انہیں کبھی تلاش نہیں کر پایا۔ اب ایسا کوئی نہیں ہے جو اس کی پرواہ کرے۔ شاید بہت سے رشتے محض ریت کے گھروندے ہوتے ہیں۔ ذرا سی ہوا چلتی ہے اور ٹوٹ جاتے ہیں۔

وہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور بیٹے دنوں کو یاد کرتا رہا۔ اس کے بچپن کے ساتھی اور وہ بڑا سا آگن جہاں وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ طرح طرح کے کھیل اور آنکھ مجولی۔ اُسے چور بنایا جاتا۔ وہ باورچی خانے کی دیوار سے ماتھا ٹیک کر اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جاتا۔ سب ادھر ادھر چھپ جاتے پھر آواز آئی۔
”ڈھونڈو۔“

اسے بہت دن بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ آنکھ مجولی کے کھیل میں کبھی کبھی لوگ اس طرح چھپ جاتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں ملتے۔

اس نے معاً افسردہ ہو کر سانس لی اور ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔

اب تین بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا اور سکوت تھا۔ دارڈ سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اُس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا، پھر اخبار اٹھایا۔ اُردو کا انٹرنیشنل ایڈیشن۔ مگر پورا اخبار طرح طرح کی دلازار خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ قتل، ڈکیتی، آتشزنی، ہنگامے اور مظاہرے۔ لیکن امن نہیں ہے۔ زندگی بے حد بے قیمت اور بے اعتبار ہو چکی ہے۔ اس نے تھک کر اخبار رکھ دیا اور دروازے کی جانب دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب جبکی آئے گی۔ دراصل یہ

اس کے اور جیکی کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا تھا۔ نصف رات کے بعد جب بھی اسے تکلیف زیادہ محسوس ہوتی اور چائے کے لئے دل چاہتا تو وہ لیپ جلا دیتا اور جیکی چند ہی منٹ میں چائے لے کر آ جاتی۔

چند منٹ گزرے، پھر قدموں کی چاپ ابھری، دروازہ کھلا اور جیکی کا فریبہ جسم اور مسکنا چہرہ نظر آیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور ہونٹوں پر روشن مسکراہٹ۔ ”ہیلو مائی ڈارلنگ! چائے چاہئے؟“ جیکی نے کہا۔

”ہاں..... بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس کی آواز میں پڑمردگی تھی۔

”میں ٹیبلٹ بھی لائی ہوں۔ لے لو، آرام ملے گا۔“

اس نے دو گولیاں حلق سے اتاریں، پھر گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔ جیکی نے اس کا کمبل درست کیا۔ دو بوتلیں بھر گئی تھیں، جیکی نے انہیں ہاتھ روم میں خالی کر کے ڈسٹ بن میں پھینکا۔ اس دوران وہ باتیں بھی کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ شاید وہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنی جوانی کے دو ایک قصے سنائے۔ اسپین اور برمودا کا ذکر کیا جہاں وہ کئی بار ہالی ڈے پر گئی تھی۔ اور پھر اپنے شوہر کے بارے میں بتایا جس سے وہ فرانس میں ملی تھی اور پہلی ہی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ پھر یکایک اُس نے کہا۔

”تم نے بھی کسی سے محبت ضرور کی ہوگی۔ ہے نا؟“

وہ یکایک حیران ہوا۔ یہ جیکی نے کیا کہہ دیا؟ اُس نے افسردہ نظروں سے جیکی کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

”ہاں..... میری اماں نے.....“

”نہیں..... میرا مطلب ہے۔“ جیکی نے وضاحت کی۔ ”تم سے کسی نے عشق ضرور کیا ہوگا۔“

”نہیں۔“ اُس کی آواز میں دل کے ٹوٹنے کی بازگشت تھی۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کسی بھی قسم کی محبت مجھ سے کبھی کسی نے نہیں کی۔ سوائے اماں کے۔ میرے ارد گرد جو لوگ ہیں اور میری زندگی میں شامل ہیں، میں نے ان سے محبت کی اور بہت کی مگر..... جب کوئی کسی کو چاہتا ہے تو کیسا لگتا ہے، مجھے نہیں معلوم۔“ وہ لکھت اداس ہو کر چپ ہو گیا۔

”تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ ہے نا؟ خیر، کوئی بات نہیں۔“ جیکی نے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”اتنے اداس مت ہوا کرو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ یہ دکھ اور تکلیف محض چند دن کی ہے۔ پھر تم اچھے ہو جاؤ گے اور اپنے گھر چلے جاؤ گے۔ تمہیں اب تک کسی نے نہیں چاہا

تو کیا ہوا؟ یہ اختتام نہیں ہے۔ آنے والے کل میں تمہیں کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا جو تمہیں چاہے گا اور خوشیوں سے تمہیں سرشار کر دے گا۔“

وارڈ میں کسی نے گھنٹی بجائی تھی۔ چنانچہ جیکلی چلی گئی۔ اس نے لیمپ بجھا دیا۔ اب کمرے میں پھر اندھیرا تھا اور دلازار خاموشی۔ وہ سونے کی کوشش کرتا رہا۔ چائے سے کافی سکون ملا تھا اور درد میں بھی کچھ کمی ہو گئی تھی۔ مگر نیند پھر بھی نہیں آئی۔ لمبے گزرتے گئے۔ گھڑی کی سوئیوں کا سفر جاری رہا۔ وہ بے آرام آنکھوں سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھتا رہا۔ پھر تھک گیا تو اس نے وہی کیا جو اکثر کرتا تھا۔ چپکے سے تصور کا دروازہ کھولا اور اس ننھی سی بچی کے پاس چلا گیا جو اس کے ذہن کی دنیا میں رہتی ہے۔

رات دھیرے دھیرے گزری، دبے قدموں، بے آواز۔ ساڑھے چھ بجے اُسے سینڈرا نے دوا کی پانچ گولیاں دیں۔ سات بجے چائے دی گئی۔ پھر رات کی شفٹ ختم ہو گئی۔ جیکلی اور سینڈرا چلی گئیں۔ وہ چپ چاپ لیٹا وارڈ سے آنے والی آوازیں سنتا رہا۔ باتوں کی آوازیں، برتنوں کی آوازیں۔ زندگی جاگ پڑی تھی اور اپنے ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ وہ مانوس آوازوں کو پہچانتا رہا۔ این نے کسی کو پکارا، پھر کیتھی کی آواز آئی۔ پھر کسی مریض نے اونچی آواز میں کہا۔ ”آئی وانٹ ٹو گو ٹو باتھ روم۔“

وہ یکایک دھیرے سے مسکرایا۔ باوجود اس کے کہ درد کی افیت اسے بے آرام کر رہی تھی۔ وہ آوازیں اسے اس سے نہ جانے کیوں اچھی لگیں۔ ایک سکون سامحوس ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی سہلائی اور پھر آوازوں کی جانب کان لگا دیے۔ این نے اونچی آواز میں ٹریسی سے کچھ کہا۔ جواب میں ٹریسی کی آواز آئی۔

”میں احمد کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“

چند منٹ بعد ٹریسی کمرے میں داخل ہوئی۔ حسب معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں روشنی۔ اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”کیسے ہوا احمد؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس کی آواز سے شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”پھر وہی مایوسی۔“ ٹریسی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں کتنا سمجھاتی ہوں، اس طرح اُداس اور مایوس ہونا اور دل چھوٹا کرنا اچھی بات نہیں۔ مگر تم سمجھتے ہی نہیں۔“ ٹریسی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا، بالوں میں انگلیاں پھیریں، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ جبکہ اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ چپ رہا اور غور سے ٹریسی کو دیکھتا رہا۔ ٹریسی بہت خوب صورت تھی۔ شفاف رنگت، ترشا ہوا ناک نقشہ، بڑی بڑی دھمکی ہوئی

نبلی آنکھیں اور گھٹے بھورے بال۔ دوسری تمام نرسوں کے مقابلے میں ٹریسی اس کی دیکھ بھال زیادہ کرتی تھی۔ اس کے پاس زیادہ وقت گزرتی تھی اور اس کے زیادہ تر کام خود کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے شبہ سا ہوتا کہ شاید ٹریسی کے دل میں اس کے لئے کوئی نرم گوشہ ہے۔ شاید ایسا تھا یا شاید یہ محض اس کا وہم تھا۔ لیکن اگر وہم تھا تو بھی اسے اچھا لگتا تھا اور وہ اپنے ذہن سے اس وہم کو نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

ٹریسی نے اس کا مکمل درست کیا، پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔
 ”کتنا اندھیرا ہو رہا ہے۔ ابھی تک پردے نہیں کھولے گئے؟“
 ”ہاں، کوئی آیا ہی نہیں۔“

ٹریسی نے آگے بڑھ کر دونوں کھڑکیوں کے پردے سرکائے۔ اس نے باہر نظر ڈالی۔ بارش ہر چند کہ دیر ہوئی بند ہو چکی تھی مگر آسمان بدستور تاریک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اس بناء پر صبح ہو جانے کے باوجود چاروں اور ایک سیاہ، ویران، اُداس دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ ٹریسی نے کھڑکی سے باہر گرد و پیش میں نظر ڈالی، پھر آہستہ سے بولی۔ ”کتنا اندھیرا ہے۔“

”ہاں..... زندگی میں بہت اندھیرا ہے۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔
 ٹریسی نے چونک کر اسے دیکھا اور چند لمحے بہت غور سے دیکھتی رہی، پھر گردن موڑ کر سیاہ بادلوں پر نظر ڈالی اور صاف اور پُر یقین لہجے میں بولی۔
 ”مگر اندھیرے کے دوسری طرف ہمیشہ روشنی رہتی ہے۔“

پھر ٹریسی چلی گئی۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور مایوس، افسردہ اور تنہی ہوئی نظروں سے باہر سیاہ بادلوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شک و شبہ تھا اور پس و پیش۔
 کیا واقعی اس تاریکی کے دوسری طرف روشنی ہے.....؟



دروازہ

کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ سبزی کاٹتے کاٹتے سعدیہ نے گردن گھما کر اندر لونگ روم میں نظر ڈالی۔ شازیہ اُردو کی کتاب، جو وہ اس کے لئے لائبریری سے لائی تھی، پڑھنے میں جتی ہوئی تھی۔ اسے یکایک بے حد اچھا لگا۔ محسوس ہوا، وہ تھکن جو اس پر دیر سے طاری تھی، کچھ ہلکی ہو گئی ہے۔ اس نے ابتداء سے ہی کوشش کی تھی کہ شازیہ اُردو سیکھے۔ وہ روزانہ باقاعدگی سے اسے اُردو پڑھاتی تھی اور اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ شازیہ گھر میں انگریزی بولنے سے پرہیز کرے اور صرف اُردو میں بات کرے۔

وہ شب و روز مشاہدہ کرتی تھی کہ انگلستان میں آباد ایشیائی افراد، خاص طور پر بچے، اُردو سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی انگریزی میں چیر چر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے والدین، جن میں سے اکثر دیہاتوں سے آئے ہیں اور خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہیں کہ ان کا بچہ انگریزی بول رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ خود بھی لنگڑی لولی انگریزی میں اپنے بچوں سے بات کرتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ سعدیہ کو اس صورت حال سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کے ذہنی رویے کو سمجھنے کی کوشش کرتی مگر ماسوا الجھن کے کچھ ہاتھ نہ آتا۔

وہ انگریزی کے خلاف نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ جب برطانیہ میں رہنا ہے تو انگریزی سے شناسائی ضروری ہے۔ تاہم یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ انگریزی اپنانے کے لئے اُردو یا اپنی مادری زبان سے رشتہ توڑنے کا کیا جواز ہے؟ ارے بھئی بچے اسکول جائیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے تو خود بخود انگریزی سیکھ جائیں گے۔ لیکن اُردو اور اپنی مادری زبان سکھنے کے لئے تو خود کوشش کرنا ہوگی۔ تاکہ اپنی تہذیب سے، اپنی تاریخ سے، اپنی معاشرتی قدروں سے اور اپنی زبان سے ناتا جڑا رہے۔ اپنی ایک پہچان باقی رہے۔ انگلستان کی فضاؤں میں رچ بس کر اپنی شناخت کھونا اور بے چہرہ ہونا تو نری حماقت ہے۔ مگر یہ نکتہ اکثریت فراموش کر چکی تھی۔ سعدیہ کے واقف کاروں میں دو تین خواتین،

حضرات مدرس تھے۔ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ مگرستم یہ تھا کہ ان کے اپنے گھروں میں صبح شام انگریزی گوشتی تھی۔ حتیٰ کہ مدرس صاحب یا صاحبہ خود بھی اپنے بچوں سے انگریزی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

لیکن سعدیہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے شروع سے ہی شازیہ کو اُردو سیکھنے کے لئے مسجد بھیجا تھا اور گھر پر بھی باقاعدگی سے پڑھاتی تھی۔ اس نے شازیہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ بڑی ہو کر جب وہ علاوہ دوسرے مضامین کے اُردو میں بھی اے لیول کا سرٹیفکیٹ حاصل کرے گی تو وہ اسے سونے کی گھڑی تحفے میں دے گی۔ شازیہ صرف آٹھ سال کی تھی اور اپنی ماں کی اس خواہش کے پس منظر کو سمجھنا ابھی اس کے لئے قدرے مشکل تھا۔ لیکن وہ بہت ہونہار تھی۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی تھی اور کم عمر ہونے کے باوجود اپنی ماں کے دکھوں کو، اگر پوری طرح نہ سہی، تو کافی حد تک سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں نے ان گنت مصائب جھیلے ہیں۔ وقت اور حالات کے جبر کا تنہا بڑی پامردی سے سامنا کیا ہے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی ماں کی شانہ روز مشقت اور جدوجہد کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ان تمام محرومیوں اور مایوسیوں سے محفوظ رکھ سکے جن سے وہ خود دوچار رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ دل لگا کر اُردو پڑھتی تھی اور گھر میں صرف اُردو بولتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس سے اس کی ماں کو خوشی حاصل ہوگی۔

سبزی چڑھانے کے بعد سعدیہ نے دال کا جائزہ لیا۔ پانی کم ہو گیا تھا مگر دال ابھی گلی نہیں تھی۔ نمک بھی کچھ کم محسوس ہوا۔ اس نے ہانڈی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور دو چٹکی نمک، پھر آنچ دھیمی کر کے لونگ روم میں آگئی۔

ذہنی سہ پہر کی نارنجی دھوپ کھڑکی سے اندر آرہی تھی اور پورا کمر روشن ہو گیا تھا۔ مگر اس روشنی نے کمرے کی خستہ حالی بھی نمایاں کر دی تھی۔ وال پیپر کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ کہیں کہیں سے کاغذ اکھڑ بھی گیا تھا۔ یہی حال قالین کا تھا۔ نہ صرف بھدا اور بدرنگ ہو گیا تھا بلکہ جگہ جگہ سے گھس بھی گیا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ میلا ہو کر اپنی آب و تاب کھو چکا تھا۔

سعدیہ نے صوفے پر بیٹھ کر گرد و پیش پر نظر ڈالی اور غیر ارادی طور پر ایک طویل سانس لی۔ اسے معلوم تھا۔ کمرے کو نئے سرے سے آراستہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ نیا پیپر لگانا چاہئے، نئے رنگ و روغن کی ضرورت ہے اور قالین بھی تبدیل ہونا چاہئے۔ وہ چاہتی بھی تھی کہ لونگ روم کو ہی نہیں، پورے گھر کو از سر نو سبائے مگر کیا کرنی، یہ اس کے لئے سہ دست حد درجہ مشکل تھا۔ خواہش اور کوشش کے باوجود وہ اتنی پخت کہی نہیں کر سکی تھی کہ

گھر کی آرائش کا ہزار بارہ سو پاؤنڈ کا خرچ برداشت کر سکے۔ روزمرہ کے اخراجات کا بوجھ تو سر پر تھا ہی، ساتھ ہی ہر ماہ اسے ایک مناسب رقم اماں کو بھیجنا پڑتی تھی۔ ابا کے اچانک انتقال کے بعد وہ خاصی پریشان ہو گئی تھیں۔ ہر چند کہ اس کا بھائی وہاں موجود تھا مگر کم آمدنی اور اپنی بد مزاج بیوی کے باعث وہ اماں کی کفالت کرنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ ان کے اخراجات کی ذمہ داری بھی اس کے سر آ پڑی تھی۔ ان حالات میں اتنی بچت ممکن ہی نہیں تھی کہ وہ گھر کو سجانے کے بارے میں سوچ بھی سکتی۔

شازیہ نے کتاب پڑھتے پڑھتے معاً نظریں اٹھائیں، اُسے دیکھا، پھر بولی۔ ”اماں! کیا بات ہے؟ تھک گئی ہیں؟“

”ہاں چند! پتا نہیں کبھی کبھی تھکن کیوں ہو جاتی ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ سلائی کا کام ہے ہی تھکا دینے والا۔“

”تو پھر آپ اتنا کام کیوں کرتی ہیں؟ سینیچر کو بھی کام پر چلی جاتی ہیں۔“

”کام تو کرنا پڑے گا شازیہ!“ وہ ہولے سے نہی۔ ”ورنہ کام کیسے چلے گا؟“

”نو کری چھوڑ دیجئے۔ آپ کو بنی فٹ مل جائے گا۔ میری ایک دوست کی امی کو تو ملتا ہے۔“

سعدیہ نے محبت سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اسے اچھا لگا کہ اس کی بیٹی کو اس کی پریشانیوں کا احساس ہے۔ لمحہ بھر رک کر کہنے لگی۔

”بیٹا! میں تو جزوقتی کام کرتی ہوں۔ چار گھنٹے روزانہ۔ اس لئے سینیچر کو بھی کام پر چلی جاتی ہوں۔ اگر نہ جاؤں تو بڑی مشکل ہوگی۔ رہ گیا بنی فٹ تو وہ مجھے مل تو سکتا ہے لیکن

پھر جاب سنٹر والے آئے دن تنگ کریں گے۔ ملازمت تلاش کرنے کے لئے کہیں گے۔

وہاں شرمندہ ہونے سے کیا فائدہ؟ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں جو لوگ صحت مند ہیں اور کام

کر سکتے ہیں، انہیں محنت کر کے زندگی گزارنی چاہئے۔ بنی فٹ پر رہنا مناسب نہیں۔“

شازیہ شاید اس کی بات پوری طرح نہ سمجھی ہو، مگر اس نے بحث نہیں کی۔ سر ہلا کر

بولی۔ ”یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

”مگر مجھے کوئی پریشانی یا شکایت نہیں ہے۔“ سعدیہ نے ہنس کر کہا۔ ”تم بڑی ہو جاؤ،

پھر انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شازیہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سعدیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ہولے

ہولے دونوں گھٹنوں کو دبایا۔ مگر گھٹنوں ہی میں نہیں، پورے بدن میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔

۱۷ سب شکستہ ہو رہے تھے اور جوڑ جوڑ پر ایک خشکی سی طاری تھی۔ حالانکہ صرف چار گھنٹے

مشین پر بیٹھی تھی، پھر بھی غیر معمولی تھکن ہو گئی تھی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ چار گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی پوری طرح چاق و چوبند رہتی تھی۔ بس تبھی کبھی ایسا ہوتا کہ چار گھنٹے سلائی کر کے گھر آتی تو تھکن سے مغلوب ہوتی۔ یوں لگتا جیسے میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آئی ہو۔ جسم کا ایک ایک عضو کھنکھنے لگتا۔

’پینا ڈول لینا چاہئے‘ یکا یک اس نے سوچا۔ ’یہ تھکن کم بخت تبھی اترے گی۔ اٹھنے لگی تو شازیہ نے کہا۔“کیا بات ہے اماں؟“

سعدیہ نے پینا ڈول کا ذکر کیا تو شازیہ پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اماں! میں لاتی ہوں۔ چائے بھی بنا دوں؟“

وہ چپ چاپ بیٹھی پُر طمانیت اور محبت بھری نظروں سے شازیہ کو دیکھتی رہی۔ گو وہ صرف آٹھ سال کی ہے لیکن اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا بساط بھر ہاتھ بٹاتی ہے۔ برتن مانجھ لیتی ہے، ہوور لگا لیتی ہے اور اکثر اپنے لئے ناشتا بھی خود ہی تیار کر لیتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے پھرتی سے ایک کپ چائے تیار کی، ماں کو دو گولیاں اور پانی کا گلاس دیا۔ اس نے گولیاں حلق سے اُتار لیں تو چائے کا کپ ماں کے سامنے میز پر رکھ کر پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس نے چائے کے دو تین گھونٹ لئے تو ایک سکون سا محسوس ہوا۔

یکا یک شازیہ نے کہا۔ ”اماں! آپ نے خط نہیں پڑھا؟“

وہ معاً زور سے چونکی اور میز پر پڑے ازمیل لفافے پر نظر ڈالی۔ اماں کا خط تھا اور صبح کی ڈاک سے آیا تھا۔ وہ کام پر جانے کی جلدی میں تھی اس لئے پڑھ نہ سکی۔ واپس آنے کے بعد بھی اس نے لفافے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کچھ کھانا پکانے کی مصروفیات پر بناء پر اور کچھ اس کارن کہ اس خط کو پڑھنے کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔ ایک خوف سادل میں جا گزیں تھا، اور تذبذب۔ کیا جواب دے گی اماں کو؟ انہوں نے حسب معمول وہی باتیں لکھی ہوں گی جو ہر بار لکھتی ہیں۔ وہ ہر بار یا تو جواب دینے سے گریز کرتی ہے اور یا پھر جھوٹ بولتی ہے۔ وہ چند ثانئے لفافے کو گھورتی رہی، پھر طویل سانس لے کر بولی۔

”پڑھ لوں گی ابھی۔“

”نانی کا خط ہے نا.....؟“ شازیہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اور آپ ڈر رہی ہیں کہ نانی نے پھر ابو کے بارے میں لکھا ہوگا۔ اس لئے آپ خط

نہیں پڑھ رہی ہیں۔“

سعد یہ ایک بار پھر چونکی۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں اپنی بیٹی پر جم گئیں۔ یہ کیا کہہ دیا شازیہ نے؟ اسے ایسی بات نہیں کہنی چاہئے۔ وہ تو ابھی بچی ہے۔ اسے ان باتوں کا وقوف اور شعور کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر نہیں، وہ بے شک آٹھ سال کی ہے لیکن بہت ذہین ہے اور بہت سی باتوں کو سمجھ لیتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی ماں ایک جھوٹ کے سہارے آج تک اس کی نانی کو دھوکا دیتی رہی ہے۔ اُس نے یکا یک ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا، ہونٹوں پر زبان پھیری اور شازیہ کی طرف دیکھا۔ شازیہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر ان نظروں میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی بلکہ ہمدردی اور محبت تھی اور ایک سوال۔ یہ سوال دو ایک بار پہلے بھی کیا تھا مگر وہ ٹال گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے وضاحت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چند لمحے چپ رہی اور اندرونی کشمکش پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر لفافہ چاک کرتے ہوئے بولی۔

”تم جانتی تو ہو۔“

اس نے خلاء پر نظریں دوڑانی شروع کیں تو شازیہ نے یکا یک کہا۔

”اماں! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”آپ نانی کو بتا کیوں نہیں دیتیں کہ ابو ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔“

معاوہ زور سے چونکی اور سر اسیمہ نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی۔

چھ سال بیٹے۔

ایسا ہی ایک دن تھا۔

جب اس نے گھر کا دروازہ کھولا تھا اور صفدر سے کہا تھا۔

”نکل جاؤ اس گھر سے۔“

اُس کے ابا منظور علی نے گواپنی دانست میں اچھا ہی کیا تھا۔ بیٹی انگلستان چلی جائے گی، اس کی زندگی سنور جائے گی، ان محرومیوں سے محفوظ رہے گی جن میں ان کی اپنی ساری زندگی گزر گئی۔ وہ ایک سیدھے سادھے صوفی منش آدمی تھے۔ صبر و شکر اور قناعت میں ساری زندگی بسر کی تھی۔ جو کچھ میسر تھا، اسے ہی غنیمت جانتے تھے۔ مگر دنیا کے ہر باپ کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کے دونوں بچوں کی شادیاں عزت و آبرو سے اچھے گھرانوں میں ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب صفدر کا رشتہ آیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

صفر کئی سال سے انگلینڈ میں تھا اور وہاں کی شہریت بھی حاصل کر چکا تھا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بوڑھی ماں تھی اور چچا چچی تھے۔ سعدیہ کے ابا یہ سوچ کر مسرور ہوئے کہ بیٹی انگلینڈ چلی جائے گی اور وہاں ایک خوشحال اور پُر مسرت زندگی بسر کرے گی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر دل میں تذبذب کا ایک بھنور بھی موجود تھا۔ فاصلہ بہت ہے اور پھر نیا ملک۔ کون جانے کیا حالات ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو، ان کی بیٹی مشکلات میں پڑ جائے۔ مگر ان کے دوست برکت اللہ نے اطمینان دلایا کہ لڑکا شریف اور نیک ہے اور یہ کہ برکت اللہ لڑکے کے چچا وغیرہ کو کافی عرصے سے جانتے ہیں تو اس کے ابا کو اطمینان ہو گیا۔

برکت چچا کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ واقعی مطمئن تھے کہ لڑکا اچھا ہے۔ مگر درمیان میں پانچ ہزار میل کا فاصلہ تھا اور انہیں شاید یاد نہیں رہا تھا کہ جو شے فاصلے پر چمکتی ہے وہ کبھی سونا نہیں ہوتی۔ یہ انکشاف سعدیہ پر ہوا۔ جب وہ انگلستان پہنچی۔ پتا چلا کہ جو اطلاعات اس کے ابا کو دی گئی تھیں، ان میں سچائی برائے نام بھی نہیں تھی۔ صفر کا گھر چھوٹا سا تھا اور وہ بھی مقامی کونسل کی ملکیت تھا اور صفر نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ گھر میں معمولی فرنیچر اور چند ایک بدنما برتن بھاڑے تھے۔ سعدیہ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم صبر کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

اس نے اماں ابا کو کچھ نہیں لکھا کہ انہیں صدمہ پہنچتا۔ وہ دونوں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کی بیٹی انگلستان میں بہت خوش ہے۔ جب کہ اس کے شب و روز خوف اور تذبذب میں گزر رہے تھے۔ صفر کے چہرے پر کئی نقائیں چڑھی ہوئی تھیں جو وقت گزرنے پر رفتہ رفتہ اتریں۔ پہلی نقاب اس روز اُتری جب وہ شراب کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا گھر آیا۔

”تم نے شراب پی ہے.....؟“

صفر نے سرخ نظروں سے اسے دیکھا اور ہونٹ کھینچ کر مسکرایا۔

صدے اور خوف سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ”بولتے کیوں نہیں؟“

صفر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ”بھئی یہ انگلستان ہے۔ شراب تو یہاں سب ہی پیتے

ہیں۔ رواج ہے یہاں کا۔ میں نے کوئی نئی بات تو نہیں کی۔“

”لیکن.....“

”کیا لیکن.....؟“ صفر چڑ کر غصے سے بولا۔ ”تم اپنی دقیانوسی باتیں اپنے پاس رکھو

اور میرے معاملات میں دخل مت دو۔ سمجھیں۔ میں شراب پیتا ہوں تو کیا تمہیں تو کوئی

تکلیف نہیں دے رہا ہوں۔“

مگر شراب تو پہلی نقاب تھی۔ دوسری نقاب اُنھی تو منکشف ہوا کہ صفدر کو جوئے کی لت بھی ہے۔ نہ صرف دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر تاش کا جو اکھیلتا ہے بلکہ گھوڑوں، اور کتوں کی ریس کا بھی شوقین ہے۔ تیسری نقاب سر کی تو صفدر کے مزاج کا ایک نیا رخ سامنے آیا۔ یہ رخ اس کی بد مزاجی کا تھا۔

وہ تین راتیں لگاتار دیر سے گھر آیا۔ سعدیہ نے کھانے کے لئے پوچھا تو جواب دیئے بغیر اسے گھورتا ہوا اوپر خواب گاہ میں چلا گیا۔ جب چوتھی رات بھی اس کی واپسی ایک بجے کے بعد ہوئی تو سعدیہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ کچھ ترشی، کچھ غصے سے اس نے کہا۔

”یہ ہر روز اتنی رات تک کہاں رہتے ہو؟“

صفدر نشے میں تھا اور کچھ جھنجھلایا ہوا بھی۔ شاید جوئے میں ہارا ہو گا۔ سعدیہ کی بات سنتے ہی چراغ پا ہو گیا۔

”بکواس مت کرو..... مجھ سے جواب طلبی کی تو اچھا نہ ہو گا۔“

لیکن سعدیہ چپ نہیں ہوئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ خاموشی خود اس کے لئے باعث تکلیف بنے گی۔ صفدر کا حوصلہ بڑھے گا اور اس کا رویہ مزید خراب ہو گا۔ تھوڑی بہت روک تھام ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے مزید جرح کی۔ بات بڑھی اور بگڑ گئی۔ صفدر نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ تھپڑ منہ پر پڑا تو سعدیہ کے جسم میں خون کا ایک ایک قطرہ جم گیا۔ وہ ہکا بکا ہو کر صفدر کو دیکھتی رہی۔ گمان تک نہیں تھا کہ صفدر اس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ صفدر گالیاں بکتا اور دھمکیاں دیتا ہوا اوپر چلا گیا۔

اس رات پہلی بار سعدیہ ویر تک روئی۔

چوتھی نقاب کا نام غیر ذمے داری تھا۔ صفدر کو گھر کے مسائل و معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اخراجات کے لئے جو رقم دیتا، وہ ہر چند کہ کافی نہیں تھی، پھر بھی آئے دن مین میخ نکالتا رہتا۔ سعدیہ ایک ایک پینی سوچ سمجھ کر خرچ کرتی۔ چند ایک بار اُس نے اس ضمن میں صفدر سے بات کی، مگر بے سود۔ صفدر سوطر ح کے بہانے تراشنے لگتا۔ اگر اتفاقاً کبھی پانچ، دس پاؤنڈ دیتا بھی تو دوسرے دن دو چار پاؤنڈ واپس لے لیتا۔ سعدیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ بہت اذیت بھرے دن تھے وہ۔ گھر میں گوشازیہ کا اضافہ ہو چکا تھا مگر صفدر کو بچی کی بھی چنداں پرواہ نہیں تھی۔ سعدیہ ایک مسلسل عذاب اور بے یقینی میں مبتلا رہتی۔ اس تھکے ہارے مسافر کی طرح جو دورا ہے پر کھڑا ہو اور طے نہ کر پا رہا ہو کہ

کدھر جائے۔

ایک طرف صفدر کی بے اعتنائی اور غیر ذمے داری تھی اور دوسری طرف اماں ابا کے خط۔ وہ بدستور اسی خوش گمانی میں مبتلا تھے کہ ان کی بیٹی انگلستان میں بہت خوش و خرم ہے۔ کیا کرے وہ؟ کس کو سنبھالے، کس کو بہلائے۔ اپنے والدین کی خوش فہمی کی ذمہ دار کافی حد تک وہ خود ہی تھی کہ اس نے انہیں کبھی اپنے دکھ اور مسائل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے آرام و آسائش کی جھوٹی کہانیاں انہیں لکھا کرتی تھی۔ جانتی تھی، یہ کہانیاں سن کر وہ بہت خوش ہوں گے۔ اب اگر اس کے اماں ابا کو اس کی ذات سے اسی بہانے تھوڑی سی خوشی مل جائے تو کیا حرج ہے۔ مگر وہ خود کیا کرے۔ اپنے دامن کے لئے ذرا سی خوشی اور ہونٹوں کے لئے ایک چھوٹی سی مسکراہٹ کہاں سے لائے؟

جس شہر میں وہ رہتی ہے، اس کے مرکزی بازار میں بہت خوبصورت اور پُر شکوہ سڑکیں ہیں۔ ہر سڑک پر شیشوں کے شفاف شوکیسوں والی عظیم الشان دکانیں قطار در قطار کھڑی ہیں جن میں دنیا کی ہر شے مل جاتی ہے۔ کپڑے، ظروف، اشیائے آرائش و زیبائش اور جواہرات۔ حتیٰ کہ ہیرے موتی بھی مل جاتے ہیں۔ مگر کوئی دکان، کوئی سپر اسٹور مسرت بیچتا ہے نہ مسکراہٹ اور نہ دل کا سکون اور روح کی آسودگی۔ ایسا کیوں ہے؟ کہیں کوئی دکان ایسی بھی تو ہونی چاہئے جہاں خوشی بکتی ہو۔ شوکیسوں میں ننھی ننھی، دھمکتی مسکراہٹیں اور چھوٹے چھوٹے روشن قہقہے سجے ہوں اور خوش رنگ مرتبانوں میں سکون، بے فکری اور آسودگی ترتیب سے رکھی ہوں۔ لوگ آئیں، دکھوں کے مارے، بے آسرا، غمزدہ، محروم، راندہ درگاہ، دریدہ و در ماندہ لوگ آئیں اور حسب ضرورت ایک پیاری سی مسکراہٹ، ایک چھوٹا سا قہقہہ، دل کا تھوڑا سا سکون یا مٹھی بھر آسرا خرید کر چلے جائیں۔ لیکن کیا کیا جائے؟ اس کرۂ ارض پر ایسی دکان کہیں نہیں ہے۔ آدمی سب کچھ بیچتا ہے۔ زر و جواہر، ریشم و کم خواب، اقتدار و اختیار، دین و دنیا اور ایمان حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی بیچتا ہے اور اپنے خدا کی تجارت بھی کرتا ہے۔ مگر اک ذرا سی خوشی نہیں بیچتا۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کہاں اپنا خالی دامن لے کر جائے؟ ایک چنگی بھر خوشی اسے جس دکان سے مل سکتی ہے وہ دل کی دکان ہے اور اس کا مالک صفدر ہے۔ مگر صفدر نے تو دکان بند کر کے تالا ڈال دیا ہے۔ اب نہ جانے کب وہ دکان کھولے؟ کھولے گا بھی یا نہیں؟ کون جانے، وہ دکان کھولے ہی نہ۔ تو پھر کیا کرے؟..... کہاں جائے؟

لیکن بات شراب، جوئے، اخراجات کی پریشانی اور ناروا سلوک تک ہوتی تو شاید وہ کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیتی کہ اس دنیا میں بے شمار عورتیں ہیں، جن کے شوہروں نے

دکانیں بند کر کے تالے ڈال رکھے ہیں، پھر بھی وہ صبر و ضبط سے کام لیتی ہیں اور زیست کر لیتی ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ پھر ایک دن ایک اور نقاب اٹھی۔ پانچویں نقاب۔ اُس نے صفدر سے پوچھا۔

”یہ سوزی کون ہے.....؟“

”میری گرل فرینڈ۔“

یہ بات صفدر نے اس طرح کہی، گویا موسم پر اظہار خیال کر رہا ہو۔ ”آج سردی کچھ زیادہ ہے۔“ سعدیہ کے رگ و ریشے میں ایک تیز، گرم رو دوڑتی چلی گئی۔ دل پہلے تو ایک بل کے لئے ڈوبا، پھر یوں زور سے دھڑکا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کا سہارا لیا اور تیز نظروں سے صفدر کو گھورا۔

”گرل فرینڈ.....؟“

”ہاں.....“

سعدیہ نے سر کو زور سے جھٹکا۔ ”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم شادی شدہ ہو۔ گھر میں بیوی اور بچی ہے۔ پھر یہ گرل فرینڈ.....؟“

صفدر اس وقت بھی کچھ نشے میں تھا، لاپرواہی سے ہنسا۔ ”بھئی یہ انگلستان ہے۔ یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”مگر میں انگلش نہیں ہوں۔ میرے گھر میں ایسا نہیں ہوگا۔“ سعدیہ نے غصے سے کہا۔ ”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔“ صفدر نے سگریٹ سلگائی۔ ”تم گھر میں آرام سے رہو۔ باہر میری دلچسپیاں کیا ہیں، اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے بھی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دے رہا ہوں۔“

”تم نے آج تک کوئی خوشی بھی مجھے نہیں دی ہے۔“ سعدیہ تلخی سے بولی۔ ”اور اب اوپر سے یہ گرل فرینڈ۔“

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟“

”تم جانتے ہو۔“

”جو کچھ تم چاہتی ہو، وہ تو خیر نہیں ہو سکتا۔“

ایک بار اتفاقاً طور پر سعدیہ نے سوزی کو دیکھا۔ وہ کچھ سودا سلف خریدنے مارکیٹ گئی تھی، تبھی اس پر نظر پڑی تھی۔ گوا سے پہچانتی نہیں تھی مگر صفدر ساتھ میں تھا اور جس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر چل رہے تھے اس سے سعدیہ کو قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ سوزی ہی ہو سکتی ہے۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر سعدیہ کو افسوس ہوا۔ اس لئے

نہیں کہ سوزی وہ عورت تھی جو صفدر نے اس پر مسلط کی تھی بلکہ افسوس صفدر کے ذوق اور حُسنِ نظر پر ہوا۔ سوزی کا چہرہ لبو ترا تھا اور اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ گال پیچکے ہوئے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ناک قدرے بیٹھی ہوئی، سر کے بال بھی چھوٹے تھے اور جنگل کی خشک گھاس کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے۔ قد درمیانہ اور بدن چھریا۔ نصف آستین کا سیاہ تنگ بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنے تھی۔ سعدیہ کو اس کی نگلی ٹانگیں دیکھ کر اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ اس کی ٹانگیں کسی بھی لحاظ سے دلکش نہیں تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں سلتی ہوئی سگریٹ تھی اور وہ بد معاش قسم کے مردوں کی طرح کش لے رہی تھی۔ چہرے سے کچھ ایسا تاثر ہو رہا تھا جیسے نشے کی عادی ہو۔ سعدیہ رنجیدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی رہی، حتیٰ کہ وہ ایک اسٹور میں چلے گئے۔ سعدیہ نے افسردہ سی سانس لی اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گئی۔

گھر میں امن نہیں تھا، سکون نہیں تھا، مسرت کی کوئی رمت نہیں تھی۔ ایک تناؤ کی فضا ہر وقت مسلط رہتی تھی۔ یہ تناؤ اتنا شدید تھا کہ کبھی کبھی سعدیہ کا دم گھٹنے لگتا۔ اعصاب اس طرح کھینچتے کہ اسے لگتا، چیخ کر ٹوٹ جائیں گے۔ اس نے صورت حال کو بدلنے کی اپنے تئیں کافی کوشش کی مگر بے سود۔ صفدر ایک دائرے میں بند تھا اور اس سے باہر نکلنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھا۔ نہ اسے گھر کی پرواہ تھی، نہ بیوی کی اور نہ ہی اس بات کا کوئی احساس تھا کہ اُس کی ایک دو سال کی بچی بھی موجود ہے۔

پھر وہ سہ پہر آئی۔ ایسی ہی سہ پہر تھی۔ اُداس، بوجھل اور بے کیف۔ صفدر بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ سعدیہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی تھی۔ جب اس نے جوتے پہنے تو سعدیہ نے اچانک کہا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”میں ذرا دودن کے لئے گلاسگو جا رہا ہوں۔“

”لیکن تم نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔“

”کیا ضروری ہے کہ تمہیں ہر بات بتائی جائے؟“

سعدیہ کو ذلت کا احساس ہوا۔ کوئی شے اس کے سینے میں چیخ کر ٹوٹی۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ ایک بار کسی بناء پر صفدر نے رواروی میں ذکر کیا تھا کہ سوزی کی ماں گلاسگو میں رہتی ہے۔ اس نے چونک کر صفدر کی طرف دیکھا۔

”سوزی کے ساتھ؟“

”تم نہیں جاسکتے۔“ یہ بات سعدیہ نے ارادتا نہیں کہی تھی بلکہ یہ رد عمل تھا، صفدر کی بے رخی اور بے پرواہی کا، جس کا مظاہرہ اس نے خاصی تحقیر اور بے نیازی سے کیا تھا۔
اس نے چونک کر سعدیہ کی طرف دیکھا اور یوں حیران ہوا، جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔
پھر تعجب سے بولا۔

”تم ہوش میں تو ہو.....؟“

پھر بات بڑھ گئی۔ سعدیہ نے دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ وہ گلاسگو نہیں جاسکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ صفدر کو اپنی تمام غیر ذمے داریاں ترک کرنا ہوں گی۔ اور یہ کہ اسے سوزی کا خیال چھوڑنا ہوگا اور یہ فیصلہ اسے اسی وقت کرنا ہوگا مگر صفدر نہیں مانا۔ اس نے پوری قطعیت سے کہا کہ وہ نہ تو اپنا طرز زندگی بدل سکتا ہے اور نہ ہی سوزی کو چھوڑ سکتا ہے۔ اس کا لہجہ درشت تھا اور وہ بدزبانی پر اتر آیا تھا۔ پھر جب وہ طیش کے عالم میں سعدیہ کی طرف جھپٹا تو سعدیہ نے چلا کر کہا۔

”خبردار..... ہاتھ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔“

صفدر جھک کر رک گیا۔ سعدیہ کے لہجے میں، اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ صفدر شپٹا گیا۔ اس کے چہرے کے کشیدہ اور برہم خطوط ڈھیلے پڑ گئے اور اٹھا ہوا ہاتھ خود بخود نیچے گر گیا۔ وہ چند لمحے گھبرائی ہوئی نظروں سے سعدیہ کو دیکھتا رہا۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹا، تیزی سے گھوما اور دروازے کی طرف بڑھا۔

سعدیہ نے تیزی سے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو.....؟“

”تم جانتی ہو۔“

”تو تم ضرور جاؤ گے؟“

”ہاں..... تم مجھے نہیں روک سکتیں۔“

سعدیہ کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ اس نے شدید کشمکش کے عالم میں اپنے ہونٹ کاٹے اور آتشیں نظروں سے صفدر کو گھورا۔ پھر وہ یوں آگے بڑھی جیسے کوئی فیصلہ کر چکی ہو۔ دروازہ کھولا اور سرد لہجے میں بولی۔

”نکل جاؤ اس گھر سے..... اور پلٹ کر نہ آنا۔“

”کیا بکتی ہے؟..... تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے؟“ صفدر نے غصے سے اسے گھورا۔ ”یہ

مکان میرا ہے۔“

سعدیہ کے ہونٹ شدت جذبات سے ہلچل گئے۔ ”یہ مکان کنسل کا ہے اور ایک ایک دو پاؤنڈ جوڑ کر اریہ میں ادا کرتی ہوں۔“ وہ رکی، پھر فیصلہ کن لہجے میں اضافہ کیا۔ ”تمہیں

ابھی فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ گھر چاہئے یا وہ عورت؟“
 صفدر چند ٹائپے چپ چاپ کھڑا رہا اور پُر غضب نظروں سے اسے گھورتا اور ہونٹ کاٹتا
 رہا پھر سرد آواز میں بولا۔

”پچھتائے گی تو۔“

”گیٹ آؤٹ۔“

صفدر باہر نکل گیا۔ اُس نے پُر شور آواز سے دروازہ بند کیا اور لرزتی ٹانگوں پر اپنے جسم
 کا بوجھ سنبھالتی ہوئی واپس لوٹک روم میں آئی۔ اس کے دماغ میں لادا سا کھول رہا تھا۔
 روئیں روئیں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں اور پورا جسم لرز رہا تھا، گویا بھونچال کی زد
 میں ہو۔ کچھ دیر تک وہ کھڑی رہی اور ہر اس نظر سے کمرے کی ایک ایک شے کو یوں
 گھورتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ کمرہ اور کمرے کی ساری اشیاء، دیواریں
 اور کھڑکی کے پردے۔ دیوار پر فنگی پرانی پینٹنگ اور آتش دان پر رکھا مصنوعی پھولوں کا
 گملا۔ ان چیزوں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کوئی رشتہ ہے بھی یا نہیں؟ دھیرے
 دھیرے لاوا ٹھنڈا ہوا۔ جسم کا بھونچال تھا۔ پھر خوف کا حملہ ہوا۔ یہ کیا ہوا؟ اس نے
 کیا، کیا؟ اس نے گردن گھما کر بند دروازے کی طرف دیکھا تو خوف مزید بڑھا۔
 بے چارگی، تنہائی اور بے سہارے پن کے احساس نے اسے پیر تسمہ پا کی طرح اپنے ٹکجنے
 میں جکڑ لیا۔ ان دیکھے، انجانے اندیشے اور دوسو سے سر دلوں کی طرح رگوں میں دوڑتے
 چلے گئے اور وہ بالکل ٹوٹ کر، لاچار ہو کر وہیں قالین پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر
 رونے لگی۔



جو کچھ ہوا تھا، وہ ایک وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا۔ ایک لمحاتی جوش کا ردِ عمل۔ مگر وہ لمحہ گزر
 چکا تھا اور صفدر چلا گیا تھا۔ اسے ایسا گمان نہیں تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔ اسے تقریباً
 یقین تھا کہ وہ سوزی کے ساتھ گلاسگو جائے گا ضرور، مگر دو چار روز میں لوٹ آئے گا۔
 لا شعوری طور پر وہ اس کا انتظار بھی کرتی رہی۔ تاہم اس نے طے کر لیا تھا کہ جب بھی وہ
 واپس آئے گا، وہ اپنے روپے میں کوئی تبدیلی نہیں لائے گی۔ چونکہ وہ حق بجانب ہے کہ یہ
 اس کی اور اس کی بچی کی زندگی اور مستقبل کا سوال ہے۔ لہذا وہ کوئی کمزوری نہیں دکھائے
 گی۔ اگر ایک بار جھک گئی تو زندگی بھر اپنے نصیب کو روتی رہے گی۔ صفدر کبھی بھی اپنی
 ذمے داریوں کا احساس نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ وہ جھکے نہیں، ٹوٹے نہیں،
 بلکہ زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے کھڑی رہے۔

مگر صفدر واپس نہیں آیا۔

چند دن اس نے گلاسگو میں گزارے تھے۔ اتنا وہ جانتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایڈنبرا چلا گیا تھا۔ اس بات کا علم سعدیہ کو یوں ہوا کہ اس کی ایک شناسا کی نند ایڈنبرا میں رہائش پذیر تھی۔ اس کا شوہر وقتاً فوقتاً وہاں اپنی بہن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار صفدر کو شہر کے مرکزی بازار میں دیکھا تھا۔ ساتھ میں ایک عورت بھی تھی جو سوزی ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد کچھ بتا نہیں چلا کہ صفدر کہاں گیا۔ ایڈنبرا ہی میں تھا یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ سعدیہ کو ابتدائی چند ہفتوں میں غیر شعوری طور پر توقع رہی تھی کہ وہ واپس آئے گا۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ توقع معدوم ہوتی چلی گئی۔ حد درجہ تعب کی بات یہ ہے کہ سعدیہ کے تحت الشعور میں اگر انتظار کی کوئی کیفیت موجود تھی تو وہ ختم ہو گئی اور اسے صبر کا احساس ہونے لگا۔

شروع کے دن اس نے بڑی بے سروسامانی، انتشار اور بے کسی میں گزارے تھے۔ چلتے پھرتے ایک خوف غیر مرئی سائے کی طرح ہم قدم رہتا۔ ہر شے اسے نامہربان نظر آتی اور ہر لمحے ان گنت اندیشے اس کا پیچھا کرتے رہتے۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کل کیا ہوگا؟..... لیکن دھیرے دھیرے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کے ابا نے بھلے ہی اسے کچھ نہ دیا ہو مگر ایک شے ضرور دی تھی۔ اپنی ذات کا اعتبار اور حالات سے لڑنے کا جذبہ۔ چنانچہ اس نے اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹا۔ بے کسی کی گرد جھاڑی اور قدم زمین پر اعتماد سے جمائے۔ جو ہوا، سو ہوا۔ اگر صفدر نہیں آتا تو نہ آئے۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گی۔ وہ نہ کمزور ہے، نہ بزدل اور نہ محتاج۔ وہ اپنا راستہ خود بنانے اور زیست کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ چنانچہ وہ لڑے گی اور اپنی زندگی خود جیئے گی۔

پھر ایک صبح وہ ایک گارمنٹس فیکٹری میں جا پہنچی۔

فیکٹری کا مالک ایک نیک طینت اور خوش مزاج ایشین تھا۔ اس نے غور سے سعدیہ کو دیکھا، پھر نرمی سے پوچھا۔ ”بی بی! آپ سلامتی جانتی ہیں؟“

”ہاں..... مگر مجھے انڈسٹریل مشین کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کو سکھائیں گے۔ آپ کل سے کام پر آجائیں۔“

یوں اس کے شب و روز نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔

شاز یہ صفدر کی عدم موجودگی سے حیران تھی اور اکثر پوچھتی تھی کہ اس کے ابو کہاں ہیں۔ سعدیہ کو اسے بہلانے میں بڑی پریشانی اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح بہلا لیتی تھی۔ جب وہ چھ بڑی ہوئی تو نہ صرف یہ کہ پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی

بلکہ اس نے ذہنی طور پر صورت حال سے سمجھوتا بھی کر لیا اور صفدر کے بارے میں استفسار کرنا بند کر دیا۔ لیکن سعد یہ اپنے آپ میں کبھی اتنی ہمت پیدا نہ کر سکی کہ اماں ابا کو تبدیلی حالات کی اطلاع دیتی۔ سوچتی تھی، مناسب وقت آنے پر انہیں لکھ دے گی۔

لیکن مناسب وقت آنے سے پہلے ہی ایک بری گھڑی آگئی۔ اس کے ابا اچانک بیمار ہوئے اور چل بے۔ اماں اکیلی رہ گئیں۔ وہ پہلے ہی بیمار اور ناتواں تھیں۔ اس نے سوچا، اگر صفدر کے بارے میں اطلاع دی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں اور کوئی ناخوشگوار بات ہو جائے۔ چنانچہ وہ خاموش رہی۔ صفدر کی جانب سے بھی اسے یقین تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو کبھی نہیں لکھے گا۔ بھلا وہ کیسے لکھ سکتا تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر ایک بازاری قسم کی اینگلو اسکاتش عورت کے ساتھ چلا گیا ہے۔ یوں اس کی اماں اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ ان کی بیٹی انگلستان میں بہت خوشحال ہے۔

وقت گزرا اور گویا ریگ ریگ کر گزرا۔ جیسے کوئی بوڑھا اپنا بچ لٹھی کے سہارے قدم بہ قدم چلتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے چھ سال بیت گئے۔ دو سال کی شاز یہ آٹھ سال کی ہو گئی۔ اس تمام عرصے میں صفدر کے بارے میں کبھی مصدقہ طور پر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کبھی کبھی اس کے جاننے والوں سے کوئی خبر مل جاتی تھی۔ کبھی پتا چلتا کہ لندن کی طرف کہیں چلا گیا ہے۔ کبھی کوئی کہتا کہ گلاسگو میں ہے اور جیل میں لمبی سزا بھگت رہا ہے۔ کیونکہ غیر قانونی منشیات فروخت کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ ایک بار کسی نے کہا کہ وہ ڈنمارک میں ہے۔ لیکن یہ اطلاعات مصدقہ نہیں تھیں۔ صفدر واقعی کہاں تھا، اس بارے میں کچھ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی سعد یہ اپنے دل کو ٹوٹتی تو ندامت اور جرم کا احساس ہوا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ مگر کیا واقعی اس نے کچھ غلط کیا تھا؟ نہیں..... جو کچھ ہوا تھا، وہ بے شک وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا مگر اس کا ذمے دار خود صفدر ہی تھا۔ وہ تو صرف اپنا اور اپنی بیٹی کا تحفظ کرنے کا جتن کر رہی تھی۔ اگر صفدر ذرا بھی ذمے دار ہوتا تو پلٹ کر آتا اور ان دونوں کی خیر خبر لیتا مگر وہ تو چلا گیا۔ اور یوں غائب ہو گیا جیسے ان دونوں سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔

سعد یہ کو یہ بھی محسوس ہوتا کہ حالات سے خود بخود ایک سمجھوتا ہو گیا ہے۔ اسے بے شک رنج کا احساس تو کبھی کبھی ہوتا ہے مگر بچھتا واثنا یہ نہیں ہے۔ اسے کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا کہ اسے صفدر کا انتظار نہیں ہے۔ یوں لگتا جیسے ذہن و دل نے صفدر کی عدم موجودگی کو ایک سچ کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اس طرح گویا وہ اس کی زندگی کا حصہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی اس کے دل میں کافی حد تک جا گزریں ہو گیا تھا کہ صفدر اب شاید کبھی

نہیں آئے گا۔



اس نے خط پڑھا۔ خدشہ درست نکلا۔ اماں نے رکی باتوں کے بعد صفدر کا ذکر کیا تھا۔ اُمید ظاہر کی تھی کہ وہ اچھا ہوگا۔ ڈھیر ساری دعائیں بھی بھیجی تھیں اور اس بات کا شکوہ کیا تھا کہ وہ انہیں کبھی دوسطریں بھی نہیں لکھتا ہے۔

سعدیہ افسردگی اور تلخی سے مسکرائی اور ویران نظروں سے درپتے سے باہر دیکھا۔ ہونٹوں پر ہرچند کہ ایک تلخ سی مسکراہٹ تھی، مگر اندر ہی اندر دل رو دیا تھا۔ کب تک وہ اس جھوٹ کو نبھائے گی؟ کب تک اماں کو دھوکا دے گی؟ نہیں..... اس فریب کو اور طول دینا مناسب نہیں ہے۔ اچھا یہی ہے کہ وہ اماں کو اور بھائی کو سب کچھ بتا دے۔ بے شک انہیں سخت صدمہ پہنچے گا لیکن جھوٹ کی زندگی جینے اور شب و روز کرب کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ ایک بار وہ اس امتحان سے گزر جائے۔

مگر کیا وہ ایسا کر سکتی ہے.....؟

اماں کا کیا ہوگا؟

اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور سر کو بے معنی انداز میں جنبش دی۔

سہ پہر ڈوب گئی۔ شام نے اپنا سایہ ہر سو پھیلا دیا۔ گوسات بج گئے تھے مگر دن بڑے ہونے کے سبب ابھی بھی بالکل اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر آئی تو کھانا لگانا شروع کیا۔ اس نے چٹائی بچھائی۔ شاز یہ پلیٹیں لگا رہی تھی کہ معاً اطلاعی گھنٹی بجی۔ سعدیہ جھنجلا گئی۔ کیا مصیبت ہے؟ اب اس وقت کون آ گیا؟ وہ بیچ میں گئی۔ بیرونی دروازہ کھلا اور ریکلت اس کا دل جیسے رک سا گیا۔

سامنے تلکبے اُجالے میں صفدر کھڑا تھا۔ اُس کی حالت بے حد خستہ اور قابلِ رحم تھی۔ جسم پر خاصے بوسیدہ کپڑے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنس گئیں اور گال چمک گئے تھے۔ چہرے پر ایسی آزدگی اور ناتوانی تھی کہ لگتا تھا جیسے برسوں کا بیمار اور بھوکا ہو۔ جسم نحیف ہو گیا تھا۔ سعدیہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پاؤں ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور بے حد در ماندہ، مظلوم، لاچار اور فریادی نظروں سے سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شاید الفاظ نہیں مل رہے تھے یا شاید زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سعدیہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ شاید وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر طے نہیں کر پائی تھی کہ کیا کہے اور کیسے کہے؟..... اس کا دل جو لمحہ بھر کے لئے ٹھہر گیا تھا، اب زور زور

سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں باوجود ضبط کی کوشش کے آنسو آ گئے تھے۔ وہ دونوں خاموشی کے غلاف میں لپٹے بے حرکت کھڑے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لمحے ایک ایک کر کے گزرے۔ مگر یوں گزرے جیسے صدیاں گزری ہوں۔ جب کئی صدیاں بے آواز گزر گئیں تو سعدیہ معاً چونکی، جیسے کسی خواب سے جاگی ہو۔ اس نے ایک بار اور غور سے صدر کو دیکھا اور زور سے سانس لی۔ پھر آہستہ سے پورا دروازہ کھولا اور گھوم کر لرزتے قدموں سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



پاکستانی
ادبیات
مقام

دائرہ

ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ گھنگھرو کھٹکے، چوڑیوں کی جھکار سے فضا مترنم ہوئی۔ ایک لڑکی نے تانے کی تھالی بجانا شروع کی۔ کئی خوبصورت، سبک ہتھیلیوں نے ایک خاص ردھم پر تالیاں بجا کر ڈھولک کی سنگت کی۔ پھر سیکینہ آپا کی کھلتی آواز کا شعلہ لپکا۔

”تیرے ہاتھوں کی مہندی مہکتی رہے.....“

چھوٹے سے آنگن اور صحن میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ فرش پر کچھی چٹائیوں اور دريوں پر خواتین براجمان تھیں۔ کہیں باتوں کی گرم بازاری تھی، کہیں پاندان کھلے ہوئے تھے اور گلوڑیاں بنا کر تھالیوں میں سجائی جا رہی تھیں۔ کھلے آنگن میں چاروں طرف سرخ، سبز، پیلی اور نیلی جھنڈیاں سجائی گئی تھیں۔ چھوٹے بچے صاف ستھری پوشاکوں میں ملبوس آنگن، صحن اور باہر گلی میں بھاگتے پھر رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ منشی صدر الدین کا گھر جہاں ہمیشہ لائٹین اور کبھی کبھی چراغ کی زرد، مدھم روشنی ہی نظر آتی تھی، اس دقت گیس کے ہنڈوں کی دودھیا روشنی میں بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ مگر اس ہماہمی، افراتفری اور شور کے باوجود سیکینہ آپا کی سنہری آواز کی دلکش لے باہر گلی تک پہنچ رہی تھی۔

”تیرے ماتھے کا جھومر ہمیشہ دمکتا رہے.....“

گھر کے باہر گلی میں مردوں کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ شامیانہ کرائے پر لینا منشی صدر الدین کی استطاعت سے باہر تھا لہذا گلی میں دیوار سے دیوار تک چند ایک چادرے تان دیئے گئے تھے۔ زمین پر کچھ کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں جو زیادہ تر پڑوسیوں سے مستعار لی گئی تھیں۔ چند ایک چارپائیاں اور ایک چھوٹا تخت بھی بچھا تھا جن پر مہمان براجمان تھے اور موقع محل کی مناسبت سے دنیا جہان کی گفتگو میں مصروف تھے۔ سیاست، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بے روزگاری، تشدد کا رجحان، اسلحہ اور منشیات اور آنے والے الکش۔ اور پھر ان خوابوں کا ذکر جو آدمی نے ہمیشہ سے دیکھے ہیں اور شاید ہمیشہ دیکھتا رہے گا۔ ان دنوں کا خواب جب زندگی آسودگی، سکھ اور مسرت سے مبارت تھی۔ جب کوئی خوف نہیں

ہوگا اور نا انصافی اور تفریق نہیں ہوگی۔ یہ خواب آدمی کی آنکھوں میں تب سے سجا ہوا ہے جب اس نے پہلی بار بستیاں بسائی تھیں اور ایک پُر امن معاشرے کی جدوجہد شروع کی تھی۔ لیکن کیا اس خواب کی تعبیر آدمی کو کبھی ملے گی؟

”ارے صاحب! زندگی عذاب ہو گئی ہے۔“ نفیس احمد تلخی سے کہہ رہے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب کم آمدنی والے بھی سکھ سے دو وقت کھا لیتے تھے۔ مگر اب.....“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گئے۔

”اور جناب والا! اوپر سے بے روزگاری۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”ایک بار ملازمت چھوٹ جائے تو دوسری نوکری حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ میرے پڑوسی مسیح اللہ کا بیٹا بی اے ہے۔ اچھی خاصی نوکری کر رہا تھا۔ کم بختوں نے خواہ مخواہ برطرف کر دیا۔ اب چھ ماہ سے مارا مارا پھر رہا ہے بے چارہ۔“

”ہاں بھئی..... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ امین الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہر طرف ایک نفسا نفسی کا عالم ہے۔“ سلطان احمد نے تبصرہ کیا۔

دوسری طرف سیاست پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ الیاس ماسٹر ہاتھ ہلا ہلا کر پُر زور لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی حکومت الیکشن جیتے اور حکومت بنائے، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ بڑھتی ہوئی بے اطمینانی، بد امنی، غربت، مہنگائی اور رشوت یونہی قائم رہے گی۔ اگر کچھ ہو گا تو یہ کہ ان میں اور اضافہ ہو گا۔“

”بھئی آپ نے کرپشن کا ذکر نہیں کیا۔ خاص طور پر سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کی بے ایمانیاں۔“ رجب علی نے لقمہ دیا۔

”ارے صاحب! سیاست داں کہاں ہیں، چور ہیں چور۔“ قیوم صاحب نے زہر خند کیا۔ ”ہاں بھئی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ عنایت اللہ نے ایک مصنوعی ٹھنڈی سانس لی۔ ”الیکشن کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ایک چور جائے گا، دوسرا آ جائے گا۔“

”بظاہر چوکیداری کرنے۔ مگر کرے گا چوری۔“ رجب علی نے گرہ لگائی۔

رجب علی کی بات سن کر چند افراد نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

منشی صدر الدین بوکھلائے بوکھلائے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کبھی مرد مہمانوں سے پوچھتے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کبھی دروازے میں جھانک کر اطمینان کرتے کہ خواتین کی سب ضروریات حسب منشاء پوری ہو رہی ہیں۔ پھر لپک جھپک کر مولوی شفیع اللہ کے مکان میں جاتے۔ مولوی شفیع اللہ کا مکان ان کے پڑوس میں تھا۔ ان کی درخواست پر

شفیع اللہ نے اپنے مکان کا آنگن اور صحن ایک دن کے لئے خالی کر دیا تھا اور باراتیوں کو بمعہ دولہامیاں وہیں بٹھایا گیا تھا۔ منشی صدر الدین بار بار مکان میں جاتے اور جائزہ لیتے کہ مہمانوں کے لئے ہر شے کا مناسب و معقول بندوبست ہے۔ پانی، سگریٹ اور ڈرنکس وغیرہ۔ کسی چیز کی کمی تو نہیں۔ ان کے بشرے سے وہی گھبراہٹ اور فکر مندی عیاں تھی جو ہر اس باپ کے چہرے پر ہوتی ہے جو اپنی بیٹی کو بیاہ رہا ہو۔ مگر اس گھبراہٹ اور تردد میں ایک مسرت، اطمینان اور کسی حد تک فخر کا عکس بھی موجود تھا۔ بیٹی کو بیاہنا، وہ بھی آج کے زمانے میں اور ایک ایسے آدمی کے لئے جس نے اپنی ساری زندگی عسرت و قناعت میں گزاری ہو، پل صراط عبور کرنے سے کم نہیں۔ منشی صدر الدین کو ہمیشہ ایک خوف گھیرے رہتا تھا۔ یہ کہ وہ اس پل صراط تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ کیونکہ وہ بھی ان لاکھوں کروڑوں افراد میں سے ایک تھے جن کی چادر ہمیشہ چھوٹی ہوتی ہے اور پاؤں پوری طرح پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی۔ جب چادر چھوٹی ہو تو بیٹی کو بیاہنے کے لوازمات کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔ رسوم، جہیز اور دیگر اخراجات کا ہی مسئلہ نہیں ہوتا، ذات بات، خاندان اور برادری کے مسائل ہوتے ہیں۔ ایک امتحان ہو تو آدمی جان پر کھیل کر گزر جائے۔ اسے تو ان گنت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

منشی صدر الدین کی زندگی ایک مسلسل امتحان، ایک آزمائش رہتی تھی۔ ایک نیم سرکاری محکمے میں ملازمت کرتے تھے جہاں اوپر کی آمدنی کے مواقع بہت کم تھے اور جو مواقع تھے بھی، ان سے بھی انہوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیونکہ وہ ان معددے چند لوگوں میں سے ایک تھے، جو اپنے ضمیر کی آواز بھی سن لیتے ہیں۔ یوں ان کی زندگی روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے کے مصداق گزری۔ تاہم ان کے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ شب و روز عزت و آبرو سے گزرے۔ نہ فاقوں کی نوبت آئی اور نہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ہاں..... ایک فکر ضرور دامن گیر رہی۔ بیٹی کا گھر آباد کرنے کی فکر۔ چنانچہ جب ایک معقول رشتہ آیا تو خوش ہو گئے۔ ساری فکریں دور ہو گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ آخر کار پل صراط تک پہنچے اور اسے عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

انہوں نے پانوں کی تھالی مہمانوں میں پہنچائی۔ جونہی واپس مڑے اور گھر کے دروازے کی طرف رخ کیا کہ معان کے کانوں میں ایک خوش باش آواز آئی۔

”السلام علیکم بھائی صدر الدین!“

انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ عثمان علی تھے۔ ان کے ایک پرانے دوست۔ چند سال قبل

ان کے دفتر میں کچھ عرصہ کام بھی کیا تھا۔ منشی صدر الدین نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”اُخاہ..... عثمان بھائی ہیں۔ بھئی آپ نے بڑی دیر کر دی۔“
 ”ہاں بھئی کچھ ضروری کام نکل آیا تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔“ عثمان علی نے قدرے شرمندگی سے کہا۔ ”بہر حال بڑی مسرت کی بات ہے۔ بیٹی کا بیاہ ایک ذمہ داری ہے۔ اللہ نے آپ کو سرخرو کیا۔ مبارک ہو۔“
 ”شکریہ۔“ منشی صدر الدین نے عثمان علی کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میں عزت و آبرو کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھانے کے قابل ہو سکا۔ اور بھئی آپ سب کی دعائیں بھی تو میرے ساتھ تھیں۔“

”نکاح ہو گیا؟“

”ہاں..... اللہ کا شکر ہے، تمام مراحل خوش اسلوبی سے پورے ہو گئے۔“

”دولہا میاں کہاں ہیں؟“

”اُدھر شفیع اللہ صاحب کے مکان میں ہیں۔ باراتیوں کو وہیں بٹھایا ہے۔“
 ”تو پھر اب دیر کیا ہے؟“ عثمان بھائی نے مزید پوچھا۔ ”میرے لئے کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔“

”بہت بہت شکریہ عثمان بھائی! اللہ کا کرم ہے کہ ہر کام تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔“ منشی صدر الدین نے ممنونیت سے کہا۔ ”ویسے ضرورت پڑی تو ضرور زحمت دوں گا۔ آپ تشریف تو رکھئے۔“

”ہاں، بیٹھتا ہوں۔ مگر ذرا پہلے نوشہ میاں سے مل آؤں۔ ان کے والد، اللہ بخشے، میرے اچھے دوست تھے۔“ عثمان بھائی شفیع اللہ کے مکان کی طرف بڑھ گئے۔

منشی صدر الدین اپنے مکان کی طرف بڑھے۔ پھر پلٹ آئے۔ کیونکہ اکبر علی کی آواز کانوں میں آئی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”کہئے اکبر بھائی! کیا بات ہے؟ کچھ اور مشروب بھجواؤں؟“

”نہیں بھئی، یہاں مشروب اور پانی وغیرہ سب ہی کچھ ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ اب کیا دیر ہے؟ نکاح تو ہو گیا۔ رخصتی کا کیا پروگرام ہے؟“

”دیر کچھ بھی نہیں ہے۔“ منشی صدر الدین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”تورمہ اور پلاؤ تقریباً تیار ہے۔ نان لگ جائیں تو کھانا شروع کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے، دس بجے تک رخصتی ہوگی۔“

”بہت خوب۔“ علی اکبر نے خوش دلی سے کہا۔ پھر آواز ذرا دبا کر بولے۔ ”کوئی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔ تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔“

منشی صدر الدین، ابر علی کا مطلب سمجھ گئے۔ ممنون نظروں سے انہیں دیکھا اور آہستہ سے ان کا ہاتھ دبایا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔



اس ہماہمی، ہنسی مذاق اور شور غل سے دور مکان کے اندرونی کمرے میں، منشی صدر الدین کی بیٹی نور بانو، سہیلیوں میں گھری ہوئی، گردن بیہوڑائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر سرخ عروسی جوڑا تھا۔ سنہری تیل اور سملہ ستاروں سے مرصع۔ دونوں ہاتھ مہندی سے سرخ ہو رہے تھے۔ کلائیوں میں چوڑیوں کی قطار تھی۔ جن میں تین تین چوڑیاں طلائی تھیں۔ پیشانی پر جھومر تھا اور ناک میں نتھنی۔ گلے میں دو ہار تھے۔ ایک طلائی جبکہ دوسرا سفید موتیوں کا۔ پاؤں میں چاندی کی پازیب تھی۔ نور بانو کو اچھی طرح علم تھا، سونے کی چڑیاں اور پتلا سا طلائی ہار اس کی ماں کو ان کی شادی پر جہیز میں ملا تھا جو انہوں نے کئی سال پہلے اس خیال سے صندوق میں چھپا کر رکھ دیا تھا کہ اپنی بیٹی نور بانو کے جہیز میں دیں گی۔ جھومر خالہ نے دیا تھا، اس شرط پر کہ شادی کے بعد واپس کر دیا جائے گا۔ نتھنی اس کے ابا کے ایک بہت عزیز دوست نے تحفے کے طور پر دی تھی۔ رہ گئی چاندی کی پازیب، دو انگوٹھیاں اور شادی کا جوڑا تو وہ اس طرح بنا تھا کہ اس کی اماں برسوں سے دو، چار چار روپے بچا کر، چھپا کر جمع کرتی رہی تھیں۔ ورنہ شاید یہ بھی آسان نہ ہوتا۔ نور بانو چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ نقرے بازی کر رہی تھیں اور قہقہہ لگا رہی تھیں۔ لیکن نور بانو کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ اس کا دھیان تو سیکنہ آپا کی دل میں تیر کی طرح اتر جانے والی آواز کا تھا۔ مگر اب گیت کے بول بدل گئے تھے۔

”بابل کی دُعائیں لیتی جا.....“

بابل کی دُعائیں..... ہاں، بابل کی دعاؤں کے علاوہ وہ اور کیا لے جائے گی اس گھر سے۔ دُعائیں اور ایک پینا۔ خوبصورت، روشن اور پُر مسرت مستقبل کا ایک پینا۔ خوبصورت۔ کیونکہ اس کے حصے میں خوبصورتی بہت کم آئی تھی۔ اور پُر مسرت کہ اسے خوشیاں شاذ و نادر ہی ملی تھیں اور روشنی کہ اس کی زندگی کا ایک ایک پل اندھیرے میں گزرا تھا۔ محرومی کے اندھیرے میں۔ ایک چھوٹے سے آنگن اور دو چھوٹے کمروں پر مشتمل، کچیریل کی چھت والے اس چھوٹے سے مکان میں، جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی،

گو سورج کی روشنی بھی پھیلتی تھی اور اُجالا بھی نظر آتا تھا۔ مگر ایک نادیدہ اندھیرا بھی چپے چپے پر پھیلا رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس تاریکی نے اس کے دل میں روشنی کی آرزو پیدا کی۔ وہ اپنے گھر کے اور اس در و دیوار کو دیکھتی، اس نادیدہ اندھیرے کو محسوس کرتی جو ہمیشہ سے اس گھر کا مقدر تھا، اور اس کے دل میں ہوک سی اُٹھتی۔ کہاں ہے؟ روشنی کی وہ کرن کہاں ہے جو اس گھر کو منور کر دے۔ جو اس کی زندگی، آنگن کو نور سے بھر دے۔ پھر وہ حیران ہوتی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کچھ لوگوں کے حصے میں ضرورت سے زیادہ، بلکہ بہت زیادہ روشنی کیوں آتی ہے؟ جبکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں بہت کم اُجالا ملتا ہے۔ اتنا کم کہ اکثر تو اس مٹھی بھر اُجالے میں اپنی زندگی کا راستہ تک نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ بات وہ سمجھ نہ پاتی۔ ہاں، یہ ضرور ہوا دھیرے دھیرے روشنی کی آرزو بڑھتی گئی۔ ایک آس نے جنم لیا۔ یہ اندھیرا سدا نہیں رہے گا۔ ایک دن آئے گا جو اس کے لئے نور کی ایک تابناک کرن لے کر آئے گا۔ تب یہ محرومی نہیں رہے گی۔ یہ بے مائیگی نہیں رہے گی اور اس کی زندگی کے در و دیوار جگمگا اُٹھیں گے۔ جوں جوں وقت گزرا، روشنی کی آرزو میں مزید تڑپ پیدا ہوئی۔ آس اور شدید ہوئی اور ایک انتظار میں بدل گئی۔ ایک مسلسل اور جانکاہ انتظار۔

اس کے ابائشی صدر الدین ایک قناعت پسند اور صابر آدمی تھے۔ آمدنی اتنی کم تھی کہ وہ مٹھی بھر اُجالا ہی خرید سکتے تھے۔ اس مٹھی بھر اُجالے میں ان کے چھوٹے سے کنبے کا سفر حیات یوں طے ہوتا رہا جیسے کوئی ناپینا ٹول ٹول کر، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے۔ انہوں نے کبھی زیادہ کی آرزو بھی نہیں کی کہ وہ اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی اس قلیل آمدنی میں ہی گزرتی رہی۔ دروازے پر پڑا ہوا ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ گھر کے مینوں کی خستہ حالی کا فوج سکوت گویائی سے سناتا رہا۔ برسات میں کچھریل کی چھت یہاں وہاں سے ٹپکتی رہی اور در و دیوار پر محیط اُداس لالٹین کی زرد روشنی کچھ اور گہری ہوتی گئی۔ لیکن منشی صدر الدین کے توکل اور قناعت میں کوئی فرق نہ آیا۔

روز و شب کا ایک لگا بندھا، یکساں اور دلدگداز معمول تھا۔ صبح ہوتی، اس کے ابا چائے کے ساتھ باسی روٹی کے دو ٹکڑے کھا کر کام پر جاتے۔ پھر دن۔ ہر روز کی طرح ایک اور پھیکا، بے رونق اور بوجھل دن شروع ہوتا، ہر بات اپنے آپ کو دہراتی۔ جیسے گھسے ہوئے ریکارڈ پر سُنی انک جاتی ہے اور ایک ہی بول کو بار بار دہراتی ہے۔

نور بانو اپنی ماں سے پوچھتی۔ ”اماں! کیا حرارت زیادہ ہے؟ چائے دیں؟“
 ”ہاں بیٹا! تھوڑی سی چینی تو ہوگی۔ ایک پیالی چائے دے۔ شاید کچھ سکون ملے۔“

وہ چائے کا پانی چولھے پر چڑھاتی، پھر مدھم لہجے میں پوچھتی۔

”اماں! آج کیا پکاؤں؟“

ماں آزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی۔ ”ارے اب میں کیا بتاؤں میٹا! یہ تو روز کا

جنجال ہے۔ کیا گھر میں کچھ نہیں ہے؟“

”کھڑے مونگ پڑے ہیں تھوڑے سے۔“

ماں دوپٹے کے پلو میں بندھی گانٹھ کھولتی۔ نور بانو کے ہاتھ پر تین روپے رکھ کر دکھ

بھرے لہجے میں آہستہ سے بڑبڑاتی۔ ”لے، یہ تین روپے۔ کوئی سبزی لے آ۔ تھوڑی سی

ہری مرچیں بھی لے لینا۔ آج تو بس دال اور سبزی ہی پکا لے۔“

”اچھا اماں!“ نور بانو رسانیت سے جواب دیتی۔

جس طرح تھیڑ میں ایک ہی کھیل بار بار دکھایا جاتا ہے کہ نہ کبھی کوئی منظر بدلتا ہے اور نہ

کوئی مکالمہ، بس اسی طرح منشی صدر الدین کے گھر کے مناظر خود کو بار بار دہراتے رہتے۔

منشی صدر الدین تو خیر قانع اور شاکر تھے۔ تاہم نور بانو کا معاملہ برعکس تھا۔ اس کے من

میں خواہشیں تھیں اور یہ خواہشیں خود بخود اُگی تھیں۔ اس خود رو گھاس کی طرح جو دور،

انجانی گھائیوں میں آپ ہی آپ اُگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ اُس کے من کی خواہشیں

بھی دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر بڑھتی رہیں۔ اچھے دنوں کی خواہشیں، جب اس کے

گھر کے دروازے پر ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ نہ ہو۔ در و دیوار پر لائین کی بیمار روشنی نہ ہو،

المونیم کے خستہ برتن نہ ہوں اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں افسردگی اور مایوسی نہ ہو۔

کہاں ہیں ایسے دن؟ دور دور تک اندھیرا ہے۔ اور ایسے خوبصورت دنوں کے ظہور

کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ پھر یوں ہوا۔ شاید ردِ عمل تھا کہ اس کے دل میں ایک آس

پیدا ہوئی۔ خود بخود۔ جیسے موسم بہار میں خود بخود دھنیں پر سبز ریشمی پیتاں اُگتی ہیں اور خود

بخود پھول کھلتے ہیں۔ خوشنما اور خوش رنگ۔ اس کے دل میں پیدا ہونے والی آس بھی بہت

خوبصورت تھی اور خوش رنگ۔ اُس نے اس آس کو سینے سے لگا لیا جیسے وہ محض ایک آس نہ

ہو، اس کی کوکھ سے جنا پچھ ہو۔ نازک اور معصوم۔ وہ غیر شعوری طور پر اس آس کو کوکھ سے

جنے بچے ہی کی طرح پالتی رہی۔ سینے سے لگا کر، آنچل میں چھپا کر، نامہربان موسموں کی

خنتی اور بے مہری سے بچا کر۔ تاکہ اُسے کسی کی نظر نہ لگے۔ اکثر نظریں بدنیت ہوتی ہیں۔

بچوں کو لگ جائیں تو بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ آس کو لگ جائیں تو آس اور امید کو بھی موت

آ جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وہ ننھی سی آس جو اس کے لئے ایک نایاب نعمت

سے کم نہیں، کفن پوش ہو۔ چنانچہ وہ اسے اپنی گود میں چھپائے رہی۔ اور انتظار کرتی رہی۔

کوئی آس جب پیدا ہوتی ہے تو اپنے ساتھ انتظار بھی لاتی ہے۔ انتظار کہ وہ آس کب حقیقت کا روپ بھرے گی۔

مگر یہ انتظار بہت طویل تھا۔ بہت جانکاہ اور صبر آزما۔ کبھی کبھی تو نور بانو کو یوں محسوس ہوتا کہ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو اکثر اس مسافر کی طرح محسوس کرتی جو کسی اندھیری سیاہ رات میں کسی گھنے جنگل میں بھٹک گیا ہو اور اپنی منزل کا راستہ باوجود سرتوڑ کوشش کے نہ کھوج پا رہا ہو۔ نور بانو کے دل میں مایوسی در آئی۔ شاید وہ انتظار کے اس گھنے، تاریک اور پُر عذاب جنگل سے کبھی نہیں نکل پائے گی۔ یونہی اندھیرے میں بھٹکتی رہے گی۔ ایک پگڈنڈی سے دوسری پگڈنڈی۔ ایک سمت سے دوسری سمت۔ حتیٰ کہ اس کے پاؤں زخمی ہو جائیں گے۔ اس کا بدن لہو لہو ہو جائے گا۔ دل ایک آبلہ بن کر پھوٹ جائے گا اور وہ ایک دن مر جائے گی۔ اس کی آس، اس کا ننھا مناسا، نازک ساریشمی بچہ فنا ہو جائے گا۔

مگر پھر یوں ہوا کہ ایک دن اس کے ابا صدر الدین نے رشتے کی خوشخبری سنائی اور نور بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے یکا یک تاریک جنگل میں دور تک اُجالا پھیل گیا ہے اور چپہ چپہ اتنا روشن ہو گیا ہے کہ وہ اپنا راستہ صاف دیکھ سکتا ہے۔ کیا اب وہ اس جنگل سے نکل جائے گی؟

وہ گردن جھکائے، ہونٹ پر ہونٹ جمائے خاموش بیٹھی تھی۔ ایک انوکھی، سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت میں مبتلا۔ ایک طرف یہ دکھ تھا کہ وہ محبت کرنے والی ماں اور جان چھڑکنے والے باپ سے بچھڑ جائے گی اور اس گھر کو چھوڑ کر چلی جائے گی جس کے خستہ در و دیوار کے درمیان اس نے آنکھ کھولی تھی اور سارا بچپن بتایا تھا۔ اس گھر کے چپے چپے سے شناسائی اور اپنائیت کا جو رشتہ برسوں میں استوار ہوا تھا، وہ ٹوٹ جائے گا۔ مگر دوسری طرف ایک نامعلوم سی خوشی بھی اس کے دل میں جاگزیں تھی۔ جنگل کی گہری اور دم گھونٹ دینے والی تاریکی سے نکل جانے کی خوشی۔

وہ چپ بیٹھی تھی۔ اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ فقرے چست کر رہی تھیں۔ باہر سے ڈھولک کی تھاپ، گھنگھر وؤں کی جھکار اور سیکنہ آپا کی کھنکتی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔

”بابل کی دعائیں لیتی جا.....“



بالآخر تقریب اختتام کو پہنچی۔ رخصتی کا وقت آیا۔ چھوٹی سی گلی مہمانوں سے بھر گئی

مردوں کا ہجوم تو تھا ہی، بچے اور عورتیں بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔ گلی میں دور تک ہنڈوؤں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے آگے دولہا کا تانگہ تھا جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دولہا کے والد اور دوسرے باراتی، پھر ذلہن کی ڈولی۔ رنگ برنگی جھنڈیوں اور جھالروں سے سجی ہوئی۔ ڈولی کے عقب میں خواتین کی سواریاں تھیں اور ان کے پیچھے منشی صدر الدین، ان کے عزیز واقارب اور دوسرے مہمان۔

بارات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ منشی صدر الدین کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ چہرے پر ایک گہری افسردگی اتر آئی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان کی آنکھوں کا نور، ان کے جگر کا ٹکڑا، ان کی بیٹی ان سے رخصت ہو رہی تھی۔ یونہی ہوتا ہے۔ ہم بیٹیوں کو بڑے پیار سے پالتے ہیں دنیا کی آفات سے بچا بچا کر، چھپا چھپا کر۔ انہیں وہ سب کچھ دیتے ہیں جو ہماری بساط میں ہوتا ہے۔ ان کے لئے راتوں کو جاگتے ہیں۔ ان کے دکھ اور آلام اپنے سر لے لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہماری بیٹیاں ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکن ہیں اور ہمارے لئے دنیا کی سب سے خوبصورت اور انمول متاع ہیں۔ پھر وہ بڑی ہو جاتی ہیں اور ہمیں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ ہمارے پاس انہیں دینے کے لئے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ منشی صدر الدین کے پاس بھی نہیں تھا۔

گلی کے نکل پر پہنچ کر وہ ایک طرف چپ چاپ کھڑے ہو گئے تھے اور بارات کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور دل دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

جاتی تھی کسکھی سنسار ملے.....!

جاتی تھی کسکھی سنسار ملے.....!



دو ماہ بیت گئے۔

نور بانو جھاڑو دے کرفارغ ہوئی۔ اس کی ساس چھوٹے سے لکھوری اینٹوں والے صحن میں جھلنگی چارپائی پر بیٹھی آہستہ آہستہ کھانس رہی تھی۔ دے کی شدت میں پھر اضافہ ہو گیا تھا۔ نور بانو نے ہمدردی اور افسردگی سے اپنی ساس کی طرف دیکھا، پھر آنگن میں پھیلی دھوپ کی طرف دیکھا، پھر صحن کے دوسرے حصے میں بنے چولھے پر نظر ڈالی۔ سارے گھر میں ایک بوجھل بے کیفی اور اُداسی مسلط تھی۔ اُس کا شوہر باسی روٹی کے دو ٹکڑے کھا کر کام پر جا چکا تھا اور دن، ہر روز جیسا ایک اور دن، پھیکا، بے رنگ اور بوجھل دن شروع ہو چکا تھا۔ ہر شے معمول کے مطابق تھی جیسے ہر روز ہوتی تھی۔

نور بانو کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی اور تھکی تھکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

پھر اُس نے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

”خالہ! کیا زیادہ کھانسی آرہی ہے؟..... پانی دوں؟“

”ہاں بیٹا! دو گھونٹ پانی دے دے۔ یہ کم بخت گلوڑ ماری کھانسی آج کچھ زیادہ ہی ہلکان کر رہی ہے۔“

نور بانو ایلو منیم کے کٹورے میں پانی لے کر آئی۔ ساس نے دو گھونٹ پیئے۔ ذرا سکون محسوس ہوا تو ایک طویل سانس لی اور اپنی بہو کو دعا دی۔

”جیتی رہو بیٹی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ لمبی عمر دے۔“

نور بانو کے ہونٹوں پر ایک پشیمردہ سی مسکراہٹ ابھری اور ڈوب گئی۔ اس نے مدہم آواز میں کہا۔ ”اماں! آج کیا پکاؤں.....؟“

ساس نے بے دھیانی سے مگر کسی قدر رزج ہو کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”ارے اب میں کیا بتاؤں بیٹا! یہ تو روز کا جنجال ہے۔ کیا گھر میں کچھ نہیں ہے؟“

”دو ایک دالیں پڑی ہیں۔“

ساس نے دوپٹے کے پلو میں بندھی گانٹھ کھولی، پانچ روپے نکالے اور نور بانو کے ہاتھ پر رکھ کر دکھ بھرے لہجے میں بڑبڑائی۔

”یہ پانچ روپے ہیں۔ کوئی سبزی لے آ۔ تھوڑا سا ہر ادھنیا بھی لے لینا۔ آج تو بس دال اور سبزی ہی پکا لے۔“

”اچھا خالہ!“ نور بانو نے رسانیت سے کہا۔ ”ذرا برتن مانجھ لوں، پھر سبزی لے آؤں گی۔“

نور بانو پانچ کانوٹ تھام کر آنگن کے اس کونے میں گئی جہاں میلے برتنوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ پیالے، گلاس، کفگیر اور پتیلیاں۔ اُس نے چوکی پر بیٹھ کر ایلو منیم کی ایک پتیلی جو کئی جگہ سے پچکی ہوئی تھی، گھسیٹی اور اُداس، در ماندہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔



وہ سورج کی تلاش میں گئی ہے

لیلیٰ عثمانو وچ بہت دھیان سے کھڑکی کے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سرمئی دھند سی پھیلی ہوئی ہے۔ دھند کے پیچھے ایک بلند پہاڑی کا ہیولا نظر آتا ہے جو سبزے سے ڈھکا ہوا ہے۔ کہیں کہیں چھوٹے بڑے سفید دھبے ہیں۔ پہاڑی کے دامن میں جا بجا درخت ہیں، وہ بھی سفید نظر آتے ہیں۔ شاید برف گری ہے۔ مگر لیلیٰ کو پوری طرح یقین نہیں ہے کہ وہ سفید دھبے برف کے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اور ہو۔ بادل بھی تو ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے بادل کے ٹکڑے دھرتی پر اتر آئے ہوں۔

لیلیٰ عثمانو وچ یکا یک زور سے سانس لیتی ہے۔ پھر سیدھا ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر انگلی پھیرتی ہے اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے نیلے آسمان کو دیکھتی ہے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی نظر آ رہا ہے۔ بالکل اس کی آنکھوں کی طرح۔ اس کی آنکھیں بھی ابھی اور ویران ہیں۔ ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ایک خلاء ہے۔ سنسان اور بے کنار خلاء۔

آنکھوں کی طرح اس کا چہرہ بھی خالی ہے۔ پتھر کی طرح سرد اور احساسات سے عاری۔ حالانکہ ابھی کچھ دن پہلے تک نہ صرف اس کی آنکھیں اور چہرہ بلکہ اس کے جسم کا شہر بھی بہت آباد تھا، پُر رونق، روشنیوں اور رنگوں سے معمور۔ سیرانیا کی طرح۔ اُس کے شہر کے، اس کے بدن کے نشیب و فراز اور گلی کوچے اور باغ باغیچے پھولوں سے لدے پھندے اور خوشبوؤں میں رچے بے تھے۔

اُسے اپنا شہر بہت پسند تھا۔ ہر چند کہ وہ گورنی وا کوف میں پیدا ہوئی تھی لیکن سیرانیا میں پلی بڑھی تھی اور سیرانیا کے گلی کوچوں سے اسے عشق تھا کہ اس کا شہر سارے عالم میں

انتخاب تھا۔ لیکن پھر کیا ہوا کہ شب خون مارنے والے آئے اور انہوں نے اس کا شہر، اس کا جسم لوٹ کر تاراج کر ڈالا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ اُجڑ گیا۔ ویران ہو گیا۔ گلیاں سُنی ہوئیں اور گلستان بے رونق ہوئے۔ شہر کے چپے چپے پر آسیبوں نے ڈیرے ڈالے اور سارا کا سارا شہر ایک کھنڈر بن کر رہ گیا جس میں چڑیلوں اور بھوتوں کا بسیرا تھا اور قبرستانوں کی ویرانی اور نحوست سنان گلی کو چوں میں ماری ماری پھرتی تھی۔

لیلیٰ ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے۔ پھر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک آواز سنی ہے۔ ایک سنگین اور بے مہر آواز۔ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گردن گھماتی ہے۔ سامنے ہی بوڑھی سرب عورت کھڑی ہے جس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح لمبی اور ٹیڑھی ہے۔ دائیں کان کے نیچے زخم کا نشان ہے اور آنکھ میں نفرت اور بے مروتی ہے۔ وہ حقارت سے لیلیٰ کے چہرے کے آگے اُنکلی نچاتی ہے۔

لیلیٰ آہستہ سے پلکیں جھپکاتی ہے۔
”چلو.....“

لیلیٰ عثمانو دوج کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہیں ہوتا۔ اس کا چہرہ حسب معمول پتھر کی طرح ساکت اور بے حس رہتا ہے۔ وہ بوڑھی سرب عورت کے ہونٹوں سے نکلا ہوا لفظ سنتی ہے اور سوچتی ہے۔ پھر جیسے اُس کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر میکا کی انداز میں اپنے بدن کے کھنڈر کو اٹھاتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس کی ٹانگیں ڈمگاتی ہیں لیکن پھر سنبھل کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ دھیرے دھیرے، ایک ایک قدم۔ بوڑھی سرب عورت آگے چل رہی ہے۔ وسیع و عریض کمرے میں موجود آنکھیں اس پر جمی ہوئی ہیں مگر وہ ان کی طرف دھیان نہیں دیتی۔ یہ تو معمول کی بات ہے۔ بوڑھی سرب عورت جب بھی کسی کو لے جاتی ہے، باقی عورتیں جانے والی عورت کو ایسی ہی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ خالی اور بے معنی نظروں سے۔ جیسے انہیں معلوم نہ ہو کہ اس موقع پر کس رد عمل کا اظہار کریں۔ یا شاید وہ رد عمل کے اظہار کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہیں۔ ان کی آنکھیں بس لایعنی انداز میں جانے والی عورت کا دروازے تک تعاقب کرتی ہیں اور پھر لوٹ آتی ہیں۔

لیلیٰ ان بیالیس آنکھوں کی طرف دھیان نہیں دیتی جو اس کی طرح باری باری گندے اور گرد آلود فرش پر چل کر دروازے سے باہر جانے کے عذاب سے گزر چکی ہیں۔ وہ دیواروں کی جانب دیکھتی ہے۔ بھدی، بدرنگ دیواریں، جن پر جا بجا خون کے دھبے ہیں جو سوکھ کر سیاہ پڑ چکے ہیں۔ دیواروں پر دونوں جانب عریاں عورتوں اور کہیں کہیں عورتوں

اور مردوں کی فحش تصاویر ہیں جو سرب فوجیوں نے بنائی ہیں اور عمارت میں مقید عورتوں کو ان تصاویر کو مٹانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیلیٰ ان تصویروں کو دیکھتی ہے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے اندر کوئی ہلچل نہیں مچتی۔ وہ میکا کی انداز میں چلتی ہوئی دروازے سے گزر کر راہداری میں آتی ہے۔

راہداری کے اختتام پر ایک سیاہ رنگ کا دروازہ ہے۔ لیلیٰ بوڑھی عورت کی معیت میں دروازے سے گزر کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کمرے میں ایک شکستہ میز اور چند بھدی کرسیاں ہیں۔ ایک کونے میں ایک اہنی پلنگ پڑا ہوا ہے۔ سامنے والی دیوار میں ایک کشادہ کھڑکی ہے۔ لیلیٰ لائق سے باہر دیکھتی ہے۔ وہی پہاڑیاں، وہی برف اور وہی سونا آسمان۔ وہ اکتا کر زور سے سانس لیتی ہے اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتی ہے۔ وہاں کئی مرد موجود ہیں۔ لیلیٰ انہیں گننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بس ایک ایک چہرے کو دیکھتی ہے ہر چند کہ اس کی آنکھوں کے آگے ایک دھند سی ہے، پھر بھی وہ چہروں کو دیکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دروازے کے قریب جو شخص کھڑا ہے، اس کے جسم پر فوجی وردی ہے مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت کم عمر ہے۔ سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ اس کی عمر نہیں۔ وہ لیلیٰ کو کینہ پرور نظروں سے گھور رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہے۔ بھاری بھر کم جسم، سرخ آنکھیں اور مونے بھدے ہونٹ۔ اس کے ایک ہاتھ میں گن ہے، دوسرے ہاتھ میں شراب کا گلاس۔ وہ بھوک پیاسی نظروں سے یوں لیلیٰ کو گھور رہا ہے جیسے برسوں کا فاقہ زدہ ہو۔

بوڑھے فوجی کے بائیں جانب کئی آدمی ہیں۔ لیلیٰ کی نظریں ان کے چہروں سے گزرتی ہوئی کھڑکی کے پاس آتی ہیں جہاں بوڑھی سرب عورت کھڑی ہے۔ اس کی نظریں لیلیٰ سے ملتی ہیں تو وہ مسکراتی ہے۔ ایک بے حد غلیظ، مکار اور کمینہ مسکراہٹ اُس کے بوڑھے، بد صورت چہرے کو اور بھی کریمہ بنا دیتی ہے۔ پھر وہ ہونٹوں کو جنبش دیتی ہے۔ شاید اس نے کچھ کہا ہے۔ لیکن لیلیٰ سمجھ نہیں پاتی۔ وہ نظریں گھما لیتی ہے اور بوڑھی عورت کے قریب کھڑے ہوئے مرد کو دیکھتی ہے۔ تب پہلی بار اس کے ذہن کو ایک بھکا سا لگتا ہے۔

’یہ کون ہے؟‘

لیلیٰ کے ذہن میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بدن کے اندر دوڑنے والی

خون کی ندیوں میں ہلچل مچتی ہے۔ یہ کون ہے؟..... یہ صورت تو جانی پہچانی سی لگتی ہے۔
 ہاں، یاد آیا، یہ دکنر ہے۔ دکنو یوگووچ۔ لیلیٰ کے بھائی یوسف عثمانو وچ کا سالا۔ دکنر یوگووچ
 کی بہن الما یوگووچ نے یوسف سے شادی کی تھی۔ دونوں کے دو پیارے پیارے بچے بھی
 تھے۔ لیکن جب سیرانیا میں خون کا بازار گرم ہوا اور سربوں نے دوستی اور بھائی چارے کی
 مصنوعی نقاب اتار کر ہتھیار اٹھائے تو الما دونوں بچوں کو لے کر فرار ہو گئی اور یوسف کو
 سربوں نے قتل کر ڈالا۔ لیلیٰ اپنی تمام حیات کو آنکھوں میں جمع کر کے دکنر یوگووچ کو دیکھتی
 ہے۔ دکنر کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کے چہرے پر سنگدلی ہے۔ ہونٹوں پر
 ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں سور کا بال۔ وہ یکا یک ہونٹوں کا دائرہ بنا کر ایک
 ہوائی بوسہ لیلیٰ کی جانب اچھالتا ہے۔

لیلیٰ اپنے جسم کی رگ رگ میں ایک کراہت سی محسوس کرتی ہے۔

”تو یہی ہے وہ.....؟“ کمرے میں موجود افراد میں سے کسی نے تفسیک آئیز آواز
 میں کہا ہے۔ لیلیٰ سنتی ہے لیکن یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی کہ کس نے یہ بات کہی ہے۔

”ہاں۔“ بوڑھی سرب عورت کہتی ہے۔

”کل ہی تو ہاتھ لگی تھی۔“ کوئی اور کہتا ہے۔

”اچھا.....“ کسی اور کی آواز۔ ”بڑی حسین ہے۔“

”ہاں..... بہت خوبصورت لگتا ہے۔“ بوڑھا سرب بلغی آواز میں کہتا ہے۔

”مگر یہ حرام زادی بیمار ہے۔“ بوڑھی عورت کہتی ہے۔ ”بخار ہے اس کو۔ اور بہت تیز۔“

”تو کیا ہوا؟ بخار اسے ہے، ہمیں تو نہیں۔“

وہ سب ہنستے ہیں۔ کمرے میں مکروہ قہقہے گونجتے ہیں مگر لیلیٰ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ وہ
 خوف محسوس کرتی ہے، نہ اسے غصہ آتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ لوگ کیا کرنے والے ہیں۔
 وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ ایسے مراحل سے وہ پہلے بھی گزر چکی
 ہے۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایک ایسے زنداں میں ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی
 راستہ نہیں۔ چنانچہ وہ ہاتھ اٹھاتی ہے اور بے حسی کے ساتھ میکانیکی انداز میں اپنے جسم کے
 اوپری کپڑے اتار دیتی ہے۔

اب وہ نصف برہنہ کھڑی ہے۔ لیکن اسے کسی بات کا کوئی احساس نہیں ہے۔ اس کے
 کانوں میں کئی آوازیں آتی ہیں۔ غالباً کئی مردوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا ہے۔
 لیکن وہ ان پر دھیان نہیں دیتی۔ وہ دکنر کی جانب دیکھتی ہے، پھر بوڑھی عورت کی طرف۔
 بوڑھی عورت کے چہرے پر زلزلے کے آثار ہیں۔ ایک شدید نفرت اور غصہ۔ شاید وہ لیلیٰ

کا تراشیدہ، جوان جسم دیکھ کر اندر ہی اندر جل بھن گئی ہے۔ اُسے اپنا بوڑھا، بدہیت اور مکروہ بدن یاد آ گیا ہے اور شاید وہ اس احساس میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اب کوئی اس کے کپڑے کیوں نہیں اُترواتا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنی نفرت ہے جیسے وہ دل ہی دل میں لیلیٰ کو ماں بہن کی گالیاں دے رہی ہو۔

لیلیٰ کا دل چاہتا ہے کہ وہ بوڑھی عورت کے منہ پر تھو کے لیکن وہ ایسا نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ بیمار ہے۔ بخار سے اس کا انگ انگ تپ رہا ہے۔ بوڑھی عورت اس سے کم از کم پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہے اور اتنی دور تک تھوکنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے جو اس میں نہیں ہے۔ چنانچہ وہ تھوکنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے اور بوڑھی عورت کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر وہ آہنی پلنگ کے پاس جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جسم کے باقی کپڑے بھی اُتارتی ہے۔ اب وہ بالکل برہنہ ہے۔ سر سے پاؤں تک الف ننگی۔ پلنگ کا گدا برف کی طرح سرد ہے لیکن وہ پرواہ نہیں کرتی۔ چپ چاپ پلنگ پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

”تُو پہلے جا۔“

ایک آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے۔ لیلیٰ عثمانوویچ چپ چاپ آنکھیں بند کئے لیٹی ہے۔ اس کے کانوں میں مختلف آوازیں آرہی ہیں۔ مکروہ ہنسی کی آوازیں، شیطانی قہقہے اور گندی گالیاں۔ اُسے اپنے جسم پر ایک کراہت آمیز لمس کا احساس ہوتا ہے جیسے جلی، گھناؤنی شے سر سے پاؤں تک، بدن کے نشیب و فراز میں آہستہ آہستہ ریگ رہی ہو۔

اُس کا جی متلانے لگتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ قے کر دے۔ لیکن پھر اُس کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور وہ بند پلکوں کے اندر پھیلے گہرے، لا انتہا اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اندھیرا..... اتنا گہرا اور دبیز اندھیرا کہ لیلیٰ اُسے چھو کر محسوس کر سکتی ہے۔ یہ اندھیرا پلکوں کے اندر دُور تک، تصور سے بھی آگے، حد امکاں کے آخری کنارے سے بھی پرے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اندھیرا آخر کیسا ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ لیلیٰ سمجھ نہیں پاتی۔ اندھیرے نے لیلیٰ کو ہمیشہ پریشان کیا ہے۔ ایک اندھیرا تو وہ ہے جو روشنی معدوم ہوتے ہی آسمانوں سے اُترتا ہے اور دھرتی کے چپے چپے پر پھیل جاتا ہے۔ دوسرا اندھیرا وہ ہے جس نے ان دنوں یونینیا کے شہروں اور دیہاتوں کو اپنی پیٹ میں لے لیا ہے۔ نخست کا اندھیرا اور بربادی۔ دشمنی اور نفرت کا اندھیرا۔ کوئی گلی، کوئی مکان اس اندھیرے سے محفوظ نہیں۔ اور تیسرا اندھیرا وہ ہے جو پلکوں کے اندر ہے۔ نجیب بات ہے۔ پللیس بند

کرتے ہی ساری روشنیاں اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ صرف تیرگی باقی رہتی ہے۔ تیرگی بھی ایسی کہ اُس کا دماغ سن ہونے لگتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اندھیرا اُس کی رگوں میں اُترتا جا رہا ہے۔

لیلیٰ اندھیرے کے رمز کو سمجھ نہیں پاتی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی، تب بھی اندھیرا اُسے پریشان کرتا تھا اور وہ حیران ہو کر سوچتی تھی۔
 ”اندھیرے کے دوسری طرف کیا ہے؟“

وہ بدستور چپ چاپ لیٹی ہے۔ اُس کا ذہن دھیرے دھیرے ماؤف ہو رہا ہے اور تھکن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب ٹوٹ رہے ہیں اور اس کا دل چاہ رہا ہے کہ سو جائے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گہری نیند سو جائے۔ ویسے بھی وہ دیر سے نہیں سوئی ہے۔ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں، لیکن چار دن سے یا شاید پانچ دن سے وہ بالکل نہیں سوئی ہے۔ ممکن ہے ایک ہفتہ ہو گیا ہو۔ اور اب وہ بہت تھک گئی ہے۔ بخار سے اس کا جوڑ جوڑ ڈکنے لگا ہے اس لئے وہ سونا چاہتی ہے، مگر سو نہیں پاتی۔

کوئی شے اُس کی چھاتیوں میں بری طرح چھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بلجا گھناؤنا لمس ابھی تک اس کے بدن پر موجود ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے اب اپنے چہرے پر بدبو کے گرم گرم بھکے بھی محسوس ہو رہے ہیں۔ پتا نہیں کیسی بو ہے وہ؟ سڑی ہوئی، تیز اور کراہت آمیز۔ لیلیٰ سمجھ نہیں پاتی کہ وہ بو کیسی ہے؟ اُسے ابکائی سی آتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ تے کرے، مگر کر نہیں پاتی۔ پھر وہ سوچتی ہے کہ آنکھیں کھولے اور دیکھے کہ سینے میں جھین کیوں ہو رہی ہے؟ اور بدبو کا سبب کیا ہے؟..... لیکن وہ آنکھ نہیں کھولتی۔ تبھی ایک عجیب بات ہوتی ہے۔ وہ یکا یک اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہے۔ جیسے کوئی بھاری بوجھ اس کے اوپر سے ہٹ گیا ہو۔ پھر اس کے کانوں میں کہیں دور سے ایک آواز آتی ہے۔

”اب میں.....“

سبک بدن ہونے کا خوشگوار احساس صرف چند لمحے رہتا ہے، پھر اُسے اپنے گال پر کوئی نکیلی چیز چھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی شے اُس کے بدن پر دھیرے دھیرے ریگتی ہے۔ پاؤں سے گردن تک۔ تلخی اور مکروہ، جیسے سانپ ریگ رہا ہو۔ پھر کوئی اس کا منہ کھولتا ہے۔ ہر چند کہ لیلیٰ منہ نہیں کھولنا چاہتی۔ لیکن وہ بیمار و ناتواں ہے۔ مزاحمت کے باوجود کامیاب نہیں ہو پاتی۔ پھر کوئی سیال شے اُس کے حلق میں گرائی جاتی ہے۔ تلخ، تیز اور بدبودار۔ لیلیٰ بہت کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی ورنہ کیلا، بدبودار سیال

اس کے طلق میں اترتا چلا جاتا ہے۔ چند لمبے بعد اس کے جسم کے اندر معدے میں اور رگ رگ میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتی ہیں۔ پھر اُس کے کانوں میں ایک تیز، تحقیر آمیز سرگوشی گونجتی ہے۔

”بچ.....“

لیلیٰ کو ایک بار پھر اپنے جسم پر ایک بھاری بوجھ کا احساس ہوتا ہے۔



مگر سوال یہ ہے کہ اندھیرے کے دوسری طرف کیا ہے؟

پلکوں کے اندر کا اندھیرا اب امد زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ لیلیٰ اپنے گرد و پیش سے اور اپنے آپ سے غافل ہو کر اپنی تمام توجہ اندھیرے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ بچپن میں اکثر اُسے بڑے انوکھے تجربے ہوتے تھے۔ لیکن جب وہ پلکیں بند کرتی اور اندھیرا اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا تو کبھی کبھی یوں ہوتا کہ اس اندھیرے میں سرخ لہریں چکرانا شروع ہو جاتیں اور پھر دھیرے دھیرے پھیلنے لگتیں۔ حتیٰ کہ اندھیرا غائب ہو جاتا اور آنکھوں کے آگے ایک سرخ چادر سی تن جاتی۔ وہ خوش بھی ہوتی اور حیران بھی کہ اندھیرے کی سیاہی سرخی میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے؟ لیکن یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

وہ سرخی پر اور زیادہ توجہ مرکوز کرتی تو رنگ پھر تبدیل ہونا شروع ہو جاتا۔ کبھی نارنجی، کبھی نیلا اور کبھی گہرا سبز۔ پھر اُسے ننھے ننھے، روشن نکلتے ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے ستارے ہوں اور اس کی بند پلکوں کے بے کنار آسمان پر آنکھ چمکی کھیل رہے ہوں۔ اسے رنگوں اور ستاروں کا کھیل بہت اچھا لگتا اور وہ دیر تک آنکھیں بند کئے رہتی۔

لیکن اس وقت نہ رنگ تبدیل ہوئے اور نہ ستارے طلوع ہوئے بلکہ سیاہی اور گہری ہو گئی۔ اس سیاہی میں جا بجا چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آنے لگے۔ جیسے ننھی ننھی قبریں ہوں۔ لیلیٰ دھیرے سے سانس لیتی ہے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے۔ اُس کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر گردن کھجائے۔ لیکن کوشش اور خواہش کے باوجود وہ ہاتھ اٹھانے سے قاصر رہتی ہے۔ ایک شدید تپش اور نفاہت اسے اپنے رگ دریشے میں محسوس ہوتی ہے۔ مایوس ہو کر وہ اپنی توجہ پھر اندھیرے میں نظر آنے والے دھبوں پر مرکوز کر دیتی ہے۔ دھبے..... یہ قبریں۔ یہ جانی پہچانی سی کیوں لگتی ہیں؟..... کیا میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟ وہ سوچتی اور حیران ہوتی ہے۔ ہاں، ٹھیک ہے۔ میں ان قبروں سے واقف ہوں۔

یہ قبر جس پر سفید پھول رکھے ہیں، یہ تو میں نے ہی رکھے ہیں۔ وہ مزید حیران ہوتی ہے۔ یہ قبر تو میری ماں کی ہے۔ میری ماں..... حبیبہ عثمانوویچ۔ کتنی نیک تھی وہ۔ محبت کرنے والی اور خدمت کرنے والی۔ اُس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا، کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ وہ تو اتنی فراخ دل تھی کہ مسندوں کو ہی نہیں، چراغ کو بھی پنہا دیتی تھی۔ لیکن کتنی بے دردی سے لوگوں نے اسے مار ڈالا تھا..... اور یہ اس کے قریب والی قبر اس کے والد کی ہے۔ یونس محمد عثمانوویچ۔ لکڑی کا کاریگر۔ زندگی بھر اس نے لکڑی کو تراش کر خوب صورت اور کارآمد چیزیں بنائی تھیں، لیکن خود اسے اپنی بریدہ لاش کے لئے تابوت نصیب نہیں ہوا تھا۔

لیلیٰ رنج سے سانس لیتی ہے اور دوسری قبروں کو دیکھتی ہے۔ اُس کے بھائی یوسف کی قبر اور پھر چچا اور آنٹی..... لیکن اندھیرے کے اس قبرستان میں، ان تمام قبروں کے درمیان دو قبریں نہیں ہیں۔ اس کی اپنی قبر اور سلمیٰ کی قبر۔ سلمیٰ، اس کی چھوٹی بہن۔ صرف تیرہ سال اس کی عمر تھی۔ انہوں نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا اور سلمیٰ کو ساتھ لے گئے تھے۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟..... شاید کسی کیپ میں ہو اور لیلیٰ کی طرح وہ بھی کسی سر و بستر پر لیٹی ہو..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مر چکی ہو۔ لیکن اگر مر چکی ہے تو کیا کہیں اس کی قبر بنی ہوگی؟..... لیلیٰ سوچتی ہے اور پھر ایک شدید رنج اور پچھتاوا اسے گھیر لیتا ہے کہ ان قبروں کے درمیان اس کی اپنی قبر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زندہ ہے۔ کتنی بد نصیبی کی بات ہے۔ اگر مر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ بھی اس اندھیرے میں دفن ہو جاتی جس میں اس کے پیاروں کی قبریں ہیں۔ لیکن وہ نہیں مری۔ کیونکہ اس روز جب اس کے علاقے میں کئی گھنٹے تک شدید لڑائی ہوئی تھی اور انہوں نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا، وہ گھر میں نہیں تھی۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔ اسے گھر میں ہی ہونا چاہئے تھا اور مر جانا چاہئے تھا۔ بالکل مر جانا چاہئے تھا لیکن..... لیلیٰ دھیرے سے سانس لیتی ہے اور بند آنکھوں کے اندر کھلی آنکھوں سے بہت دور تک دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دھبے، ان گنت دھبے، ان گنت قبریں۔ پھر یکایک وہ ذرا حیران ہوتی ہے۔ اچھا، تو یوں ہے۔ یعنی اندھیرے کی اپنی ایک دنیا ہے اور اس دنیا میں صرف قبریں ہوتی ہیں۔ قبروں کی دنیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اندھیرے کی اس دنیا کے اس پار کیا ہے؟

یکایک لیلیٰ کا دل چاہتا ہے کہ وہ آنکھیں کھولے اور گرد و پیش کا جائزہ لے۔ وہ کوشش کرتی ہے اور شاید آنکھیں کھولنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وہ کچھ ٹھیک ٹھیک دیکھ نہیں پاتی۔ کمرے میں آوازیں گونج رہی ہیں جو اس کے

کانوں تک پہنچتی ہیں۔ تاہم وہ ان کا مفہوم سمجھ نہیں پاتی۔ لیلیٰ نیم وا آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُسے اپنے آس پاس ہیولے سے نظر آتے ہیں۔ دھندلے، سیاہ اور بے ہیئت۔ جیسے آبیسی سائے ہوں۔ لیلیٰ کو وہ بدنما سائے اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ وہ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

اُس کے بدن پر بدستور سانپ ریگ رہے ہیں۔ سر سے پاؤں تک۔ اور اسے بار بار دُوس رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے دانتوں کی چبھن محسوس کرتی ہے اور ان کے زہر کو اپنے جسم کے اندر رگوں میں دوڑتے ہوئے محسوس کرتی ہے۔ زہر، پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گرم اور جان لیوا۔ لیلیٰ کو ایک عجیب سی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اور سینے میں اٹھن سی ہو رہی ہے۔ جیسے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہو۔ وہ حیران ہوتی ہے۔ یہ کیا ہے؟..... یہ تھکن اور نقاہت کیوں؟..... اُس کا بدن اس طرح کیوں جل رہا ہے؟ یہ اتنی آگ کہاں سے آئی؟..... وہ سوچتی ہے لیکن سمجھ نہیں پاتی۔ اُس کا دماغ دھیرے دھیرے ماؤف ہو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے بکھر رہا ہے۔ مگر کیوں؟ وہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔ لاچار ہو کر وہ پھر اپنے خیالات کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

بچپن میں ایک بار اس نے اپنی ماں سے کہا تھا۔

”مُمی! یہ اندھیرا کہاں سے آتا ہے؟“

”آسمان سے۔“

”اچھا؟“ اس نے حیران ہو کر کہا تھا اور کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے اندھیرے میں

نظریں جمادی تھیں۔ پھر کچھ دیر بعد کہا تھا۔

”اور مُمی! اندھیرے کے اس پار کیا ہے؟“

”سورج ہے۔“

”اچھا.....“ وہ حیران ہوئی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ جب آسمان سے اندھیرا اُترتا

ہے تو سورج اندھیرے کے دوسری طرف چھپ جاتا ہے؟“

”ہاں۔“

اُس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا تھا۔

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے مُمی! سورج کو آخر اس طرح چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے

یہ تو معلوم ہو گا کہ لوگوں کو ہر وقت روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے چاہئے کہ کبھی نہ

چھپے، بلکہ ہر وقت آسمان پر جگمگا تا رہے تاکہ لوگوں کو پریشانی نہ ہو۔“

”ہاں..... سورج کو یہ سوچنا تو چاہئے لیکن.....“

”مئی! ہم لوگ ایک کام کریں۔“ اُس نے اچانک بات کاٹ کر کہا۔ ”ہم لوگ اندھیرے کے اُس پار چلیں اور سورج کو پکڑ کر لے آئیں اور اُسے سمجھا دیں کہ کبھی نہ چھپے اور ہمیشہ روشن رہے۔ کیونکہ انسانوں کو اندھیرے کی نہیں، روشنی کی ضرورت ہے۔“

اُس کی ماں حبیبہ عثمانوچ نے پیار سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور مسکرائی تھی۔ لیلیٰ دھیرے دھیرے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے اور پلکوں کے اندر محیط اندھیرے میں دور تک دیکھتے ہوئے بچپن کی بات یاد کرتی ہے۔ تو اس اندھیرے کے دوسری طرف کہیں سورج ہے۔ وہ سوچتی ہے اور تب یکایک اُس کا دل چاہتا ہے کہ اندھیرے کے اس پار جائے۔ اگر واقعی دوسری طرف سورج چھپا ہوا ہے تو اسے ہتھیلی پر رکھ کر لے آئے۔ کیونکہ دنیا میں اندھیرا بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کنارے سے اُس کنارے تک، گاؤں گاؤں، شہر شہر اندھیرا مسلط ہے اور یہ اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ آدمی کا دم گھٹ رہا ہے۔ دھیرے دھیرے سانس اکھڑ رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ سانس بالکل ہی اکھڑ جائے، وہ جا کر سورج کو لے آئے تاکہ دنیا..... ساری دنیا اس کنارے سے اُس کنارے تک، گاؤں گاؤں، شہر شہر روشن ہو جائے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ لیلیٰ سوچتی ہے۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے اور زور سے سانس لیتی ہے۔



لیلیٰ آہنی پلنگ پر چپ چاپ لیٹی ہے۔ کسی نے اُس کے نصف بدن پر ایک گندا سا کپڑا ڈال دیا ہے۔ بوڑھی سرب عورت اندر آتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے جنبش دیتی ہے۔ لیکن لیلیٰ آنکھ نہیں کھولتی۔ بوڑھی عورت ایک بار پھر اُس کا شانہ ہلاتی ہے اور اُسے آواز دیتی ہے۔ پھر گردن گھما کر وکٹر یوگووچ کی طرف دیکھتی ہے۔

”کیا بات ہے؟“

”کچھ بولتی ہی نہیں۔“

”اٹھاؤ اسے اور لے جاؤ۔“

وکٹر کی آواز میں بیزاری اور غصہ ہے۔

بوڑھی عورت پھر کوشش کرتی ہے۔ وہ لیلیٰ کا بازو زور زور سے ہلا کر آواز دیتی ہے۔ ایک بار، دو بار، تین بار..... لیکن لیلیٰ جواب نہیں دیتی۔ کیونکہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔

لیلیٰ عثمان و وح جو گورنی وا کوف میں پیدا ہوئی اور سیر انیا میں پئی بڑھی تھی، سورج کو تلاش کرنے اور اسے دھرتی پر واپس لانے کے لئے اندھیرے کے خلاء میں اتر کر بہت دور چلی گئی ہے.....!

(ختم شد)

پاکستانی وقعات
ڈاکٹر یحیٰ یونس
علامہ